Scanned with CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشتیاق احمد

نام

کردار

اور

واقعات

فرضی

نہیں

ہیں

Atlantis Publications

تفریح بھی، تربیت بھی

اٹلانٹس پبلکیشنز صحت مند، اصلاحی اور دلچسپ کتابوں، کہانیوں اور ناولوں کی کم قیمت اشاعت کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے فروغ کے لئے کوشاں ہے۔

کتاب کا نام : **میری کہانی** (اشتیاق احمد کی خودنوشت)

پبلشر : فاروق احمد

طابع : خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز

قیمت : 980 روپے

ISBN 978-969-601-075-3

ہر قسم کی خط و کتابت اور رابطے کیلئے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

اٹلانٹس پبلکیشنز

A-36 ایسٹرن اسٹوڈیو ز کمپاؤنڈ، B-16 سائٹ، کراچی

0300-2472238, 32578273, 34228050

E-mail: atlantis@cyber.net.pk

انتساب

باجی رابعہ مرتضیٰ کے نام

جنھوں نے کہا تھا
''اشتیاق تم لکھا کرو''

زندگی بہت عجیب ہے ...
کبھی رلاتی ہے کبھی ہنساتی ہے ...
کبھی ہنسا کر پھر رلا دیتی ہے ...

اور

آنسو پونچھ کر پھر ہنسا دیتی ہے۔

زندگی کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

اشتیاق احمد ... ایک جھلک میں !!

نام ...... اشتیاق احمد

والد ...... مشتاق احمد

دادا ...... گل محمد

پیدائش ...... 5اگست 1944ء شناختی کارڈ پر لکھا گیا جو غلط تھا۔ اصل تاریخ 5 جون 1944 ہے۔

جائے پیدائش ...... پانی پت ضلع کرنال مشرقی پنجاب بھارت۔

ہجرت ...... 1947ء میں خاندان جھنگ آ کر آباد ہوا۔

ابتدائی تعلیم ...... شیخ لاہوری پرائمری اسکول جھنگ صدر۔

ہائی اسکول ...... اسلامیہ ہائی اسکول جھنگ صدر۔

تعلیم ...... میٹرک

بھائی بہن ...... تین بھائی ایک بہن : نسیم ، اشفاق احمد ، اخلاق احمد اور آفتاب احمد ... بہن بھائیوں میں سب سے بڑا میں تھا۔

شادی 1967ء

اولاد ...... فرحت جبیں، نوید احمد، راحت جبیں، توحید احمد، رفعت جبیں، آصف محمود، فاروق احمد، عثمان احمد، عائشہ، بڑی دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ ان کے بھی بچے ہیں۔ تین بچے ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔ دو بڑے بیٹے نوید اور توحید ہومیو ڈاکٹر ہیں، ان کا کلینک اور میڈیکل اسٹور ہے۔ ایک بیٹا آصف کمپیوٹر اور پرنٹر مکینک ہے۔ چھوٹے دو بیٹے فاروق اور عثمان اسٹیشنری کا کام کرتے ہیں۔ بہن نسیم اور دو چھوٹے بھائی اخلاق احمد اور آفتاب احمد وفات پا چکے ہیں اشفاق احمد ضلع کونسل میں ہیڈ کلرک ہیں۔ تینوں بھائی صاحبِ اولاد ہیں۔

اشتیاق احمد کی سب سے پہلی تحریر

بڑا قد

آٹھویں کلاس کے سب لڑکے مجھ سے بڑے تھے۔ میرا قد ان سب سے چھوٹا تھا... میں اس بات کو شدت سے محسوس کرتا تھا اور چاہتا تھا کسی طرح میرا قد بڑھ جائے۔ اس غرض کے لیے میں لکڑی کی سیڑھی کا ڈنڈا پکڑ کر لٹکا کرتا تھا۔ یہ ورزش میں صبح سویرے ضرور کرتا، ساتھ ہی اپنا قد بھی ماپتا رہتا تاکہ پتا چل سکے کہ قد بڑھ رہا ہے یا نہیں۔

قد ماپنے کے لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہمارے گھر کے ایک کمرے سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی، اس کی چھت اتنی اونچی تھی کہ میں اس میں کھڑا ہو جاتا تھا تو میرا سر چھت سے نہیں لگتا تھا، میرے سر سے کچھ ہی اوپر وہ چھت تھی ...میں درمیان میں اپنے سر پر ہاتھ کھڑا کر کے دیکھتا کہ میرا ہاتھ چھت کی کڑی سے لگا یا نہیں۔

یہ میرا روز کا معمول تھا ... ایک روز میں لکڑی کی سیڑھی پر لٹکنے کے بعد کوٹھڑی میں گیا ... اب سیدھا کھڑا ہوا تو ہاتھ اٹھا کر ماپنے کی کوشش سے پہلے ہی میرا سر چھت کی کڑی سے جا لگا ... میں حیرت زدہ رہ گیا۔ خوشی سے پھول گیا اور لگا چلانے:

''امی جان! میرا قد بڑھ گیا ... میرا قد بڑھ گیا۔''

میرے چلانے کی آواز سن کر امی جان گھبرا کر میری طرف آئیں اور بولیں:

’’ کیا ہوا ... کیوں چیخ رہا ہے۔‘‘

’’ امی! میرا قد بڑھ گیا ہے ... یہ دیکھیے ... میں روزانہ اس کوٹھڑی میں کھڑے ہو کر اپنا قد ماپتا تھا ... لیکن سر چھت سے نہیں لگتا تھا ... آج لگ گیا ہے ...اس کا مطلب ہے ... میرا قد بڑھ گیا ہے۔‘‘

میری بات سن کر امی جان مسکرا دیں... انہوں نے کہا:

’’ بے وقوف !... اتنی جلدی قد نہیں بڑھا کرتے... اس چھت کی ایک کڑی چیخ کر ٹیڑھی ہو گئی ہے ... تمہارا سر اس سے جا لگا ہے۔‘‘

’’ اوہ !‘‘ میرے منہ سے مارے مایوسی کے نکلا اور امی جان ہنسنے لگیں۔

انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا ... قد اتنی جلدی نہیں بڑھا کرتے۔

(یہ کہانی رسالہ قندیل میں شائع ہوئی تھی)

1972 کے آس پاس کا زمانہ بچوں کے فکشن کے حوالے سے نہایت زرخیز دور تھا ... یہ وہی سال تھا جب اشتیاق احمد کا پہلا ناول شائع ہوا۔ فیروز سنز اور شیخ غلام علی اینڈ سنز کے علاوہ لاتعداد ادارے بچوں کے لئے اردو زبان میں اعلیٰ معیار کے خوب صورت ناول شائع کر رہے تھے ... جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جایا کرتے تھے ... ناولوں کی اشاعت منفعت بخش کاروبار بن چکا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد بچوں کے لیے لکھنے والوں میں عزیز اثری، جبار توقیر، سعید لخت ، کمال احمد رضوی ، سراج انور، لطیف فاروقی، عشرت رحمانی، شیدا کاشمیری کے علاوہ چند ایک ہی نام ایسے تھے جو طبع زاد لکھا کرتے تھے ... عصمت چغتائی، حسینہ معین، انتظار حسین ، شوکت تھانوی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی نے بھی بچوں کے لئے لکھا ... لیکن بہت ہی کم ... ان کے علاوہ زیادہ تر لکھنے والوں نے غیرملکی ادب سے استفادہ کیا ... کہیں براہِ راست ترجمے ہوئے ... کہیں کرداروں کے نام مقامی ناموں سے تبدیل کیے گئے ... اور کہیں مرکزی خیال ماخوذ قرار پایا ... مارک ٹوئین ، آرتھر کونن ڈائل، رائیڈرز ہیگرڈ کے شہرۂ آفاق ناولوں کے ترجمے شائع ہوئے۔ ... کرداروں اور مقامات کو مقامی رنگ دے کر پیش کرنے کیلئے خاص طور پر اینڈ بلائیٹن ، فریکلن ڈبلیو ڈکسن ، ولرڈ پرائس، وینڈی کوپر اور الفریڈ ہچکاک کے ناولوں کو مشرف بہ اردو کیا گیا ...

مہم جوئی اور سراغ رسانی کے کارناموں سے بھرپور ، انگریزی ناولوں سے ماخوذ یہ کتابیں بچوں میں بہت مقبول ہوئیں ... اصل ناول تو شاہکار تھے ہی ،

لیکن ان کو اردو کے قالب میں ڈھالنے والوں نے بھی کمال کر دکھایا ... مقبول جہانگیر، راز یوسفی، ابوضیا اقبال، سلیم احمد صدیقی، زبیدہ سلطانہ ، اختر رضوی، محمد یونس حسرت، سیف الدین حسام، سید ذاکر اعجاز، سید نظر زیدی، آغا اشرف، آفتاب احمد ، عظیم الرحمان فرقان، اقبال کاردار، رحیم، سعید رضا سعید اور دیگر فاضل مصنفین نے یہ عظیم خدمت سرانجام دی۔

ان تمام دیگر قابلِ احترام شخصیات کے نام بچوں کے ادب میں ہمیشہ احترام کے ساتھ لئے جائیں گے۔ بلاشبہ یہ تمام مصنفین اور مترجمین پاکستان میں بچوں کے ادب کے معمار کہلائیں گے۔ بچوں کے ادب کو بیسویں صدی کے موضوعات سے روشناس کروانے کا سہرا انہی کے سر جاتا ہے۔ ان کی اس محنت شاقہ سے قبل یہاں بچوں کیلئے سراغرسانی اور مہم جوئی کے موضوعات پر کسی طبع زاد کہانی یا ناول کی اشاعت کا سراغ نہیں ملتا ...

یہ اپنے تئیں ایک طویل موضوع ہے ... اور سنجیدہ اور علمی بحث کا متقاضی بھی کہ پاکستان اور اس سے پہلے ہندوستان میں بچوں کے لئے ایسا ادب کیوں تخلیق نہیں ہوا کہ بچے جس پر اس طرح لپکتے جیسے انگریزی سے ماخوذ ان ناولوں پر جھپٹتے تھے ... سوال یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں 1930 اور 1940 کی دہائیوں میں بچوں کے لئے ایسا ادب کیوں پیدا نہیں ہو رہا تھا جیسا ادب برطانیہ اور امریکہ میں اینڈ بلائیٹن کی سیکرٹ سیون اور فینس فائیو، فرینکلن ڈبلیو ڈکسن کی ہارڈی بوائز اور ولرڈ پرائس کی ایڈونچر سیریز کی صورت وجود میں آچکا تھا ...

وجوہات جو کچھ بھی رہی ہوں ... لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں بچوں کا ادب مچھلیوں، خرگوشوں، بندروں، جل پریوں اور کچھ حد تک ’’ سبق آموز ‘‘ معاشرتی قصے کہانیوں تک ہی محدود رہا۔ کسی حد تک اس محدودیت کے تانے بانے معاشرے کے سماجی ارتقا ، شہری طرز زندگی کے پھیلاؤ ، اور جدید علوم کے درجۂ قبولیت یا عدم قبولیت سے بھی ملتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے اہم کردار والدین، سرپرستوں اور اساتذہ کا گردانا جاتا ہے ... جو یہ تعین کرنے میں حتمی اختیار کے حامل ہوتے ہیں کہ ان کے دائرۂ اثر میں موجود بچوں کو کیا پڑھنا چاہیئے اور کیا نہیں ... اگر وہ اس سوچ پر عمل پیرا ہوں کہ بچوں کے حلق میں کتابیں ٹھوس کر ان کی یادداشت کا اٹوٹ انگ بنائی جائیں ... اور ڈنڈا ڈولی کر کے یا پند و نصیحت کے دفاتر کھول کر بچوں کو تربیت دی جائے ... تو پھر یقین کر لیجئے کہ وہاں ایسی کتابوں کیلئے کوئی جائے پیدائش بھی پیدا نہیں ہونے پاتی کہ جن کتابوں کے ذریعے بچوں کو بیک وقت حفظِ مراتب اور شائستگی سکھائی جاسکے اور ساتھ ہی ساتھ انسانی ہمدردی، معاشرے کو جرائم سے پاک رکھنے، خطرات سے آگاہی ، بہادری ، مہم جوئی کے ذوق بھی بیدار کیے جاسکیں۔

ایسے سماجی اور سیاسی ماحول میں صرف ایسی کہانیاں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں جن کی تان '' اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے'' جیسے جملوں پر ٹوٹتی ہے۔ ایسی کہانیوں کا وہی اثر اور حشر ہوتا ہے جو پند و نصائح پر مبنی وعظوں کا ہوتا ہے۔

انگریز مصنفین نے بچوں کی نفسیات کے علوم میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے کر کہانیاں لکھنی نہیں شروع کی تھیں لیکن اس کے باوجود اپنے بہتر سماجی شعور کی بدولت انہوں نے اپنے ہم عصر ماحول کو کہانیوں میں پیش کیا ...

اس کے برعکس ہمارے ہاں تبدیل ہوتے معاشرے اور شہری زندگی کے ماحول کی بچوں کو ہوا نہ لگنے دینا ہدف ٹھہرا ... اب ہوا یوں کہ گذشتہ صدی کے بچے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اس ماحول سے مانوس ہی نہ تھے کہ جس کے قصے کہانیاں انہیں سنائے جانے کی کوشش کی جاتی تھی ... یعنی وہ کہانیاں جو سو ڈیڑھ سو برس پہلے لکھی گئی تھیں ... وہ بچے ان کہانیوں کے پسِ منظر سے کوئی اپنائیت محسوس نہیں کر پاتے تھے ... ان کے کرداروں سے گھل مل نہیں پاتے تھے اور اس لئے کہانی کی طرف راغب نہیں ہو پاتے تھے ...

دراصل ماحول تبدیل ہو رہا تھا ... رہن سہن بدل چکا تھا ... جب کہ دوسری طرف بزرگان مانند شترمرغ اس تبدیلی کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرنے پر مُصر تھے اور بچوں کو نئی '' قابلِ گردن زدنی شہری زندگی'' کے آداب سے کوسوں پرے رکھنا چاہتے تھے ... اور اسی پر ہی اکتفا نہیں بلکہ انتہاپسندوں کا طبقہ تو سرے سے کہانیاں لکھنے کو ہی جھوٹ گھڑنے کے مترادف قرار دیتا تھا ... وہ کہاں ایسے ''جھوٹ '' کو گوارہ کرتا جس میں بچوں کو آزادانہ ماحول میں ساحلِ سمندر، جزیروں، غاروں، گلیوں اور سڑکوں پر ایڈونچر اور مہم جوئی کے کارنامے انجام دیتے یا عرفِ عام میں آوارہ گردی کرتے دکھایا جاتا۔

اب اس چپقلش اور معاشرتی عدم تحفظ کی فضا میں کہ جہاں اخلاقی اقدار کی مسماریت کا خدشہ اور انگریزیت کے غلبے کا خوف دامن گیر تھا ... لکھنے والوں کیلیئے یہی محفوظ راستہ تھا کہ وہ خود کو پرندوں، جانوروں اور ننھے منے کرداروں پر مبنی استعاری کہانیوں تک محدود رکھا جائے ... اور قدیم و جدید کی اس جنگ کے شعلوں سے بچ بچا کر لکھنے کا نشہ نبھایا جا سکے۔

آخر کب تک ... 1940 کی دہائی تک یہی گومگو کی فضا معلق رہی ... پھر آہستہ آہستہ قدیم کی جگہ جدید نے لے لی ... اور یہی تاریخ کا سبق بھی ہے ... شہروں کی ترقی کے ساتھ ساتھ شہری طبقہ پھیلتا چلا گیا ... اور اسی کے ساتھ ساتھ اس طبقے کے ماحول پر استوار قصے کہانیوں کی تخلیق کی ضرورت زور پکڑتی گئی ... اردو زبان میں بچوں کے لیے جدید ماحول سے ہم آہنگ ادب کی کمیابی کے سبب انگریزی ناولوں کی مانگ میں اضافہ ہوتا گیا... اس روز افزوں مانگ سے کچھ بڑے اور دوراندیش پبلشروں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بچوں کے لئے لکھے گئے ان انگریزی ناولوں کا اردو میں ترجمہ کروایا جائے تو ان کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

مہم جوئی کے کارناموں پر مبنی مشہور انگریزی کلاسک ناولوں کے تراجم

کے باقاعدہ سلسلے کا آغاز فیروز سنز پبلشرز نے کیا۔ جولزورنے، چارلس ڈکنز اور ایچ جی ویلز کے کئی مشہور ناولوں کے تراجم باقاعدہ حقوق اشاعت حاصل کر کے شائع کیے گئے۔ اس خیال کے تحت شہری ماحول کے تناظر میں مقامی ادیبوں سے ناول لکھوانے کا سلسلے کا آغاز ہوا ... عزیز اثری کا شہرۂ آفاق ناول ''عالی پر کیا گزری'' ، ٹی جے والٹر کا محمود پر کیا بیتی ، جبار توقیر کا ناول ''خزانے کا راز'' اسی سلسلے کی کڑیاں تھے ... ان ناولوں کی مقبولیت نے دیگر پبلشروں اور ادیبوں کو بھی حوصلہ دیا کہ وہ اس میدان میں آگے بڑھیں ...

اس کے نتیجے میں بچوں کے ادب پر چھایا ہوا جمود پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں آکر بالآخر ٹوٹ گیا ... اور اس کے بعد تو بچوں کے ناولوں کا جیسے ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار ناول شائع ہونے لگے ... اس دور کے بچے آج بھی ان ناولوں کو یاد کرتے ہیں ... بلاشبہ آج یہ ناول کلاسک کا رتبہ حاصل کر چکے ہیں۔

لیکن ان میں غالب اکثریت ایسے ناولوں کی تھی جو اعلانیہ اور غیر اعلانیہ تراجم تھے یا ماخوذ ... اور بصد ہزار کوشش ، ان میں سو فیصد مقامی رنگ پیدا نہیں ہو پاتا تھا ... اختر رضوی صاحب بہرحال یہ کوشش ضرور کرتے تھے کہ انگریزی ناول کے ترجموں میں پاکستان کے اس وقت کے سیاسی حالات کے حوالے بھی دیتے جائیں تاکہ پڑھنے والا کہانی کے ماحول سے انسیت محسوس کرتا چلے ... ان کا ناول ''طوفانی جزیرہ'' اس کی ایک مثال ہے جو انگریزی ناول سے ماخوذ تھا ... لیکن اختر رضوی صاحب نے اسے 1968 کی سیاسی ہلچل کے تناظر میں پیش کیا تھا ...

سید ذاکر اعجاز کا ناول'' چھاپہ مار بلا '' بھی ایک ایسا ہی ناول تھا جس میں پڑھنے والے کو 1969 کا کراچی جیتا جاگتا نظر آتا ہے جبکہ درحقیقت وہ وینڈی کوپر کے ناول The Cat Strikes at Night کا اعلانیہ ترجمہ تھا۔

لیکن بہت کم ادیبوں کو مقامی قالب میں انگریزی کہانی کو ڈھالنے کا یہ

ملکہ حاصل تھا ... اور دلچسپ بات یہ کہ عام طور پر غیرمقامیت کا یہ احساس عام نہیں تھا اور نہ کہیں اس کا تذکرہ ہوا کرتا تھا ... نہ خود کبھی اپنے بچپن میں اس کی کو محسوس کیا ... کم از کم اس وقت تک، جب تک کہ ایک نئے اور غیر معروف مصنف اشتیاق احمد کا ناول '' آستین کا سانپ '' نہیں پڑھا۔ اس ناول کو پڑھ کر پہلی بار احساس ہوا کہ کہانی کی مقامیت اور کرداروں سے اپنائیت کس چڑیا کا نام ہے۔

آج تقریباً چالیس برس بعد آپ لاکھ سر مار لیجئے ... لاکھ فلسفے تراشئے ... موشگافیاں کیجئے ... کہ اشتیاق احمد کے ناول کیسے ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہو گئے تھے ... کیوں ہم ان کرداروں میں اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے اور خواب دیکھنے لگے تھے ... لیکن بچپن میں یہ سب کچھ کون سوچتا ہے ... آج اگر یاد ہے تو بس اتنا کہ اشتیاق احمد کے ناولوں کا جس شدت اور بے چینی سے انتظار رہا کرتا تھا ... اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کسی کے ناولوں کا رہا، حالانکہ اس زمانے میں محمود خاور کی بچوں کی عمران سیریز اور اے حمید صاحب کی موت کا تعاقب سیریز بھی مقبولِ عام سلسلے تھے۔

دراصل اشتیاق احمد کے کردار اپنے ماحول سے کٹ کٹا کر صرف مجرموں کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہتے۔ وہ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد بھی کرتے نظر آتے ہیں ... اور جرم کی سماجی اور یہاں تک کہ سیاسی جڑوں کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔

اشتیاق احمد کی تحریروں میں آپ کو اطراف کی دنیا اس حد تک حقیقی محسوس ہوتی ہے کہ ان کے ناول '' 3D '' کی حدود چھوتے نظر آتے ہیں ...

اشتیاق احمد کے ہاں موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ ان کے ناول کا مجرم جگا ڈاکو بھی ہے اور جارج بش بھی۔ قصبے اور محلے کے قبضہ گروپوں اور منشیات فروش ہوں یا بین الاقوامی سیاست کے گھس بیٹھئے ... کوئی بھی ان کے قلم کی پہنچ سے دور نہیں ہے ... اشتیاق احمد کے قلم کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔

یہ بھی اشتیاق احمد کا طرۂ امتیاز ہے کہ بچوں کے ادب میں ان سے پہلے کسی نے بھی بین الاقوامی سازشوں کو ناولوں کا موضوع نہیں بنایا۔ تحیر، تجسس، سنسنی خیزی اور مہم جوئی سے بھرپور نت نئے موضوعات کے اس بے مثال انضمام سے دلچسپی کا جو رنگارنگ آمیزہ تیار ہوتا ہے، اس کا ذائقہ اس قدر پرلطف ہوتا ہے کہ اشتیاق احمد کا لکھا جو ایک بار پڑھ لے تو بار بار اسی ذائقے کا تقاضہ کرتا ہے ... اور اسی لطف کی چاٹ اسے اشتیاق احمد کے ناول پڑھتے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

کوئی شک نہیں کہ ان کے پائے کا تو کیا ...کوئی ایسا بھی نہیں جو فی زمانہ ان کی گرد کو بھی چھو سکے ... یہ بھی سچ ہے کہ اشتیاق احمد کی پہچان ان کے جرم و سزا پر مبنی جاسوسی ناول ہیں ...لیکن نقادوں کی رائے میں جرم و سزا کے موضوع پر صرف وہی اچھا لکھ سکتا ہے اور قبولِ عام کی سند پا سکتا ہے جو ایک اعلیٰ پائے کا افسانہ نگار بھی ہو ... اور اگر شاعر ہو تو کیا ہی بات ہے۔ تخیل پردازی، حساسیت، اور دردمندی ... افسانہ نگاری کے بنیادی درکار اوصاف ہیں ...

یہی سبب ہے کہ ان گنت جاسوسی ناول نگار آئے ، لیکن شہرتِ دوام صرف ابن صفی نے پائی ... اور پھر اشتیاق احمد نے ... ابن صفی اعلیٰ پائے کے شاعر اور افسانہ نگار ... اور اشتیاق احمد بھی افسانے کے میدان کے مایۂ ناز آل راؤنڈر ... یہ آل راؤنڈری اور کسی کے نصیب نہیں ہوئی۔

خالص جاسوسی ناول نگاری نام کی کوئی صنف شاید ہے بھی نہیں ... اور اگر ہے بھی تو ناول نگاری کو دکانداری کی سطح سے اوپر بلند نہ اٹھنے دینے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ یہ وہی تفریق ہے جو شاعری اور تک بندی کے درمیان پائی جاتی ہے ... اور ایسی ہی تفریق سری ادب میں بھی نظر آتی ہے ... اس بنیاد پر سری ادب کو بھی ہم باآسانی دو ذیلی اصناف میں تقسیم کر سکتے ہیں ... یعنی ایک طرف ہے اسراری ادب اور دوسری طرف عام تک بند جاسوسی ادب ... اسراری ادب کی یہ اصطلاح محترم ابنِ صفی (اسرار احمد) کے نام کی مناسبت سے بھی موزوں تر نظر آتی

ہے کہ سّری ادب میں ابنِ صفی ہی اس معیار کے خالق ہیں جسے ان کے نام سے منسوب کر کے اسراری ادب کا نام دیا جاسکتا ہے ... اسراری ادب میں صرف وہی کامیابی کے جھنڈے گاڑ سکتا ہے جو افسانہ طراز بھی ہو اور طلسم ہوشربائی اور شاعرانہ تخیل پردازی کو جرم و سزا کی داستانوں کے ساتھ مدغم کرنے کی کیمیاگری کے فن سے بھی مزاج آشنا ہو۔ اور یہ ذائقہ ہمیں ابن صفی کے ہاں ملتا ہے یا پھر اشتیاق احمد کے ہاں۔

اسراری ادب کے میدان میں ابنِ صفی اور اشتیاق احمد کی کامیابی ... یا یوں کہیئے کہ اوروں کی ناکامی ... اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ کامیاب افسانے اور کامیاب فلم کی طرح کامیاب جاسوسی ناول بھی وہی ہوتا ہے جو ذہنی تفریح کے ساتھ ساتھ دلِ کے تاروں سے بھی چھیڑخانی کرتا جائے ... اور اس بنیاد پر میری ذاتی رائے میں فی زمانہ اشتیاق احمد کے علاوہ اور کوئی نہیں جو اسراری ادیب کہلانے کے حقدار ہو۔

وقتی ذہنی تفریح یا ذہنی عیاشی فراہم کرنے والے جاسوسی ناول نگار شاید ایک نسل کے پڑھنے والوں میں تو اپنی پسندیدگی برقرار رکھ سکتے ہوں لیکن شہرتِ دوام اور لازوال مقبولیت اگر کسی شے کا نام ہے تو ... وہ یہ ہے کہ تین نسلیں اشتیاق احمد کے ناولوں کی گرذیدہ ہیں ... اور کون جانتا ہے کہ ابھی نہ جانے ... آنے والی کتنی ہی نسلیں اتنی ہی شدت سے ان کے ناولوں کی شیدائی کہلائیں گی۔

سّری ادب کو اشتیاق احمد نے بھی ایک نئی جہت عطا کی ہے ... اور وہ جہت یہ کہ ان کے سراغرساں ''فیملی مین'' ہیں۔ اردو میں تو دور کی بات، انگریزی ادب میں بھی ہمیں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جہاں سراغرساں کا کوئی اپنا بھی گھرانہ ہو ... اور نہ ایسی کوئی مثال کہ جہاں گھرانہ ہونے کے باوجود وہ اس کا ایک لازمی جزو بھی ہو ... یعنی سراغرساں یا تو بے گھرانہ شخصیت ہوتا تھا یا پھر بے گھر ... اور لازمی طور پر کنوارہ بھی ... عام تصور یہی تھا کہ شادی ہو جانے کے بعد سراغرساں کو

ڈھول ڈھپا چھوڑ کر سبزی ترکاری کی ٹوکری سنبھال لینی چاہیئے کیونکہ بطور ایک ذمے دار انسان یہ اس کا فرض ہے کہ ترجیحی توجہ وہ اپنے گھرانے پر مرکوز رکھے اور اپنے بچوں کو ایک اچھا انسان بنانے کے مقصد کو اپنی زندگی کا محور ٹھہرائے ... اور اس فرض کی بجا آوری کی خاطر وہ سراغ رسانی کی زندگی کو خیرباد کہہ ڈالے ... وہ اس لئے کہ سراغ رسانی کی ذمہ داریاں اسے اپنی گھریلو ذمے داریاں پر خاطر خواہ توجہ دینے کے لائق نہیں چھوڑیں گی۔

حالانکہ اس کے برعکس، حقیقی زندگی کے جاسوس اور سراغرساں بیک وقت یہ دونوں فرائض انجام دیتے نظر آتے ہیں ... جاسوسی ناولوں میں عام طور پر شادی شدہ انٹیلیجنس افسران کا مذاق اڑایا جاتا ہے یا پھر سینیئر جنگی افسران کے کردار میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ظاہر کرنا مدِنظر ہوتا ہے کہ ایکشن اور ذہنی جمناسٹک '' فیملی مین '' کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ تو واضح نہیں کہ کنوارے سراغ رساں کے تصور کے تانے بانے یونانی دیومالائی ہرکولیس قسم کے کرداروں سے ملتے ہیں یا پھر 1940اور 1950 کی دہائی میں بننے والی ہالی وڈ کی فلموں کی اس روایت سے مستعار ہیں کہ ہیرو کو بہرصورت نوجوان اور کنوارہ ہی ہونا چاہیئے۔

اس تصور کو تبدیل کرنے کا سہرا بھی اشتیاق احمد کے سر ہے ... انقلابی طور پر ان کے جاسوسی ناولوں کے کردار حقیقی زندگی کے فیملی مین ہیں ... وہ حقیقی زندگی کے سراغرسانوں کی طرح بیک وقت اپنی پیشہ ورانہ اور گھریلو ذمے داریاں نبھاتے نظر آتے ہیں۔ وہ بیک وقت سراغرساں بھی ہیں اور باپ بھی ... انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا نہ تو بطور سربراہِ خاندان اپنے فرائض سے غافل ہیں اور نہ بحیثیت سراغ رساں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے بے خبر ... بلکہ وہ اپنی سراغ رسانی کی مہمات میں اپنے بچوں کو بھی ساتھ ہی شریک رکھتے ہیں اور اس دوران ان کی اس اخلاقی تربیت کا بھی سامان کرتے رہتے ہیں جو باپ کی حیثیت میں ان کے فرض ہے۔ یہ واقعی ایک نوبل آئیڈیا ہے جس کی مثال اس سے پہلے

کہیں نہیں ملتی ... اب کوئی چاہے تو اسے سری ادب کی تیسری ذیلی صنف یعنی اشتیاق نگاری کے نام سے بھی پکار سکتا ہے ... کیونکہ سری ادب میں جدت کی یہ نئی راہ اشتیاق احمد نے ہی متعین کی ہے۔

رہی بات بچوں کے ادب کی ... کہ وہاں اشتیاق احمد کا کیا مقام ہے ... اظہر المن الشمس ہے کہ بچوں کے سری فکشن کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کی ہر صنف میں اشتیاق احمد کی چھاپ سب سے زیادہ گہری، نمایاں اور غالب ہے۔ بچوں کے لئے اشتیاق احمد نے ہر طرح کی کہانیاں اور ناول لکھے ہیں۔ ان کہانیوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی بھی کہانی کے مقبولِ عام ہونے کے لئے یہ شرط اولین ہے کہ قاری یا ناظر اس کے کرداروں اور ماحول سے انسیت محسوس کرے ... کہانی کے کردار نہ صرف اسے حقیقت سے قریب تر معلوم ہوں بلکہ کردار جس ماحول میں جیتے جاگتے ہوں ، وہ ماحول پڑھنے والے کو اپنا اپنا سا لگے ... کرداروں کے معمولاتِ زندگی حقیقی ماحول سے قریب تر ہوں۔

اشتیاق احمد کی کردار نگاری اس اصول کی پاسداری کرتی دکھائی دیتی ہے۔ مشہور سراغرسانوں کے گھرانے ہونے کے باوجود اور ملک کے اعلیٰ ترین حلقوں تک رسائی کے باوجود ان کے کرداروں کے گھر کا ماحول محیر العقل نہیں ہے ... عام سے سیدھے سادے مڈل کلاس گھرانے جیسے ہمارے معاشرے میں ہوتے ہیں ... بچوں کے ڈسپلن اور تعلیم پر والدین کی گہری نظر ... بچوں کے معمولات سے آگاہی ... شام کو پارک میں جا کر پڑھنا، والدہ کا گھر کے کام کاج میں مصروف رہنا ، چھوٹی بہن کا بھائیوں کی ٹوہ میں رہنا ، بھائیوں کی اپنی بہن سے اپنے راز چھپانے کی ناکام کوشش کرنا، بہن کا بھائیوں کو ڈرانا کہ مجھے اپنے ساتھ شامل نہ رکھا تو اباجان اور امی جان کے پاس جاکر بھانڈا پھوڑ دوں گی ، شام کی چائے پر بچوں کا والدہ کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے والد کی آمد کا انتظار کرنا اور پھر

بچوں کی آپس کی نوک جھونک کی وارداتیں، والد کے دلچسپ اور بے تکلف دوستوں کے گھرانوں کا ہنستا کھیلتا ماحول جہاں سب اٹھے بیٹھے پکنک پر نکل کھڑے ہوتے تھے، ایک منہ چڑھے ملازم سے توتو میں میں ... پڑوسن کے گھر فون کرنے کے لئے جانا ... یہ سب کچھ ہم جیسے مڈل کلاس بچوں کو بہت ہی اپنا اپنا سا لگتا تھا ... یہ ہماری فنتاسی تھی، وہ زندگی تھی جو ہماری زندگی تھی ... اور اس لئے ہمیں اشتیاق احمد کے کردار اپنے جیسے ہی نہیں بلکہ اپنا آپ لگے ... ہم نے خود کو وہی کردار محسوس کیا ... اور یہاں سے شروع ہوا کرداروں سے اپنائیت کا وہ احساس ... جو ہمیں انگریزی سے مستعار ناول پڑھنے میں کبھی محسوس نہیں ہوا ... اور اگر کہیں محسوس ہوا بھی تو وہ کردار ہمارے ساتھ زیادہ دیر تک خود ہی چل نہ سکے۔

اپنے پن کے احساس کے علاوہ دوسری بات تھی اس اپنائیت کا تسلسل ... یہ کردار ہم خود تھے ... ہمارے دوست تھے ... اور یہ دوستی جاری رہی اور آگے بڑھتی رہی ... وہ اس طرح کہ اشتیاق احمد نے ان کرداروں پر تسلسل سے لکھ کر اس دوستی کو دائمی کر دیا ... بچوں کے ادب میں ہمیں ایک ہی کرداروں پر مبنی آٹھ سو ناولوں کی سیریز کی ایسی دوسری مثال نہیں ملتی ...

دراصل لاکھ چاہنے کے باوجود ہم عنبر، ناگ، ماریا نہیں بن سکتے تھے ... کیونکہ وہ مافوق الفطرت قوتوں کے حامل تھے ... ان کا طرزِ زندگی ہم سے میل نہیں کھاتا تھا ... وہ ہمارے لئے ایسا ہدف تھے جس کا حصول ہماری دسترس سے پرے تھا۔ لیکن ہم محمود، فاروق، فرزانہ، آصف، آفتاب، فرحت، شوکی، مکھن، اخلاق، اشفاق اور رفعت ہونے کا خواب دیکھ سکتے تھے ... گھروں میں ایک دوسرے کو انہی ناموں سے پکارا جاتا تھا ...

آج بھی یاد ہے کہ ابا کے ایک دوست تھے ... ان کے نام میں رحمان بھی آتا تھا ... ہم انہیں خان رحمان کے روپ میں دیکھتے تھے اور رحمان چچا کے بجائے انکل رحمان کہنے لگے تھے ... اور حسنِ اتفاق دیکھئے کہ وہ تھے بھی وہ اسی حلیے کے عین مطابق جو ''چھپا رستم'' کے سرورق پر خان رحمان کی تصویر دیکھ کر

اپنے ذہن میں تراشا ہوا تھا ... اسی طرح ایک صاحب تھے ... اکرام ... انہیں انکل اکرام کا عہدہ دے رکھا تھا ...غرض یہ کہ ہماری طرح یقیناً اور بہت سے بچوں نے خود کو محمود، فاروق، فرزانہ گردانتے ہوئے اپنے ذہن میں اپنے گھرانے کیلئے انسپکٹر جمشید کے گھرانے جیسی ایک دنیا بسائی ہوئی تھی ...اور یہ صرف اسی لئے کہ اشتیاق احمد کی کردار نگاری نے ہمیں ایسا کرنے کا حوصلہ اور موقع دیا تھا ... ایک قابلِ حصول ہدف مہیا کیا تھا ...یہی وہ سب سے بڑی خوبی تھی جس نے اشتیاق احمد کو اشتیاق احمد بنایا ... بلاشرکتِ غیرے ... بچوں کا مقبول ترین اور آٹھ سو سے زیادہ ناول لکھنے والے مصنف اشتیاق احمد۔

اشتیاق احمد اب صرف ایک مصنف کا ہی نہیں بلکہ ایک اندازِ تحریر، ایک مکتبۂ فکر کا نام ہے ... بچوں کا کوئی بھی رسالہ اٹھا کر دیکھ لیجئے ... آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ نئے لکھنے والوں کی اکثریت شعوری یا لاشعوری طور پر اشتیاق احمد سے متاثر ہے اور اشتیاق احمد کے انداز میں لکھ رہی ہے۔

اشتیاق احمد ایک عہد ساز مصنف ہیں ... اردو ادب کی تاریخ کا ایک لافانی کردار ... اسراری ادب میں ابن صفی کے بعد اگر کسی کے نقوش انمٹ اور ناقابلِ تنسیخ ہیں تو صرف اشتیاق احمد کے ...

اشتیاق احمد صاحب کا تہہ دِل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے میری درخواست اور خواہش پر ... پہلی بار اپنے زندگی کے تمام پہلو اس خود نوشت سوانح عمری میں سمو دیئے۔ میری دانست میں یہ ان کا اردو ادب پر بہت بڑا احسان ہے۔

اشتیاق احمد صاحب کا اس لئے بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے دنیائے اردو کے سب سے زیادہ ناول لکھنے والے مصنف، بچوں کے مشہور ترین اور مقبول ترین ادیب کی سوانح عمری کا ناشر ہونے کا اعزاز عطا کیا۔

فاروق احمد

10 نومبر 2013

دو باتیں

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ!

پہلی بار میری کہانی جنوری 1982ء میں شائع ہوئی تھی۔ کتاب بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔ غالباً 1995 میں اسے پھر لکھنے کا خیال آیا تاکہ اس میں 95ء تک کے حالات اور واقعات آجائیں۔ تیسری بار ستمبر 2004ء میں شائع ہوئی اور اس میں اس وقت تک کے حالات شامل کر دیے گئے تھے۔اور میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے چوتھی مرتبہ بھی لکھنا پڑے گا ...

تازہ ناول لکھ رہا تھا کہ فاروق احمد صاحب کا فون ملا ... وہ کہہ رہے تھے: ''میں چاہتا ہوں ... آپ میری کہانی ایک بار پھر لکھیں اور اس بار اسے خوب مفصل لکھیں ...چاہے کتاب کتنی ہی ضخیم کیوں نہ ہو جائے ...ہم اسے بہت خوب صورت، مجلد اور بڑے اہتمام سے شائع کریں گے ... اسے ایک یادگار چیز بنائیں گے۔''

ان کا خیال خوب تھا، پھر ان کا اس پر کام کرنے کا اصرار بھی بڑھا تو میں بھی ذہنی طور پر تیار ہوگیا۔ سوآج مورخہ 14/8/2012، یوم آزادی کو اس کتاب کا پھر سے آغاز کر رہا ہوں... اللہ رب العزت میری مدد فرمائیں ،آمین۔

1982ء میں شائع ہونے والی میری کہانی کی دو باتیں بہت مختصر تھیں ... لیکن سب نے ان مختصر ترین دو باتیں کو پسند کیا تھا ... سو پہلے وہی دو باتیں یہاں تحریر کیے دیتا ہوں۔

''یہ میری کہانی ہے، بالکل اصلی ہے ، نام بھی اصلی ہیں ، مقامات بھی

اور واقعات بھی اصلی ہی ہیں۔ اسے لکھنے کے دوران کوشش یہ کی گئی ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، کسی کو کوئی رنج نہ پہنچے، زندگی میں ہر انسان کو سب ہی طرح کے آدمی ملتے ہیں، یہ کہانی لکھنے سے میرا مطلب کسی کے عیب گنوانا یا اپنی تعریف کرنا نہیں، بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو یہ بتانا ہے کہ میں نے لکھنے لکھانے کا سفر کس طرح شروع کیا ... اور یہاں تک کیسے پہنچا۔ اس سفر کی کہانی سناتے وقت ضروری تھا کہ سب ہی متعلقہ لوگوں کا ذکر کیا جاتا اور جس جس طرح واقعات پیش آئے اسی طرح بیان کیے جاتے، چنانچہ کسی بھی مقام پر کسی بھی حصے میں اگر کسی متعلقہ آدمی کو رنج کا شائبہ بھی ہو تو میں اس سے پہلے ہی معافی کا خواست گار ہوں ... میں خود کو کسی سے بہتر نہیں سمجھتا ... سب ہی کو اپنے سے بہتر خیال کرتا ہوں ... اُتار چڑھاؤ، تغیر و تبدل، دکھ سکھ سب ہی زندگی میں آتے ہیں اور برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اُمید ہے کوئی صاحب بھی محسوس نہیں کریں گے۔''

آپ نے پرانی دو باتیں پڑھیں ... نئی دو باتیں ان سے بہتر نہیں ہو سکتیں ... کیونکہ نیا نو دن پرانا سو دن ... لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے پبلشر فاروق احمد طویل دو باتیں کی فرمائش داغتے نہیں تھکتے۔

میں نے ان سے کئی بار کہا بھی کہ وہ دن گئے جب پسینہ گلاب تھا۔ لیکن وہ اس بات کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ... کہتے ہیں اور طویل دو باتیں لکھیے ... بلکہ اور طویل۔

اور ہم سب ہی جانتے ہیں طوالت بھی مختصر ہی بہتر ہے ... میں تو بس یہی بتانا پسند کروں گا کہ ہر انسان کی زندگی ایک کہانی ہے ... یہ کہانی اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے ... اور اسی روز ختم ہوتی ہے ... جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے ... لیکن مجھے اپنی زندگی کی کہانی اس کتاب میں ختم کرنے کے لیے کہہ دیا گیا ہے، ہے نا عجیب بات ... ہونا تو یہ چاہیے تھا ... میں اس کہانی کو لکھتا ... لکھتا رہتا، لکھتا چلا جاتا، یہاں تک کہ میری زندگی کے آخری لمحات آجاتے اور

ادھر میں اس کہانی کو ختم کرتا...ادھر میری آنکھیں بند ہو جاتیں ... لیکن بند کہاں ... انسان کے مرنے پر تو اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ... بلکہ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں... جیسے وہ خود سے کہہ رہا ہو:

''یہ کیا ہوا ؟''

یہ دو باتیں یہاں تک لکھ پایا تھا کہ جی چاہا، فاروق احمد صاحب کو یہاں تک کی دو باتیں فون پر سنا دوں۔ انہیں سنائیں تو کہنے لگے :

'' بلکہ یہ بہت زبردست آئیڈیا ہے ... آپ آج ہی سے اپنی یادداشتیں نوٹ کرتے رہیں ... اپنے بچوں کو وصیت کر جائیں کہ وقت آنے پر یہ یادداشتیں فاروق احمد کو بھیج دی جائیں ... اس طرح میری کہانی کے آخری ایڈیشن میں یہ بقایا یادداشتیں بھی شامل کرلی جائیں گی...ہو سکتا ہے کہ اس طرح اس کتاب کا آخری ایڈیشن ایک نایاب چیز بن جائے۔''

سو اس خیال پر بھی اب انشاء اللہ کام جاری رہے گا... روز زندگی میں پیش آنے والے قابلِ ذکر حالات اور واقعات میں درج کرتا رہوں گا ... جو میرے مرنے کے بعد آپ آخری ایڈیشن میں پڑھ سکیں گے۔ ان شاء اللہ!''

اس بار میری کہانی اس وقت سے شروع ہو رہی ہے جب میں نے زندگی میں پہلی بار لفظ ''کہانی '' سنا تھا ... اور اس کا مطلب ہے، میرا اور کہانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، لیکن اس وقت یہ کسے معلوم تھا کہ یہ ساتھ کیا رنگ دکھائے گا ... اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا، لیکن اس وقت تو یہ بات آپ کو بھی معلوم ہے اور اس رنگ سے آپ خوب واقف ہیں۔

پہلی بار میری کہانی لکھی گئی تو بعد میں شدت سے یہ احساس ہوا کہ اس میں بہت سی باتیں رہ گئی ہیں ... کاش میں ان کو بھی شامل کر دیتا ... سو اس شدت نے آج یہ موقع مرحمت فرمایا ہے...اور میں اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا ... لیکن مجھے معلوم نہیں... میں فائدہ اٹھا پاتا ہوں یا

نہیں... کیونکہ زندگی کا کسی کو پتا نہیں، ہوسکتا ہے کہ میں نے فاروق احمد صاحب کے ساتھ مل کر جو پروگرام بنایا ہے... وہ اسی کتاب کی حد تک رہ جائے ... اور یہی کتاب میری زندگی کی آخری کتاب ثابت ہو ...اس خیال کے آنے کے بعد اب ان دو باتیں کو مزید طوالت نہیں دے سکتا ... آپ بھی انہی الفاظ پر اکتفا کر لیں... یہی درویش کی صدا ہے... اور انہی دو باتیں کو سند سمجھ لیں تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں۔

فقط

والسلام

اشتیاق احمد

14 اگست 2012

O

''اچھا اب خاموش ہو جاؤ ، رونا بند کرو ... میں تمہیں کہانی سناتی ہوں۔''
زندگی میں پہلی بار کہانی کا لفظ سن کر میں نے ماں کی طرف دیکھا۔
دراصل کسی بات پر میں بے تحاشہ رو رہا تھا۔ ماں نے کہانی شروع کی :
''ایک تھی چڑیا...چڑیا دیکھی ہے نا تم نے ...وہ دیکھو... اوپر دیوار میں چڑیا چڑے کا گھونسلہ ہے ...''ماں نے میری ٹھوڑی پرانگلی رکھ کر میرا چہرہ اوپر کی طرف کیا... پھر کہانی سنانے لگیں:
'' ہاں تو ایک تھی چڑیا ، ایک تھا چڑا ...دونوں میاں بیوی تھے۔ ایک دن چڑیا نے کہا، آج ہم کھچڑی پکائیں گے ...تم جا کر دال لاؤ، میں چاول لاتی ہوں۔ دونوں اڑ کر گھر کے اس حصے میں پہنچے، جہاں چاول اور دال بوریوں میں رکھے تھے۔ دونوں نے ایک ایک دانہ اٹھایا اور اپنے گھونسلے میں لے آئے۔ اسی طرح وہ بار بار گئے اور چاول اور دال کے دانے لائے۔ اس طرح جب کافی دال چاول جمع ہو گئے تو انہوں نے ان کی کھچڑی پکائی اور مزے لے لے کر کھائی... کہانی ختم ... اب تم سو جاؤ۔''
یہ تھی میری زندگی کی پہلی کہانی۔ پانی پت کے تاریخی شہر میں ایک محلے کا نام لاڈلا کنواں تھا۔ وہاں میرے ماں باپ کا گھر تھا۔ محلے کے درمیان میں املی کا ایک درخت تھا۔ اس کے نیچے بچے کھیلا کرتے تھے ... درخت پر املی لگتی تو بچے درخت پر بیٹھے طوطوں سے کہتے :

''طوطے طوطے... ایک کٹار گرا دے۔''

یہ ایک طرح سے گیت کے انداز میں کہا جاتا ... ان بچوں میں میں بھی کھیلا کرتا ... وہیں گلی سے نکل کر بازار میں میرے والد کی پرچون کی دکان تھی ... اس زمانے میں موٹر سائیکلیں تو تھیں نہیں، نہ سائیکلیں تھیں... ٹانگے ہوتے تھے۔ سڑک پر آنے جانے میں کوئی خوف نہیں تھا۔ لہٰذا بچوں کو سڑک پر جانے سے کوئی روکتا نہیں تھا۔ لاڈلہ کنویں کے ایک طرف میرے نانا کا گھر تھا۔ نانا جان اکثر مجھے آواز دیتے :

''اشتیاق ... او اشتیاق ... یہ بالو شاہی لے لو۔''

ناناجان کے پاس دوڑ کر جاتا تو وہ مجھے پیار سے بالو شاہی کھلاتے۔ پانی پت تاریخی شہر تھا ... اس چھوٹے شہر میں تین سو ساٹھ مسجدیں تھیں... اس شہر کے قرآن کریم کے قاری بہت مشہور تھے...ان کی قرآت میں عجیب لطف تھا ... آج بھی پانی پت کے قاری مشہور ہیں اور ان کی قرآت بھی ابھی تک اسی لہجے میں چلی آ رہی ہے ...

پانی پت سے دس بارہ میل کے فاصلے پر کرنال تھا۔ یہ بھی تاریخی شہر تھا۔ خان لیاقت علی خان اسی شہر کے تھے جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے اور جو راولپنڈی میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے ایک قادیانی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ کرنال میں ہر سال پہلوانوں کے مقابلے ہوتے تھے ... میرے والد کو یہ مقابلے دیکھنے کا بہت شوق تھا ... وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے ... ان حالات میں پاکستان بننے کا مطالبہ شروع ہوا اور یہ نعرے گونجنے لگے:

''لے کر رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان۔''

میری عمر اس وقت پانچ سال تھی جب قافلے پاکستان کا رخ کرنے لگے اور مار کاٹ شروع ہوئی... میرے والد اور والدہ سامان کی ایک گٹھڑی لے کر گھر سے نکلے تھے۔ والد نے میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا ... میں پیدل چل رہا تھا ... سامان

کی گٹھڑی والد صاحب کے سر پر تھی اور میری والدہ کی گود میں میری چھوٹی بہن تھی ... باقی رشتے دار بھی ساتھ تھے ... ہمارے قافلے نے راستے میں ایک حویلی میں قیام کیا ... حویلی مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی تھی ... بچے بھوک سے چلا رہے تھے .. خود میں بھی بھوکا تھا ... قافلے کو رات کی تاریکی میں وہاں سے نکل کر اسٹیشن تک جانا تھا تاکہ ٹرین میں سوار ہو کر پاکستان پہنچ سکیں ... تمام راستوں پر سکھ اور ہندو مل کر مسلمانوں پر حملے کر رہے تھے ... ہر طرف آگ اور خون کا کھیل جاری تھا... بعد میں یہ باتیں معلوم ہوئیں...اس وقت یہ باتیں سمجھنے کی تو عمر تھی ہی نہیں ... بعد میں یہ بھی پتا چلا کہ دوسرے شہروں کی نسبت پانی پت میں امن رہا تھا ... وہاں بہت کم مار کاٹ کے واقعات ہوئے تھے۔

رات کے وقت قافلہ حویلی سے نکلا... اور اللہ کی مہربانی سے خیریت سے پہنچ گیا۔ گاڑی بھی مل گئی ... سب لوگ خوب پھنس پھنسا کر بیٹھ گئے ... اللہ اللہ کر کے گاڑی روانہ ہوئی ... ایسے میں ایک بچے نے رونا شروع کیا ... وہ بار بار اپنی ماں سے کہہ رہا تھا:

''ماں بھوک لگی ہے۔''

آخر ماں نے ایک رومال کھولا۔ اس میں بندھی ایک روٹی نکالی۔ اس میں سے روٹی کا چوتھائی حصہ توڑا اور بچے کو دے دیا۔ بچہ روٹی کھانے لگا، اس بچے کو روٹی کھاتے دیکھ کر میں بار بار اس کی طرف دیکھنے لگا، کیونکہ بھوک مجھے بھی ستا رہی تھی... اس عورت نے یہ بات محسوس کر لی۔ اس نے رومال کھولا اور چوتھائی روٹی توڑ کر مجھے دے دی ... میں بھی روٹی کھانے لگا۔

بس ... بھارت سے پاکستان تک سفر کے حالات تو اتنے ہی یاد ہیں۔ ہمارا قافلہ پتا نہیں ٹرین سے کہاں اترا تھا ... بس یہ معلوم ہے کہ سارا خاندان بلکہ پانی پت کے اکثر لوگ جھنگ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔

جھنگ میں جو مکان کسی کو خالی ملا ... اس نے اسی پر قبضہ کر لیا، اس

وقت حکومت کی طرف سے یہی حکم تھا ... ہمیں بھی بازار لوہاراں کے محلّہ بھمرانہ میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا ... مکان جس گلی میں تھا ...اس گلی سے باہر بالکل سامنے ایک دکان تھی ... میرے والد نے سوچا، یہ دکان خرید لیتے ہیں ... اپنی وہی پرچون کی دکان شروع کر لیں گے۔ ماموں جان کی بیوی سفر کے دوران فوت ہو گئی تھی۔ اب وہ اکیلے تھے، لہٰذا وہ بھی ہمارے ساتھ اسی مکان میں رہنے لگے تھے۔

دکان جس شخص کے قبضے میں تھی، اس نے دکان بیچنے پر آمادگی ظاہر کی ... اور سات سو روپے میں دکان کا سودا ہو گیا ... ہندوستان سے کچھ نقدی بہرحال والد صاحب ساتھ لائے تھے ... اس میں سے دکان خریدی گئی اور باقی پیسوں سے پرچون کا سامان دکان میں ڈالا گیا۔ اس طرح والد صاحب اور ماموں جان نے اکٹھے دکان شروع کر دی ... مجھے اسکول میں داخل کرا دیا گیا ... رات کو سونے سے پہلے اپنی والدہ سے کہتا:

''امی مجھے کوئی کہانی سنائیں۔''

والدہ کو بھی دو ہی کہانیاں آتی تھیں، چڑیا اور چڑے کی اور دوسری کہانی ایک مینڈک اور مینڈکی کی تھی ...وہ ایک دن ایک کہانی سناتی ... دوسرے دن دوسری ... نیا نیا اسکول جانے لگا تھا ... ابھی لکھنا پڑھنا تو آتا نہیں تھا ... اس لیے انہی دو کہانیوں پر گزارا کرتا رہا۔ تیسری جماعت میں کسی قدر اردو پڑھنے کے قابل ہوا تو محلے کے ایک بچے کے ہاتھ میں کہانی کی ایک کتاب دیکھی۔ اس پر لکھا نام پڑھا ... نام تھا بادام میں دو پٹہ ... میں نے اس سے پوچھا:

''تم یہ کہانی کی کتاب کہاں سے لائے ہو۔''

اس نے مجھے بتایا:

''ہمارے محلے میں ایک لڑکا رشید احمد رہتا ہے۔ اس کے پاس بے شمار ایسی کہانیوں کی کتابیں ہیں۔ وہ ایک پیسہ لے کر ایک کتاب پڑھنے کے لیے دیتا

ہے۔''

میرے کہنے پر وہ مجھے رشید کے پاس لے گیا۔ میں نے اسے ایک پیسہ دے دیا۔ اس نے مجھے کہانی کی ایک کتاب دے دی اور بولا:

''یہ پڑھ کر کل واپس دے دینا، ورنہ دوسری کتاب نہیں دوں گا۔''

''اچھا۔'' میں نے کہا۔

میں کتاب گھر لے آیا۔ اس کا نام شمشام جادو گر تھا ... کتاب پڑھی... کہیں کہیں سے کوئی کوئی لفظ سمجھ نہ آیا... تاہم کہانی پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرے دن دوسری کتاب لے آیا۔ اس طرح ہر روز ایک کہانی پڑھنے لگا... یہ سب کتابیں 16اور32صفحات کی تھیں اور تمام کی تمام جادو، جنوں، بھوتوں، پریوں، شہزادوں، شہزادیوں اور بادشاہوں کی تھیں ... لیکن اس وقت یہ کہانیاں اچھی لگتی تھیں ... یہ سلسلہ ایسا چلا کہ میں رشید احمد کا سب سے بڑا گاہک بن گیا... وہ مجھے پسند کرنے لگا ... اب میں اس کی الماری سے اپنی پسند کی کتاب تلاش کر کے لے آتا... وہ کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا ... اس طرح دو سال گزر گئے ... ادھر میری اسکول کی تعلیم جاری تھی ... ان حالات میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ماموں جان کے دوست اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے ہمارے ہاں آگئے۔ ان کا نام نذیر احمد آتم پانی پتی تھا۔ لاہور میں سنٹرل ماڈل گورنمنٹ ہائی اسکول میں اردو اور فارسی کے ٹیچر تھے...

ان کی بیٹی کا نام خورشید تھا ... وہ بھی میری ہم عمر تھی ... تاہم وہ چھٹی جماعت میں تھی جب کہ میں ابھی چوتھی جماعت میں تھا...خورشید کو بھی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے مجھے کہانی کی کتاب پڑھتے دیکھا تو وہ کتاب مجھ سے لے کر دیکھی، پھر کہنے لگی :

'' اس طرح کی تو میرے پاس بے شمار کہانیاں ہیں ...الماری بھری پڑی ہے میری تو۔''

''اچھا!'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ پھر بولا :

'' اگلی مرتبہ تم آؤ... تو میرے لیے کچھ کہانیاں لے کر آنا۔''

'' اچھی بات ہے۔''

ہم دونوں چھٹیوں کا کام ایک ساتھ بیٹھ کر کرتے ... اسکول کا کام کرنے میں وہ میری مدد کرتی ... چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ لاہور چلے گئے.... میں بہت اداس رہنے لگا اور انتظار کرنے لگا کہ کب پھر گرمیوں کی چھٹیاں ہوں اور وہ لوگ آئیں اور میرے لیے کہانیوں کی کتابیں لائیں ...

آخر خدا خدا کر کے چھٹیاں ہوگئیں اور ماسٹر نذیر احمد آثم صاحب اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ آئے۔ خورشید نے اپنا وعدہ یاد رکھا تھا ... وہ میرے لیے کہانیوں کی بہت سی کتابیں لائی تھی... یہ کتابیں رشید احمد والی کتابوں سے قدرے بڑی اور اچھی تھیں۔ ان میں بچوں کے رسالے بھی تھے۔ کھلونا اور بچوں کی دنیا وغیرہ ...میں نے ان رسالوں کو بھی پڑھا۔ ان میں شائع کی گئی کہانیاں کچھ مختلف بھی تھیں ... یعنی جنوں، بھوتوں، شہزادوں، شہزادیوں کے علاوہ بھی کچھ کہانیاں تھیں... میری اور خورشید کی دوستی ان کہانیوں کی وجہ سے بہت گہری ہو گئی... وہ تقریباً ہر سال ہی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے جھنگ آتے تھے ... ان کے بہت سے قریبی رشتے دار جھنگ میں رہتے تھے۔

خورشید کے تایا بھی ہمارے نزدیک ہی رہتے تھے، لیکن وہ ٹھہرتے ہمارے ہاں ہی تھے ... اس طرح ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں اکٹھے کام کرنا ہمارا معمول بن گیا...ہم والد صاحب کی دکان پر بھی جاتے... وہاں سے بادام جیبوں میں بھر لاتے اور توڑ توڑ کر کھاتے ... دکان پر دیسی گھی ہوتا تھا ... وہ کچا ہی نکال کر کھا جاتے۔

کہانیاں پڑھنے اور اسکول کا کام اکٹھے کرنے کا معمول جاری رہا ... اردو پڑھنے کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی ... اس لیے ایک دن میں دو دو تین تین

کہانیوں کی کتابیں ختم کر ڈالتا ، خورشید جب بھی جھنگ آتی میرے لیے کہانیوں کی کتابیں ضرور لاتی ... ایک بار ایسا ہوا کہ وہ کہانیوں کی کتاب کے بجائے ایک موٹی سی کتاب لے آئی۔ اور کہنے لگی:

"لو ! اس بار تم اس کتاب کو پڑھو۔"

میں نے کتاب کا نام پڑھا... نام تھا، الف لیلیٰ ہزار داستان۔ اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا ... اس میں ایک عجیب سی دلچسپی محسوس ہوئی... یہاں تک کہ میں نے ساری کتاب پڑھ ڈالی ... اور خورشید کو واپس کر دی۔

خورشید کے ساتھ چھٹیوں کا کام تو کرتا ہی تھا ... اس سے خوب چھیڑ خانی بھی جاری تھی۔ ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی تو معمول کی بات تھی... لیکن یہ سب خوشگوار ماحول میں جاری تھا ... ایک دن مجھے شرارت سوجھی... خورشید صبح سویرے بالوں میں تیل لگانے کی عادی تھی۔ میں نے تیل کی شیشی میں اسپرٹ ڈال دی ... اب میں اس انتظار میں تھا کہ کب وہ نہا کر آئے اور تیل لگائے ... آخر وہ باہر آئی اور سیدھی تیل کی شیشی کی طرف گئی... میں نے پہلے ہی شرارت کی پلاننگ کر لی تھی... بالوں والا کنگھا دیوار کے ساتھ بچھے پلنگ کے نیچے پھینک دیا تھا ... ساتھ ہی ہاتھ میں ماچس تیار لیے بیٹھا تھا ...دل ہی دل میں ہنس بھی رہا تھا۔

خورشید تیل لگا کر فارغ ہوئی تو لگی کنگھا ادھر ادھر دیکھنے ... آخر اس نے کہا : "کنگھا کہاں گیا۔"

"کنگھا ... پلنگ کے نیچے دیکھ لو ... میرے ہاتھ سے گر گیا تھا، نیچے اندھیرا ہے ... یہ لو ماچس جلا کر دیکھ لو۔"

کم عمری میں اتنی سمجھ بوجھ کہاں ہوتی تھی کہ وہ میری شرارت کی تہہ کو پہنچ جاتی... خود مجھے بھی خطرے کا احساس نہیں تھا ... یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا کرنے جا رہا ہوں۔

اس نے بھی فوراً ماچس میرے ہاتھ سے لیا اور پلنگ کے نیچے رینگ کر دیا سلائی کو رگڑ ڈالا ... جھکے ہوئے ہونے کی وجہ سے دیا سلائی کا شعلہ اس کے بالوں کے نزدیک ہی تھا۔ اور بالوں میں سپرٹ لگی ہوئی تھی... بس فوراً ہی اس کے بالوں نے آگ پکڑ لی ... وہ بوکھلا کر باہر نکلی اور چلائی:

'' آگ... میرے بالوں میں آگ لگ گئی۔''

میں خود بھی بوکھلا اٹھا... حالانکہ خود ہی تو شرارت کی تھی ... اس سے پہلے کہ معاملہ گڑبڑ ہو جاتا ... میرے ماموں اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے جو یہ منظر دیکھا... تو فوراً بستر کی چادر اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دی ... آگ تو خیر فوراً ہی بجھ گئی... لیکن اس کے بال جھلس گئے تھے اور سر کافی بدصورت لگ رہا تھا... ادھر ماموں ہم دونوں کو گھور رہے تھے:

'' یہ کیسے ہو گیا ؟''

خورشید نے ذرا رعایت نہیں کی ... فوراً بتا دیا کہ یہ کارنامہ میرا ہے ... بس پھر ماموں جان تھے اور ان کے تھپڑ تھے اور میرے گال ... جب تک گال خوب سرخ نہیں ہو گئے ... انہوں نے ہاتھ نہیں روکے ...ماموں جان یوں تو بہت پیار کرتے تھے ... لیکن ان میں غصہ بہت تھا ... وہ غصہ آج مجھ پر خوب اترا تھا۔

دو تین دن خورشید نے مجھ سے بات نہ کی ...میں نے دو تین بار گنجی کہہ کر پکارا تو اس کا منہ اور بن گیا ... بال چونکہ جگہ جگہ سے جل گئے تھے ... اس لیے وہ کسی حد تک واقعی گنجی نظر آ رہی تھی ... آخر تین دن بعد اس کا موڈ ٹھیک ہوا اور ہم پھر اکٹھے بیٹھ کر اسکول کا کام کرنے لگے ...ایک دن اسکول کا کام ختم ہوا تو مجھے نیند آ گئی...بیدار ہوا تو خورشید کہنے لگی :

'' لو! میں نے تمہارے لیے آلو چھولے خریدے ہیں ۔''

'' کہاں سے خریدے ۔''

'' گلی سے گزر رہا تھا آواز لگاتا ہوا ، میں نے خرید لیے ... مجھے پتا

ہے... تمہیں آلو چھولوں کا بہت شوق ہے۔"

"ہاں! وہ تو ہے ... لاؤ۔"

اس نے پلیٹ میری طرف بڑھا دی ...اس میں چمچہ بھی موجود تھا... میں نے پہلا چمچہ ہی لیا تھا کہ منہ سے چیخ نکل گئی... ادھر خورشید بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ خوب قہقہے لگا رہی تھی ... دراصل اس نے آلو چھولوں میں خوب بہت سی مرچیں شامل کر دی تھیں...اس قدر زیادہ کہ اب میں زور زور سے سی سی کر رہا تھا ... اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے... پھر میں پانی کی طرف دوڑا ... جلدی سے نلکے سے پانی نکال کر پیا ... گھر میں ہاتھ کا نلکا تھا... پانی کی موٹروں کا تو اس وقت تصور بھی نہیں تھا... گھر میں بجلی تک نہیں تھی... پانی پینے اور بار بار کلی کرنے سے بھی منہ کی جلن کم نہ ہوئی ... کسی قدر کم ہوتی تھی... لیکن پھر شروع ہو جاتی تھی ۔

"لو ... تھوڑی سی شکر منہ میں رکھ لو ۔"

خورشید نے شکر میری طرف بڑھائی... میں نے وہ جلدی سے منہ میں رکھ لی... اور پھر او او کرنے لگا... وہ شکر تو برائے نام تھی ، اس میں بھی مرچیں تھیں... اب تو میرا بُرا حال ہوگیا... میں خورشید کو مارنے کے لیے دوڑا... وہ بھاگ کھڑی ہوئی...ادھر مجھے منہ کی پڑی تھی...لہٰذا اس کا خیال چھوڑ کر پھر کلیاں کرنے لگ گیا ... آخر شکر منہ میں رکھنے سے سکون ہوا ... خورشید دور کھڑی ہنس رہی تھی... پھر اس نے کہا:

"کیوں کیسا بدلہ لیا... اور بناؤ مجھے گنجی۔"

چند دن تک میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کر کام نہ کیا۔ وہ بیٹھ کر کام کرتی رہی اور مسکراتی رہی... آخر ہم دونوں میں پھر صلح ہوگئی...

یہ معمول جاری رہا ، یہاں تک کہ میں نے پرائمری جماعت پاس کر لی ... اور اب مجھے ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

O

چھٹی جماعت میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو والدہ کہنے لگیں :

'' تمہاری دو ماہ کی چھٹیاں شروع ہو گئی ہیں... اب تم بڑے بھی ہو گئے ہو... لہٰذا چھٹیاں یوں ضائع نہ کرو ۔''

'' جی نہیں امی جان ! میں اسکول کا کام کرتا رہوں گا ... صرف کھیل کود میں ان دنوں کو ضائع نہیں کروں گا ۔'' میں نے فوراً کہا ۔

'' تم میرا مطلب نہیں سمجھے ۔'' انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔

'' تو پھر آپ کا کیا مطلب ہے امی جان ۔''

'' دیکھو! تم آلو چھولے بیچا کرو ۔''

'' جی ... آلو چھولے ۔'' میں نے حیران ہو کر کہا ۔

'' ہاں! آلو چھولے ... کچھ لوگ بیچتے نظر نہیں آئے کیا کبھی تمہیں ۔''

'' جی وہ تو بیچتے نظر آئے ہیں... میں تو اکثر ان سے آلو چھولے لے کر کھاتا رہتا ہوں ۔'' میں نے انہیں بتایا ۔

'' کھاتے رہتے ہو نا ... تو دوسرے تم سے لے کر کیوں نہ کھائیں... تم کل سے آلو چھولے بیچا کرو گے ۔''

'' لیکن امی! میں آلو چھولے تیار کیسے کروں گا ۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

'' وہ تمہیں میں تیار کر کے دوں گی ... تم یوں کرو ... اپنے ابا جی سے آدھ سیر سفید چنے لے آؤ... اس کے ساتھ ایک سیر آلو بھی وہ تمہیں دلوا دیں

گے... نمک مرچ سفید زیرہ، میٹھا سوڈا، املی وغیرہ بھی وہ تمہیں خود ہی دے دیں گے ...انہیں معلوم ہے آلو چھولوں کی تیاری میں کن کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

'' جی اچھا۔''

میں دکان پر پہنچا ...انہیں بتایا کہ ماں کیا کہتی ہے ... ابا جی مسکرائے اور پھر انہوں نے سارا سامان باندھ کر مجھے دے دیا ... ساتھ ہی انہوں نے کہا:

'' اس سارے سامان پر خرچ آیا ہے ایک روپیہ...اب دیکھنا ہے کہ تم کتنے پیسے کماتے ہو۔''

'' جی اچھا!''

وہ تمام چیزیں مین گھر لے آیا۔ عشأ کی نماز کے بعد والدہ نے چنوں کو پانی میں بھگو دیا اور کہنے لگیں:

'' کل تم صبح سویرے اٹھو گے ... اور دیکھو گے کہ میں آلو چھولے کیسے تیار کرتی ہوں۔ دو چار دن تک تو میں خود تمہیں تیار کرکے دوں گی ... اس کے بعد جب تم سمجھ جاؤ گے تو خود تیار کیا کرنا۔''

'' جی اچھا۔''

دوسرے دن صبح فجر سے بھی پہلے امی نے اٹھا دیا ،انہوں نے چولہے میں لکڑیاں لگائیں ... راکھ پر مٹی کا تیل ڈالا اور دیا سلائی جلا کر آگ جلا دی ... راکھ سے شعلہ بلند ہو گیا اور لکڑیوں کو چھونے لگا ... جلد ہی لکڑیوں نے آگ پکڑنی شروع کر دی...ادھر والدہ نے چھولوں کا وہ پانی نکال دیا۔ انہیں تازہ پانی سے کئی بار دھویا ... پھر دیگچی آگ پر رکھ دی اور تھوڑا سا میٹھا سوڈا بھی چنوں میں ڈال دیا ... دیگچی کو تھالی سے ڈھانپ بھی دیا ... پھر انہوں نے مجھ سے کہا:

'' چھولے کافی دیر میں گلتے ہیں ... اتنی دیر میں ہم دوسرے کام کر لیتے ہیں۔''

اب انہوں نے آلو اچھی طرح دھو کر ایک تھالی میں رکھ دیے ۔ پھر پیاز کاٹی ۔ ان کو کاٹنے کا طریقہ بتایا کہ پیاز کے چھلکے اتار کر انہیں پانی میں ڈال دیا جاتا ہے ... پھر چاقو سے باریک باریک کاٹا جاتا ہے ... پانی میں ان کو اس لیے ڈالتے ہیں کہ ان میں سے اٹھنے والی بو سے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ۔

انہوں نے پیاز کاٹ کر دکھائی ... املی کو پانی میں بھگو دیا ... نمک مرچ پسا ہوا زیرہ وغیرہ سب آپس میں ملا کر ایک چھوٹی سے پیالی میں رکھ دیا ... جب چنے گل گئے تو ان کو اتار کر جھرنے میں الٹ دیا تاکہ ان کا پانی نکل جائے ۔اور آلو ابلنے کے لیے رکھ دیئے۔ آلو ابل گئے تو انہیں ٹھنڈے پانی میں ڈال دیااور ایک ایک پانی سے نکال کر ان کے چھلکے اتارنے لگیں۔ آلو چھل گئے تو چند آلو چاقو سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ دیے اور کہنے لگیں :

'' جب یہ ختم ہو جائیں تو دو تین اور کاٹ لینا ... تمام آلو ایک ہی بار نہیں کاٹتے ، خراب ہو جاتے ہیں ۔''

'' جی اچھا!'' میں نے فوراً کہا ۔

اب انہوں نے املی تیار کی ... اس میں پانی ڈال کر اسے مسلا ، اس طرح املی کی چٹنی تیار ہو گئی... یہ تمام چیزیں انہوں نے ایک بڑے تھال میں سجائیں... پھر بولیں :

'' اپنے ابا جی کی دکان کے ساتھ نیچے جا کر بیٹھ جاؤ... لکڑی کی پڑی دکان سے لے لینا ... خود بوری بچھا کر بیٹھنا ... پڑی پر تھال رکھ لینا ۔''

'' جی اچھا !''

تھال میں انہوں نے آٹھ دس المونیم کی چھوٹی چھوٹی پلیٹیں اور چمچے بھی رکھ دیے تھے ۔ ان میں چھولے تیار کر کے دینے تھے...ایک پلیٹ انہوں نے بنا کر بھی دکھائی اور کہنے لگیں :

'' یہ ایک پیسے کی پلیٹ ہے ... ٹھیک ہے ... کوئی دو پیسے کے آلو

چھولے لینا چاہے تو اس سے دو گنا بنا کر دینا۔''

''جی اچھا! میں سمجھ گیا۔''

انہوں نے تھال اٹھا کر میرے سر پر رکھ دیا ... اور بولیں :

''بسم اللہ پڑھ کر گھر سے نکلو۔''

''جی اچھا ... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''

اس وقت تک ناشتے کا وقت ہو چکا تھا اور میں ناشتا کر چکا تھا ... اس زمانے میں ہمارا ناشتہ چائے اور رسک ہوتا تھا۔ چائے کی ایک پیالی اور دو رس ... اس چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا لیے اوراوپر سے پیالی میں بچی چائے پی لی ... بس یہ ناشتا ہوتا تھا۔

میں بازار پہنچا۔ والد صاحب سے لکڑی کی پڑی لی۔ اس پر تھال رکھا ... ان سے ایک بوری لی اور بچھا کر اس پر بیٹھ گیا ... لیجیے ... آلو چھولوں کی دکان شروع ہوگئی... بازار میں اسی طرح دو تین اور لڑکے بھی آلو چھولے بیچتے تھے ... ان میں میرا اضافہ ہوگیا ... خیر... اللہ اللہ کرکے پہلا گاہک آیا ... اس نے کہا :

''ایک پیسے کے آلو چھولے دے دو۔''

میں خوش ہوگیا کہ چلو پہلا گاہک تو آیا ... یہ بھی بتاتا چلوں... اس زمانے میں ایک روپے کے سولہ آنے ہوتے تھے ۔ ہر آنے کے چار پیسے ہوتے تھے ، گویا ایک روپے میں چونسٹھ پیسے ہوتے تھے۔ آنہ گول سکہ ہوتا تھا ... اس کے بعد دوَنی ہوتی تھی... دوَنی دو آنے کی ہوتی تھی... پھر چونی یعنی چار آنے کا سکہ ، پھر اٹھنی۔ یہ آٹھ آنے کا سکہ تھا ... اس کے بعد کہیں جا کر روپے کی باری آتی تھی۔ روپیہ سکے کی شکل میں بھی ملتا تھا اور نوٹ کی صورت میں بھی ... ایک روپے کے نوٹ کے بعد پانچ ، دس اور سو روپے کے نوٹ ہوتے تھے۔ سو روپے کا نوٹ تو کبھی کبھار ہی کسی کے ہاتھ میں نظر آتا تھا اور اگر کبھی کسی کو سو روپے کی بھان لینی پڑ جاتی تھی تو نہ جانے اسے کتنی دکانوں کے چکر لگانے پڑے تھے ، تب کہیں

جا کر سو روپے کی بھان (چینج) ملتی ۔ یا پھر اسے تنگ آکر بنک جانا پڑتا تھا۔

میں نے اس لڑکے کو ایک پیسے کے چنے بنا کر دیے ہی تھے کہ دوسرا لڑکا آگیا ... پھر ایک بچی بھی آگئی... اس طرح گاہکوں کی آمد شروع ہوئی... دوپہر سے پہلے تمام سامان ختم ہوگیا ... میں نے بوری اور پڑی ابا جی کو دی اور باقی سامان لے کر گھر آگیا ... امی جان دیکھ کر خوش ہوئیں اور بولیں :

''لاؤ ... آج کی بکری کہاں ہے ۔''

میں نے سارے سکے ان کے آگے ڈھیر کر دیے ... وہ لگیں گننے ۔ اس وقت تک گھر میں صرف میری چھوٹی بہن تھی... باقی بھائی بعد میں ہوئے... بہن کا نام نسیم تھا ۔ وہ بھی پاس آکر بیٹھ گئی ... اور سکوں کو دیکھنے لگی... تمام سکے گننے کے بعد امی جان نے کہا :

'' یہ دو روپے اور چار آنے ہیں ... اس کا مطلب ہے ... تمہیں ایک روپیہ اور چار آنے منافع ہوا ہے اور یہ بہت اچھا منافع ہے ... بس اب تم روزانہ آلو چھولے بیچو گے، اس طرح بہت پیسے جمع ہو جائیں گے جو کام آئیں گے ۔''

''جی اچھا امی جان ۔''

انہوں نے مجھے جیب خرچ کے لیے ایک آنہ بھی دیا... بہن کو دو پیسے دیے ... اب میں اسکول کا کام کرنے لگا ... اس طرح یہ معمول شروع ہوا... روزانہ صبح سویرے اٹھنا ... چھولے تیار کرنا اور بازار لے جانا ۔

صبح سویرے اٹھنا کافی مشکل کام تھا ... لڑکپن میں نیند بہت گہری ہوتی ہے... میری نیند تو کچھ زیادہ ہی گہری تھی... میں سوتا بھی تھا اوپر والی چھت پر جب کہ باقی لوگ نیچے والی چھت پر سوتے تھے ... اوپر والی چھت پر جانے کے لیے لکڑی کی سیڑھی لگی ہوئی تھی ...اب مجھے جگانے کے لیے صبح سویرے لکڑی کی سیڑھی پر کون چڑھے...یہ مسئلہ پیش آیا...نیچے سے آوازیں دینے سے میری آنکھ کھلتی نہیں تھی ... آخر ماموں جان نے ایک ترکیب بتائی... انہوں نے پٹ سن کی

بنائی گئی ایک رسی لی... اس رسی کو ملکی زبان میں سیبا کہتے ہیں... ماموں جان اس رسی کا ایک سرا سوتے وقت میری کلائی سے باندھ دیتے ... اس رسی کے دوسرے سرے کو پر نالے میں سے نکال کر نیچے تک لٹکا لیتے ... ان کی چار پائی اس پرنالے کے پاس ہوتی تھی ... صبح جب جگانے کا وقت ہو جاتا تو وہ رسی کے نیچے والے سرے کو پکڑ کر جھٹکا دیتے ... دو تین بار کے جھٹکوں سے آخر میری آنکھ کھل جاتی اور میں اوپر سے آواز دیتا: '' ماموں جان ! میں اٹھ گیا ہوں۔''

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہ کہہ کر میں پھر سو جاتا ... اور ماموں جان چند منٹ کے انتظار کے بعد پھر رسی کو جھٹکا دیتے ... یہ تھا اس زمانے میں جگانے کا آلہ ... آپ اسے الارم بھی کہہ سکتے ہیں... اب تو ہر تکیے کے نیچے موبائل ہوتا ہے... اور موبائل میں الارم لگا دیا جاتا ہے ... اس زمانے میں موبائل کا تصور تک نہیں تھا... اللہ اکبر۔

اس وقت بچپن میں میں کیا صبح سویرے اٹھنے لگا کہ ساری زندگی کے لیے میرا یہی معمول بن گیا ... اس وقت کا صبح سویرے جاگنے کا معمول آج تک جاری ہے۔

پورے دو ماہ آلوچھولے بیچے ۔ چھٹیاں ختم ہونے پر امی جان نے بتایا :

'' تمہارے نوّے روپے جمع ہو گئے ہیں... یعنی دو ماہ میں تم نے نوّے روپے کمائے ہیں اور یہ کافی اچھی رقم ہے ... اب آئندہ سال بھی ایسا ہی کرنا ۔''

'' جی اچھا ۔'' میں نے فوراً کہا ۔

میٹرک تک گرمیوں کی چھٹیوں میں چھولے بیچنے کا معمول جاری رہا ۔

☆☆☆☆☆

O

چھٹی جماعت میں ہی تھا کہ ایک دن ایک نئی بات ہوئی۔
اپنی گلی کے ساتھ والی گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک لڑکا اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا ... میں نے اس سے پوچھا:
"یہ کہانی کی کتاب ہے۔"
اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا... ساتھ ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح جانتے تھے ... وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔
"نہیں! یہ ناول ہے۔"
"ناول ... ناول کیا ہوتا ہے۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"ناول بھی کہانی ہی کی کتاب ہوتی ہے۔"
"تو پھر اسے ناول کیوں کہتے ہیں۔"
"یہ تو مجھے معلوم نہیں ... تم پڑھ کر دیکھ لینا۔"
"یہ تم نے لیا کہاں سے؟"
"یہاں بنک والی گلی میں ایک دکان ہے سلامت اللہ کی ...اس نے اپنی دکان پر بہت سے ناول رکھے ہوئے ہیں ایک آنہ روز کرایہ پر دیتا ہے۔"
"تم یہ ناول پڑھ کر مجھے بھی دے دو، میں ایک دن میں پڑھ لوں گا اور اپنا ایک آنہ دے دوں گا ... پھر تم مجھے بھی اس دکان پر لے چلنا۔"
"اچھی بات ہے۔"

دوسرے دن اس نے وہ ناول مجھے دے دیا ... اس کا نام پراسرار کنواں تھا... اور لکھنے والے کا نام ابن صفی تھا ...میں نے گھر آکر اسے پڑھنا شروع کیا ... آج تک جتنی کہانیاں بھی پڑھی تھیں ... اس ناول کا مزہ ان سب سے مختلف تھا ... ان میں جنوں ، بھوتوں ، بادشاہوں ،شہزادیوں اور پریوں وغیرہ کی کہانیاں ہوتی تھیں ... لیکن اس ناول میں کسی بادشاہ کی کہانی نہیں تھی ... کسی جن بھوت کی کہانی نہیں تھی ... اس میں تو جیتے جاگتے چلتے پھرتے لوگوں کی کہانی تھی ... جو ایک مجرم کو تلاش کرتے پھرتے ہیں ... بہرحال مجھے پڑھ کر ایک نیا مزہ آیا ۔ اس روز سے میں نے جادو ئی کہانیاں چھوڑ دیں اور سلامت اللہ کی دکان سے کرائے پر ناول لانے لگا۔ ہرروز ایک ناول لے آتا اور پڑھ ڈالتا ... اسے واپس کرتا تو دوسرا لے آتا ...

یہ شوق اس قدر بڑھا کہ رات کو سونے سے پہلے بھی لیٹ کر ناول پڑھتا رہتا ...ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی ... اس زمانے میں بجلی کسی کسی گھر میں ہوتی تھی ... ہم لالٹین جلاتے ، اس لالٹین کی روشنی میں ناول پڑھتا تھا... لالٹین میرے سرہانے ایک کیل سے ٹنگی ہوتی تھی ... ابا جان جب دیکھتے کہ ناول پڑھتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تو کہتے:

''اب سو جاؤ ... باقی کل پڑھ لینا ۔''

میں ان سے کہتا :

'' جی اچھا ۔''

اور لالٹین بالکل نیچی کرکے سونے کے لیے لیٹ جاتا...لیکن نیند تو آنکھوں سے بہت دور ہوتی تھی ... جی چاہتا تھا ... ناول مکمل کرکے سوؤں ... ادھر والد صاحب کا ڈر کہ ان کی آنکھ کھل گئی تو ڈانٹیں گے ... ان کے ڈر سے لالٹین اونچی نہیں کر سکتا تھا... ایک روز جب ناول کی دلچسپی نے زیادہ مجبور کیا تو دبے پاؤں اٹھا اور گھر کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں آگیا...

گلی میں کھمبا تھا اور اس پر بلب روشن تھا ... دن اگرچہ سردی کے تھے... لیکن شوق ان سب چیزوں پر بڑی طرح سوار تھا... اب رات کا وقت، ہو کا عالم ، سردی کے دن اور میں گلی میں کھمبے کے نیچے بیٹھا ناول پڑھ رہا ہوں۔ کوئی اس عالم میں مجھے دیکھ لیتا تو یقیناً پاگل خیال کرتا ۔ اور اس روز والد صاحب کی آنکھ بھی نہیں کھلی ، ورنہ میری مرمت لازمی تھی ... کہنے کا مطلب یہ کہ اس قدر جنون ہوگیا تھا ناول پڑھنے کا ۔

اس وقت تک ابن صفی کے ناول شائع ہی کتنے ہوئے تھے...وہ جلد ہی ختم ہوگئے یعنی سب ہی پڑھ ڈالے ... ان کا ناول ایک ماہ کے بعد آتا تھا ... اب باقی 29 دن کیا کیا جائے ...

ایسے میں ایک اور واقعہ ہوا ، اس سال لاہور سے ماموں نذیر احمد آثم اپنے گھرانے کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیوں میں آئے تو میرے لیے ایک اور چیز لے آئے... پہلے تو وہ الف لیلیٰ ہزار داستان لے کر آئے تھے نا ... اس بار اس کے بالکل الٹ چیز لائے ... اور وہ چیز تھی ایک بہت موٹی سی کتاب ... خورشید نے آتے ہی کہا :

'' یہ لو ! اس مرتبہ یہ پڑھو ۔''

''ہائیں ... اتنی موٹی کتاب... بھلا یہ میں کیسے پڑھوں گا ... میرے لیے تو وہ کتابیں ہی ٹھیک ہیں ۔'' میں نے گھبرا کر کہا ۔

'' اوہو ... تم پڑھو تو ۔''

میں نے دیکھا ... کتاب کا نام تھا آخری چٹان ... اور لکھنے والے کا نام تھا نسیم حجازی۔ یہ نام میرے لیے بالکل نیا تھا ... میں نے کتاب پڑھنے کی کوشش کی ... پڑھتا تو چلا گیا ... لیکن پلے وہ کم ہی پڑی... اسے مکمل نہ پڑھ سکا ... تنگ آکر سلامت اللہ کی لائبریری میں گیا ... ابن صفی کا کوئی ناول باقی تھا نہیں ... اس نے فہرست میرے حوالے کر دی ۔ اس فہرست میں ایک اور نام نظر آیا... نام

تھا صادق حسین صدیقی ... ان کے نام کے ساتھ لکھا تھا ، اسلامی تاریخی اور رومانی ناول ۔ میں نے سوچا ... چلو ان کا کوئی ناول پڑھ کر دیکھتے ہیں... ایک نام نظر آیا حورِ عرب ۔وہ لے آیا ۔ یہ ناول اس قدر دلچسپ لگا بس کہ صادق حسین صدیقی کے ناول شروع کر دیے ۔صادق حسین صدیقی کے ناول پڑھنے کیا آئے کہ پھر نسیم حجازی کے ناول بھی پڑھنے کے قابل ہو گیا ۔

ابن صفی کا ناول تو اب مہینے میں ایک پڑھنے کو ملتا تھا ... جب ان کا ناول آتا تو فوراً لائبریری سے لے آتا... وہ ختم ہو جاتا تو صادق حسین صدیقی یا نسیم حجازی کا کوئی لے آتا ۔

O

میرے ہائی اسکول کا نام اسلامیہ ہائی اسکول تھا۔

میری تعلیمی حالت اچھی تھی۔ خاص طور پر حساب میں تیز گنا جانے لگا ... آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تو اس کلاس کے انچارج ماسٹر محمد خالد صاحب تھے ۔ وہ اردو کے ٹیچر تھے... انہوں نے یہ بات بھانپ لی کہ میں اردو میں بہت اچھا ہوں۔ اس لیے وہ خصوصیت سے میری طرف توجہ دینے لگے... محاورات ضرب الامثال سنتے تو خاص طور پر مجھ سے جملے بنواتے ۔ ایک دن کہنے لگے :

'' جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر کو جملے میں استعمال کرو ، اشتیاق احمد جملہ بتائے گا ۔''

میں نے سوچے سمجھے بغیر فوراً کہا :

'' آپ سے اردو پڑھنا اوکھلی میں سر دینا ہے اور جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر ۔''

ماسٹر خالد نے مجھے پہلے تو گھورا ، پھر مسکرا کر رہ گئے ۔ ایسے میں مجھے جادوئی کہانیوں کے وہ کردار یاد آگئے جو پہلے تو کسی شہزادے یا شہزادی کو دیکھ کر رو دیا کرتے تھے، پھر ہنس پڑتے تھے ۔ جملہ چونکہ غلط نہیں تھا ، اس لیے ماسٹر خالد مجھے کچھ بھی نہ کہہ سکے ۔ انہوں نے بھی تو محاورات کے جملے مجھ سے ہی بنوانے کی ٹھان رکھی تھی۔ املا میں بڑے بڑے مشکل اور ثقیل الفاظ لکھواتے ... جیسے تحت الثریٰ، اوج ثریا وغیرہ۔ ان الفاظ کے معانی بھی سنتے ... ایک دن کہنے

لگے : ''اشتیاق ! تم اردو میں بہت اچھے ہو ، اردو میں خاصی دلچسپی لیا کرو ۔''

یہ سن کر میں نے مسمسی صورت بنائی اور کہا :

'' جی وہ تو میری بجائے آپ لیتے ہی رہتے ہیں ۔''

مشکل الفاظ کے معنی بھی وہ مجھ سے پوچھتے ... میں بھی ایسا گھاگ کہ فوراً بتا دیتا ... وہ حیران رہ جاتے اور میں خوشی سے پھولا نہ سماتا۔

ان دنوں محلے کے بچوں کے ساتھ ہمارے کھیل بہت عجیب تھے ... ایک گلی کے سب بچے مل جاتے اور کہتے ہم مسلمان ہیں ... دوسری گلی کے سب بچے مل کر کہتے، ہم تمہارے دشمن ہیں ... اب ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع ہو جاتیں ... تلواریں بنائی جاتیں، یہ تلوار سرکنڈوں یا کھجور کی شاخوں کی ہوتیں ... سرکنڈے اور شاخیں توڑنے کے لیے ہم جنگل میں جاتے ... رات کو ایک محلے کے لڑکے دوسرے محلے پر حملہ کرتے ... ان تلواروں سے خوب جنگ ہوتی ... اکثر سرکنڈے ہمارے جسموں پر بھی لگ جاتے ... ہم پر جوش انداز میں نعرے لگاتے ۔

آپس میں کبڈی کے مقابلے ہوتے ... سڑک کے درمیان میں پانی سے ایک لکیر بنائی جاتی ... اس لکیر کو پالا کہا جاتا اور کبڈی کا مقابلہ شروع ہو جاتا ... میں دبلا پتلا اور کمزور ضرور تھا... لیکن دوڑنے میں تیز تھا ، اس تیزی سے کام لے کر میں اکثر کبڈی کا مقابلہ جیت جاتا ... دکاندار اپنی دکانوں پر بیٹھے ہمیں کھیلتے دیکھتے تھے ، لیکن کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ پیار اور محبت کی ایک فضا تھی جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا ۔

اس زمانے کی ایک شرارت خوب مشہور ہوئی ... محلے کے دو دوست نذیر اور چراغ علی انجم تھے ۔ ایک دن وہ کہنے لگے :

'' کوئی شرارت کرنی چاہیے ۔''

'' مثلاً کیا ۔'' میں بول اٹھا ۔

'' مثلاً یہ جو ہمارے بازار میں ڈاکٹر لیسین صاحب ہیں ... انہیں بیوقوف بنانا چاہیے۔''

'' یہ کیا مشکل ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

'' وہ کیسے۔'' دونوں ایک ساتھ بولے۔

'' میں بتاتا ہوں ... میں جھوٹ موٹ کا مریض بن جاتا ہوں... تم دونوں مجھے دائیں بائیں سے پکڑ لو ... اور مجھے ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر لے چلو۔''

'' لیکن تم بیماری کیا ظاہر کرو گے۔'' چراغ علی انجم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پیٹ درد ظاہر کروں گا ... تم فکر نہ کرو ... میں ایکٹنگ کر لوں گا۔''

'' چلو ٹھیک ہے۔''

انہوں نے مجھے دائیں بائیں سے تھام لیا اور میں لگا ہائے ہائے کرنے ... میرے دونوں ہاتھ اب پیٹ کے اوپر جمے ہوئے تھے اور چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نظر آ رہے تھے۔

'' کیا خیال ہے ... سچ مچ کا بیمار لگ رہا ہوں یا نہیں۔'' میں نے ان سے پوچھا۔

'' نہیں ... بلکہ تم تو برسوں کے بیمار لگ رہے ہو۔''

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اب وہ مجھے لے چلے کلینک کی طرف ... میں بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا ... بازار والے آخر سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے ... چند ایک دوڑ کر نزدیک آ گئے :

'' کیا ہوا ... کیا ہوا؟''

'' اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا ہے۔'' چراغ علی نے فوراً کہا۔

'' جلدی لے چلو۔''

وہ دونوں مجھے ڈاکٹر کی دکان پر لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے اچھی

طرح جانتے تھے، بازار میں والد صاحب کی خوب عزت تھی ... سب حافظ صاحب کہتے تھے ... وہ اگر چہ حافظ نہیں تھے ، لیکن چونکہ دکان پر بیٹھ کر تلاوت کر تے تھے ، اس لیے سب نے انہیں حافظ جی کہنا شروع کر دیا تھا ، بلکہ پنجابی بولنے والے تو ٹھیٹ لہجے میں کہتے تھے :

'' حَافَظ ... ''

جلد ہی بازار میں خبر مشہور ہو گئی کہ حَافَظ کے لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے ... اب بہت سے لوگ کلینک میں پہنچ گئے ... ڈاکٹر یٰسین بھی ایک مدت سے اسی بازار کے ڈاکٹر تھے ۔ سب سے خوب علیک سلیک تھی ... لہٰذا انہوں نے کسی سے یہ نہ کہا کیوں جمگھٹا کر رہے ہو ۔ ادھر انہوں نے جب مجھے پیٹ پکڑے دو ساتھیوں کے سہارے اندر داخل ہوتے دیکھا تو گھبرا کر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے :

'' کیا ہوا ... کیا ہوا ۔''

'' ڈاکٹر صاحب! اس کے پیٹ میں شدید درد ہے ۔'' نذیر نے کہا۔

'' اوہ اچھا... لیٹ جاؤ... یہاں لیٹ جاؤ... میں ابھی دو اِپلا دیتا ہوں ۔''

میں بنچ پر لیٹ گیا ... جلد ہی ان کے کمپاؤنڈر نے مکسچر بنا کر دیا... ڈاکٹر صاحب نے مجھے تھوڑا اٹھایا اور وہ مکسچر میرے حلق میں انڈیل دیا... ساتھ ہی انہوں نے نبض چیک کی ... اور پھر نذیر اور چراغ سے بولے :

'' جلدی سے یہ انجکشن بازار سے لے آؤ ... اس کی حالت بہت خراب ہے ۔''

وہ دونوں کاغذ کی چٹ لے کر چلے گئے ... اور میں وہاں اکیلا رہ گیا... ڈاکٹر صاحب کے کلینک کے بالکل سامنے میرے چچا جان کی دکان تھی۔ وہ درزی تھے ... اپنی سلائی میں لگے ہوئے تھے۔ کسی نے ان سے بھی جا کر کہہ دیا:

'' دین محمد ... تمہارے بھتیجے کی حالت خراب ہے ۔''

چچا جان بھی کام چھوڑ کر فوراً دوڑے آئے... آتے ہی بولے :

'' کیا ہوا ... کیا ہوا ۔''

'' ماسٹر صاحب ! بچے کی حالت بہت خراب ہے ... میں نے اس کے دوستوں کو ٹیکہ لینے کے لیے بھیجا ہے ... اگر وہ جلد نہ آئے تو معاملہ گڑبڑ ہو سکتا ہے۔''

چچا جان کا رنگ اڑ گیا ... وہ اباجی کی دکان کی طرف دوڑ لگا گئے۔ ادھر میرے دونوں ساتھی غائب تھے ... انہوں نے پھر آنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، کیونکہ بڑا بھلا تو انہیں بھی کہا جاتا ... لیکن وہ اس وقت سے پہلے ہی کھسک لیے تھے ... اتنے میں والد صاحب بھی آ گئے... اب میں بُری طرح گھبرا گیا ... کیونکہ معاملہ لمبا ہو گیا تھا اور اب اس ڈرامے کو ختم کر دینا چاہیے تھا ... چنانچہ میں زور سے ہنس پڑا اور بول اٹھا :

'' ڈاکٹر صاحب! آج یکم اپریل ہے ۔''

'' او شیطان۔'' یہ کہتے ہی ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے... انہوں نے میرا کان پکڑ لیا ... لیکن انداز پیار بھرا تھا ... ادھر اباجان غصے میں نظر آئے... انہوں نے کہا : '' کتنی بری بات ہے ... ایسی شرارت نہیں کرنی چاہیے ۔''

'' کوئی بات نہیں حافظ صاحب ... بچہ ہے ۔''

اس طرح معاملہ رفع دفع ہوا اور میں پٹنے سے بال بال بچا۔ دوسرے دن نذیر اور چراغ ملے تو میں نے شکایتی لہجے میں کہا :

'' مجھے پھنسوا کر تم کہاں غائب ہو گئے تھے ۔''

'' ہم ٹیکہ لینے چلے گئے تھے ۔'' دونوں ایک ساتھ بولے ۔اور پھر ہم تینوں ہنس پڑے۔ یہ تو ہوا ، لیکن اس دن کے بعد میں نے یکم اپریل نہیں منایا۔

ان دونوں دوستوں کے ساتھ ایک واقعہ اور پیش آیا۔

ایک روز ان دونوں کی کسی بات پر زبردست لڑائی ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے بول چال بند کردی ... اب دونوں پریشان رہنے لگے، کیونکہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بنچکے تھے اور بہت محبت کرتے تھے ... جب تک روزانہ مل نہ لیتے انہیں چین نہ آتا تھا ... لیکن اس لڑائی کی وجہ سے دونوں میں ملاقات کا سلسلہ بالکل رک گیا تھا۔ رنج ان کے چہروں سے صاف جھلکتا تھا ... لیکن صلح کے لیے دونوں میں سے کوئی بھی پہل کرنے کو تیار نہا تھا ... میں ان کی حالت بخوبی سمجھ رہا تھا ... کیونکہ دونوں آخر میرے دوست تھے۔ لیکن مجھ سے ان کی دوسی اس قدر نہیں تھی جتی ان دونوں کی آپس کی تھی۔

اب میں نے سوچا، ان کی کسی طرح صلح کروا دینی چاہیئے، تاکہ ان کی پریشانی دور ہوجائے۔ سوچ سوچ کر ایک ترکیب ذہن میں آئی ... میں گھر گیا ... کاغذ قلم سنبھالا اور نذیر کی طرف سے چراغ علی انجم کو ایک خط لکھا۔

خط کے الفاظ یہ تھے: پیارے دوست ! اسلام و علیکم ... امید ہے خیریت سے ہو گے ... ہم بلاوجہ لڑ پڑے ... ایسی کوئی خاص بات تو نہیں تھی ... لہٰذا اس بات کو بھول جاؤ ... درگزر کرو ... میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں ... آج شام آٹھ بجے ڈاکٹر یٰسین صاحب کے کلینک کے باہر ملاقات کے لیے آؤں گا، اگر تم نہ آئے تو میں سمجھوں گا کہ تم مجھ سے دوستی نہیں کرنا چاہتے ...

فقط والسلام ... تمہارا دوست

نذیر احمد

میں نے یہ خط تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا ... اور پھر ایک خط چراغ علی کی طرف سے لکھا۔ اس خط کے الفاظ بھی بالکل یہی تھے ... میں نے اس خط کو بھی تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا ... نذیر احمد کے گھر کے دروازے پر پہنچا ... دستک دی تو اس کا چچازاد بھائی باہر آیا ... میں نے چراغ علی کا خط اسے دیا اور کہا:

''یہ نذیر احمد کو دے دیجئے گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔

اس طرح میں نے نذیر احمد والا خط چراغ علی کے گھر پہنچا دیا۔

اب مجھے اپنی اس ترکیب کے نتیجے کا انتظار تھا... لہٰذا میں آٹھ بجنے سے چند منٹ پہلے اپنے والد کی دکان پر پہنچ گیا... ڈاکٹر صاحب آٹھ بجے کلینک بند کر دیتے تھے... ادھر وہ کلینک بند کر کے گئے... ادھر میں نے نذیر احمد کو وہاں پہنچتے دیکھا... میں دل ہی دل میں مسکرا دیا... والد صاحب کی دکان سے کلینک بالکل صاف نظر آتا تھا... اتنے میں چراغ علی بھی آتا نظر آیا... جونہی وہ نذیر کے قریب پہنچا... دونوں نے ہاتھ آگے بڑھا دیئے، پھر وہ گلے بھی ملے... ساتھ ہی انہوں نے بات چیت شروع کی تو دونوں لگے انکار میں سر ہلانے... گویا وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے:

''میں نے نہیں... تم نے خط لکھا ہے۔''

''نہیں... تم نے لکھا ہے۔''

اب انہوں نے اپنا اپنا خط نکال کر ایک دوسرے کو دکھایا... فوراً وہ سمجھ گئے کہ یہ میرا کام ہے... دوسرے دن انہوں نے بازار میں مجھے روک لیا اور سخت ناراضگی کے عالم میں کہا: ''تو یہ تمہاری حرکت تھی۔''

''ہاں دوستو...''

''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔'' دونوں نے انتہائی غصے کی حالت میں کہا۔

میں حیران رہ گیا... میری ترکیب سے ان دونوں میں صلح ہوگئی تھی... انہیں خوش ہونا چاہیئے تھا... میرا شکریہ ادا کرنا چاہیئے تھا... لیکن اس کے الٹ وہ مجھ پر بگڑ رہے تھے... ناراض ہو رہے تھے... اس پر مجھے کافی رنج ہوا... ان کی دوستی شروع ہوگئی... اور دونوں نے مجھ سے بات چیت بند کردی... کافی دنوں بعد جہیں جا کر ان کی ناراضگی ختم ہوئی اور انہوں نے مجھ سے بات چیت شروع کی...

میں آج بھی سوچتا ہوں ... یہ کیسی عقلمندی تھی ؟؟

☆☆☆

نویں جماعت میں داخل ہوا تو میرے ڈیسک پر دو لڑکے بیٹھنے لگے ... ان سے علیک سلیک ہوئی ۔ ان کے نام آصف محمود اور سلامت اللہ تھے ۔ آصف محمود کا گھر چنبیلی مارکیٹ میں تھا جب کہ سلامت اللہ شیخ لاہوری محلے میں رہتا تھا۔ ہم تینوں میں آہستہ آہستہ دوستی ہوتی چلی گئی اور پھر تو ہم ہر وقت ساتھ رہنے لگے۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا ہو گیا۔ میرا سلامت اللہ کے گھر میں آنا جانا اس قدر بڑھا کہ بلاناغہ جانے لگا ۔ سلامت اللہ کے والد لاہور میں ملازمت کرتے تھے ۔ وہ اپنی والدہ اور دو بہنوں کے ساتھ رہتا تھا ۔ بڑی دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دوسرے شہروں میں رہتی تھیں۔ اس طرح اس گھر کے چار ہی افراد تھے۔ یہ چاروں مجھ سے اس قدر گھل مل گئے کہ اگر کسی روز میں ان لوگوں کے گھر نہ جاتا تو وہ سلامت اللہ کو بھیج کر پتا کراتے تھے:

'' اشتیاق کیا بات ہے... آج تم آئے نہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

ان حالات میں ہم نے نویں جماعت میں قدم رکھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو سلامت اللہ اپنی بہن سے ملنے کراچی چلا گیا ... میں نے سوچا، اسے خط لکھنا چاہیے ... خط لکھا ، لیکن میرے پاس اس کا کراچی کا پتا نہیں تھا ۔ پتا پوچھنے کے لیے ان کے گھر گیا ... میں نے انہیں بتایا :

'' میں نے سلو کو خط لکھا ہے ... پتا بتا دیں ...''

'' خط ... ہمیں دکھانا ۔'' ان کی دونوں بہنیں ایک ساتھ بول اٹھیں۔

دونوں بہنوں کے نام رابعہ مرتضٰی اور راشدہ مرتضٰی تھے۔ دونوں بی اے کر چکی تھیں ۔ رابعہ مرتضٰی تو خاص طور پر ادبی ذوق کی حامل تھیں ... افسانہ نگار تھیں اور اس وقت تک ان کے بہت سے افسانے ماہنامہ زیب النسا اور حور میں چھپ چکے تھے... انہوں نے اشتیاق ظاہر کیا تو میں نے خط انہیں دے دیا ...

انہوں نے خط پڑھا۔ رابعہ باجی فوراً پکار اٹھیں:

''اشتیاق تم کچھ لکھا کرو۔''

''جی... لکھتا تو رہتا ہوں۔'' میں نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''تم سمجھے نہیں... تم کوئی کہانی لکھا کرو... مضمون لکھا کرو... لکھ کر ہمیں دکھایا کرو... ہم تمہاری کہانی کی اصلاح کر دیا کریں گے... پھر تم اسے دوبارہ لکھ کر کسی رسالے کو بھیج دیا کرو... اس طرح تمہاری کہانیاں بھی شائع ہونے لگیں گی جس طرح تم دوسروں کی کہانیاں پڑھتے ہو... اس طرح تمہاری کہانیاں دوسرے پڑھا کریں گے۔''

''بھئی واہ یہ تو بہت مزے کی بات ہوگی۔'' میں تو خوش ہو گیا۔

''تو پھر کوشش کرو گے نا۔''

''ہاں! بالکل... کیوں نہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

گھر آیا تو سوچنے لگا... کہانی کیسے لکھوں اور کیا لکھوں... ایسے میں اپنے قد پر نظر پڑی... میرا قد چھوٹا تھا۔ اسے لمبا کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا... کبھی لکڑی کی سیڑھی کا ڈنڈا پکڑ کر لٹکتا تھا تو کبھی اپنا قد ماپتا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک چھوٹی سی کوٹھری اوپر والے کمرے کے ساتھ تھی۔ اس کی چھت نیچی تھی۔ البتہ میرے قد سے وہ چھت قدرے اونچی تھی۔ میں اس میں کھڑا ہو جاتا اور دیکھتا کہ میرا سر چھت سے لگا یا نہیں، کیونکہ سر کے چھت سے لگ جانے کا مطلب یہ تھا کہ میرا قد بڑھ گیا ہے۔ کبھی سر اور چھت کے درمیان اپنا ہاتھ رکھ کر درمیانی فاصلہ ماپتا کہ ابھی چھت میرے سر سے کتنی دور ہے... کہانی لکھنے کا سوال پیدا ہوا تو قد پر نظر پڑی... سوچا اپنے چھوٹے قد پر ہی کہانی لکھ دیتا ہوں... کیونکہ کوٹھری میں جا کر قد ناپنے کے دوران ایک دن ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ اس روز اندر جا کر کھڑا ہو تو میرا سر چھت کی کڑی سے لگ گیا۔ بس پھر کیا تھا... میں لگا اچھلنے اور چیخنے:

''میرا قد بڑھ گیا ، میرا قد بڑھ گیا ۔''

امی کے کانوں تک یہ آوازیں پہنچیں تو جلدی سے میرے پاس آئیں اور غصے کی حالت میں کہنے لگیں :

'' کیا ہے ... کیوں چلا رہے ہو ۔''

'' دیکھیے امی ! میرا قد بڑھ گیا ... پہلے سر کوٹھری کی چھت سے نہیں لگتا تھا... آج لگ گیا ہے ۔''

امی ہنس دیں اور انہوں نے کہا :

'' پگلے ... قد اتنی جلدی نہیں بڑھا کرتے ۔ اس کوٹھری کی ایک کڑی چیخ کر ٹیڑھی ہو گئی ہے ... اس لیے تمہارا قد اس سے جا لگا ہے ۔''

میرا منہ بن گیا ... یعنی کہانی لکھنے سے پہلے یہ واقعہ پیش آ چکا تھا ...اس لیے قد پر نظر پڑتے ہی یہی کہانی ذہن میں آئی اور بڑا قد کے نام سے کہانی لکھنے بیٹھ گیا...اس وقت مجھے خود بھی حیرت ہوئی تھی کہ صرف پندرہ منٹ میں کہانی مکمل ہو گئی تھی ... اسے ایک بار پڑھ کر دیکھا ، پھر صاف صاف لکھا ...اور سوچنے لگا ... اب اس کا کیا کروں ... باجی رابعہ نے کہا تھا ، کہانی لکھ کر ہمیں دکھانا ... ہم اس کی اصلاح کر دیں گے... پھر کسی رسالے کو بھیج دینا... لیکن میں نے ایسا نہ کیا ... میں نے سوچا، کہانی شائع ہونے پر انہیں کیوں نہ دکھائی جائے ۔

ان دنوں لاہور سے ایک رسالہ ہفت روزہ قندیل شائع ہوتا تھا... اس کا دفتر نوائے وقت بلڈنگ میں تھا ۔ اس وقت اس کی قیمت چار آنے تھی ... قندیل کے مدیر شیر محمد اختر اور نائب مدیر محمود شام تھے جو اب روزنامہ جنگ سے وابستہ ہیں اور بہت نامور صحافی ہیں۔ میرے پڑوس میں یہ رسالہ ایک گھرانہ خریدتا تھا ۔ اس میں دو صفحات بچوں کے لیے ہوتے تھے ۔ ان دو صفحات میں چونکہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہوتی تھیں،اس لیے میں بھی ان دو صفحات کو پڑھنے کے لیے رسالہ لے لیتا تھا ۔ اب جو کہانی لکھی تو سوچا، کیوں نہ قندیل کو بھیج دوں ۔ اس خیال کا

آنا تھا کہ ڈاک خانے سے ڈاک کا ایک لفافہ خرید لایا۔ ڈاک کے لفافے کی قیمت اس وقت دو پیسے تھی اور پوسٹ کارڈ ایک پیسے کا ملتا تھا ۔زیادہ تر لوگ کارڈ لکھ کر ہی کام چلاتے تھے ... لیکن مجھے چونکہ کہانی پوسٹ کرنی تھی ، اس لیے یہ لفافہ خریدنا پڑا... خیر ابا جی جیب خرچ دیتے تھے... اس میں سے لفافہ خریدا گیا ۔ لفافے پر ہفت روزہ قندیل کا پتا لکھا ، کہانی لفافے میں رکھی اور لفافہ بند کر کے پوسٹ بکس میں ڈال دیا۔

اب لگا انتظار کرنے ۔ آخر قندیل کا نیا شمارہ اس گھر میں آ گیا۔ فوراً ان سے لے کر بچوں کے صفحات نکالے ، لیکن کہانی وہاں نہیں تھی... بہت مایوس ہوا... یہ بھی نہ سوچا کہ جب میں نے کہانی پوسٹ کی ... اس وقت تک تو یہ شمارہ تیار ہو چکا ہوگا ... خیر آٹھ دن بہت بے صبری کے عالم میں گزارے ... اب جو شمارہ آیا... اس میں بڑا قد موجود تھی ... میں بتا نہیں سکتا ، وہ چھوٹی سی کہانی دیکھ کر میں کس قدر خوش ہوا تھا... فوارہ چوک پر اخبارات اور رسائل کی ایجنسی تھی... فوراً وہاں پہنچا ۔ رسالے کی قیمت چار آنے تھی... چار آنے دے کر رسالہ وہاں سے اٹھایا اور تیز تیز چلتا سلامت اللہ کے گھر جا پہنچا۔ باجی رابعہ اور باجی راشدہ مجھے صبح سویرے دیکھ کر حیران ہوئیں... ان کی والدہ بھی ساتھ ہی بیٹھی تھیں... انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا :

''خیر تو ہے اشتیاق !آج تم اتنی جلدی ہی آ گئے۔''

میں نے فوراً کہا :

''جی ہاں! سب خیریت ہے ۔''

پھر باجی رابعہ کی طرف قندیل بڑھا دیا :

''یہ کیا ہے ... قندیل ! مجھے کیوں دے رہے ہو ۔''

''یہ دیکھیں ۔'' میں نے کہانی والا صفحہ کھول کر ان کے سامنے کر دیا ...

بڑا قد کے ساتھ میرا نام دیکھ کر وہ اچھل پڑیں... اور بول اٹھیں:

'' ارے ! یہ کیا... کہانی لکھ کر چھپوا بھی لی ... اور ہمیں خبر تک نہیں کی ... اچھاٹھہرو... پڑھ کر دیکھتے ہیں۔''

پھر تینوں نے کہانی کو پڑھا... میں اس دوران بار بار ان کے چہروں کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر باجی رابعہ نے کہا:

'' اچھی کہانی ہے اشتیاق ... بس تم اسی طرح لکھتے رہو۔''

باجی راشدہ اور ان کی والدہ نے بھی تعریف کی ... میں وہاں سے گھر آیا اور دوسری کہانی لکھنے بیٹھ گیا ... دوسری کہانی بھی پندرہ بیس منٹ میں لکھی گئی۔ اس کا نام انعامی ٹوکن رکھا اور اسے بھی باجی رابعہ کو دکھائے بغیر پوسٹ کر دیا۔ دو ہفتے بعد انعامی ٹوکن بھی چھپ گئی... اب تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ کہانی بھی انہیں دکھائی۔ انہوں نے شاباش دی۔ ان کی شاباش وصول کرکے گھر آیا ...اور تیسری کہانی شروع کر دی ... پہلے دونوں کہانیاں میں نے گھر والوں کو بھی دکھائی تھیں ...لیکن میرے والد اور ماموں بہت کم پڑھے لکھے تھے اور والدہ قرآن شریف پڑھی ہوئی تھی... ماموں جان نے میرے اس شوق کو پسند نہیں کیا، کہنے لگے:

'' یہ تم نے کیا شروع کر دیا، یہ تو بے کار لوگوں کے شوق ہیں۔''

مجھے ان کی بات اچھی نہ لگی، کیونکہ دو کہانیاں شائع ہونے پر مجھے جو خوشی ہوئی تھی، وہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے ...کسی رسالے میں اپنے نام کی اشاعت اس وقت مجھے بہت بڑی بات محسوس ہوئی تھی۔ اس خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

میں نے تیسری کہانی شروع کی۔ عجیب بات یہ محسوس کی تھی کہ ادھر میں کہانی شروع کرتا تھا، ادھر کہانی مکمل ہو جاتی تھی۔کوئی دیر نہیں لگتی تھی ... نہ کانٹ چھانٹ کی ضرورت پیش آتی تھی۔ بلکہ پہلی کہانی بڑا قد کے بعد تو میں نے رف فیئر کا چکر بھی چھوڑ دیا تھا ... یعنی پہلی بار جو لکھا گیا ... بس وہی بھیج دیتا تھا اور مزے کی بات یہ کہ وہ فوراً چھپ جاتی تھی۔

☆☆☆

ان دنوں ... یعنی یوں سمجھ لیں یہ باتیں ہیں 1958ء اور 1959ء کی۔ والد صاحب اور ماموں جان کی پر چون کی دکان کے حالات زیادہ بہتر نہیں تھے۔ جب کام شروع کیا تھا تو دکان خوب چلنے لگی تھی ... بلکہ پورے بازار لوہاراں میں ہماری دکان اچی ہٹی (اونچی دکان) کے نام سے مشہور تھی ... لیکن جب ماموں جان نے شادی کر لی ... تو ممانی صاحبہ نے آتے ہی گھر کے حالات کا جائزہ لیا اور اعتراض کیا :

'' یہ تو آٹھ کھانے والے ... اور ہم صرف دو ... آج کے بعد پورا پورا حساب ہوا کرے گا ... آمدنی کے دو حصے کیے جایا کریں گے ۔''

میرے والد صاحب نے کوئی اعتراض نہ کیا ... وہ گھر کی فضا کو خراب نہیں کرنا چاہتے تھے ... لیکن ہوا یہ کہ جونہی حساب کتاب کیا جانے لگا... گویا دکان کی برکت ہی اڑ گئی ... اور روز بروز دکان کی بکری کم ہو نے لگی ...اور کم کیا ہونے لگی ... پھر وہ بات دکان میں کبھی نظر ہی نہ آئی... وہ بہاریں گویا ہم سے روٹھ گئیں ... دکان خالی خالی نظر آنے لگی۔ پہلے دکان میں سامان کی بوریاں بھری نظر آتی تھیں... اب سامان ڈبوں میں نظر آنے لگا ...

برکت کیا اڑی ... ہم سب کی بے فکری کو بھی ساتھ لے گئی... اس طرح مالی پریشانیوں کی ابتدا ہوئی ... گھر کی پریشانیوں کے ساتھ میں نویں جماعت میں داخل ہو اتھا ... اس سے پہلے کبھی احساس نہیں گزرا تھا کہ مالی پریشانیاں بھی کوئی چیز ہیں ... کیونکہ پاکستان بننے کے بعد سے لے کر 1957,1956 تک دکان خوب چلی تھی ... ہر وقت دکان پر گاہکوں کا رش دیکھنے میں آتا تھا ... یہاں تک کہ مجھے بھی والد صاحب اور ماموں جان کے ساتھ دکان پر بیٹھنا پڑ تا تھا ، ان کی مدد کرنا پڑتی تھی ... لیکن پھر دکان میں خاک اڑنے لگی ...

تنگی کا دور شروع ہوا اور زندگی کا یہ رخ بہت واضح ہو کر سامنے آیا کہ آسانیوں کے ساتھ زندگی میں مشکلات بھی آتی ہیں... یہ نہیں کہ ساری زندگی

آسانیاں ہی آسانیاں رہیں ... مالی تنگیوں نے مجھے ایک نئی دنیا دکھادی ... رنج اور غم کے سائے ساتھ چلنے لگے ... ان سے دوستی ہو گئی...

ان سے کیا دوستی ہوئی ... تحریر میں بھی یہ چیز اثر انداز ہوئی ... اب زندگی کے ان رخوں پر کہانیاں لکھنے لگا ... قندیل کے مدیر برابر حوصلہ افزائی کر رہے تھے ... کہانیاں شائع کر رہے تھے ... ان حالات میں ایک روز مجھے ان کا خط ملا ... انہوں نے لکھا تھا :

'' آپ اچھی کہانیاں لکھ لیتے ہیں، بچے ہی نہیں آپ کی کہانیاں بڑے بھی پسند کرتے ہیں ...کبھی لاہور آئیں تو ضرور ملیں ... میرے نائب محمود شام بھی جھنگ کے ہیں ... ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی ۔''

شیر محمد اختر

مدیر ہفت روزہ قندیل

یہ خط کیا تھا...میرے لیے خوشیوں کا پیغام تھا ۔ میں نے والد صاحب سے ذکر کیا اور کہا :

'' مجھے ایک دو دن کے لیے لاہور جانے دیں ...''

والدصاحب میرے لکھنے لکھانے کو ناپسند نہیں کرتے تھے ... بس ماموں جان منہ بنایا کرتے تھے ، اس لیے والدصاحب نے اجازت دے دی ۔ ماموں جان نے ماسٹر نذیر احمد آثم صاحب کا پتا اچھی طرح سمجھا دیا ... اس طرح میں نے زندگی میں پہلی بار تنہا سفر کیا ... نیو خان کی بس شہید روڈ سے چلتی تھی ۔ اس کا لاہور کا کرایہ چار روپے تھا۔ پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد لاہور پہنچا تو ماسٹر نذیر احمد آثم صاحب نیو خان کے اڈے پر موجود تھے۔ چار دن پہلے ماموں جان نے انہیں خط لکھ دیا تھا کہ بھانجا یہاں سے صبح چار بجے کی گاڑی سے لاہور کے لیے روانہ ہو گا... آپ اسے اڈے سے لے لیجیے گا ... ویسے کسی وجہ سے آپ نہ آسکے تو ہم نے اسے پتا اچھی طرح سمجھا دیا ہے ، اس نے پتا لکھ بھی لیا ہے ...

''اچھا!'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ پھر بولا :

'' اگلی مرتبہ تم آؤ... تو میرے لیے کچھ کہانیاں لے کر آنا۔''

'' اچھی بات ہے۔''

ہم دونوں چھٹیوں کا کام ایک ساتھ بیٹھ کر کرتے ... اسکول کا کام کرنے میں وہ میری مدد کرتی ... چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ لاہور چلے گئے.... میں بہت اداس رہنے لگا اور انتظار کرنے لگا کہ کب پھر گرمیوں کی چھٹیاں ہوں اور وہ لوگ آئیں اور میرے لیے کہانیوں کی کتابیں لائیں ...

آخر خدا خدا کر کے چھٹیاں ہو گئیں اور ماسٹر نذیر احمد آثم صاحب اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ آئے۔ خورشید نے اپنا وعدہ یاد رکھا تھا ... وہ میرے لیے کہانیوں کی بہت سی کتابیں لائی تھی... یہ کتابیں رشید احمد والی کتابوں سے قدرے بڑی اور اچھی تھیں۔ ان میں بچوں کے رسالے بھی تھے۔ کھلونا اور بچوں کی دنیا وغیرہ ...میں نے ان رسالوں کو بھی پڑھا۔ ان میں شائع کی گئی کہانیاں کچھ مختلف بھی تھیں ... یعنی جنوں، بھوتوں، شہزادوں، شہزادیوں کے علاوہ بھی کچھ کہانیاں تھیں... میری اور خورشید کی دوستی ان کہانیوں کی وجہ سے بہت گہری ہو گئی... وہ تقریباً ہر سال ہی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے جھنگ آتے تھے ... ان کے بہت سے قریبی رشتے دار جھنگ میں رہتے تھے۔

خورشید کے تایا بھی ہمارے نزدیک ہی رہتے تھے، لیکن وہ ٹھہرتے ہمارے ہاں ہی تھے ... اس طرح ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں اکٹھے کام کرنا ہمارا معمول بن گیا...ہم والد صاحب کی دکان پر بھی جاتے... وہاں سے بادام جیبوں میں بھر لاتے اور توڑ توڑ کر کھاتے ... دکان پر دیسی گھی ہوتا تھا ... وہ کچا ہی نکال کر کھا جاتے۔

کہانیاں پڑھنے اور اسکول کا کام اکٹھے کرنے کا معمول جاری رہا ... اردو پڑھنے کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی ... اس لیے ایک دن میں دو دو تین تین

لہٰذا خود ہی پہنچ جائے گا۔''

ماسٹر نذیر احمد آثم صاحب کو بھی میں ماموں جان کہتا تھا... وہ گرم جوشی سے ملے... پھر ٹانگے میں بٹھا کر گھر لائے۔ ان دنوں رکشے قطعاً نہیں ہوتے تھے۔ شہروں میں ٹانگے ہی چلتے تھے۔

میں گھر میں داخل ہوا۔ خورشید، اس کی والدہ اور چھوٹی بہن سے ملاقات ہوئی۔ خورشید مجھے دیکھ کر حد درجے خوش ہوئی۔ ہم نے گرمیوں کی چھٹیاں اکثر ساتھ گزاری تھیں۔

دوسرے دن ماموں جان سے نوائے وقت بلڈنگ کا پتا پوچھا... اور چل پڑا پیدل۔ ماسٹر نذیر احمد آثم بازار وچھو والی کوچہ سدھو مصر شاہ عالمی میں رہتے تھے۔ شاہ عالمی سے نوائے وقت بلڈنگ تک پیدل سفر اتنا کم نہیں تھا، لیکن جب شوق سر پر سوار ہو تو طویل فاصلے بھی مختصر لگتے ہیں۔ قندیل کا دفتر اوپر والی منزل پر تھا۔ پوچھتا ہوا آخر دفتر کے سامنے پہنچ گیا۔ دفتر دو کمروں پر مشتمل تھا... ایک دروازے پر شیر احمد اختر کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی... باہر کوئی چپراسی وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے دروازے سے باہر رک کر اجازت چاہی اور اندر داخل ہوگیا۔ اندر سانولے سے رنگ کے ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے تھے:

''شیر محمد اختر صاحب؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

انہوں نے سر ہلا دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا اور کہا:

''میں اشتیاق احمد ہوں... یہ آپ کا خط مجھے ملا تھا۔''

''اوہ اچھا... خوشی ہوئی آپ آئے، میں محمود شام صاحب کو بلاتا ہوں۔''

جلد ہی محمود شام صاحب کمرے میں داخل ہوئے... انہوں نے مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا، پھر مجھے اپنے کمرے میں لے آئے... اب انہوں نے کہانیوں پر بات شروع کی:

''آپ کا لکھنے کا انداز اچھا ہے... بس آپ لکھتے رہیں... اور کہانیاں

لکھ کر بھیجتے رہیں...''

'' جی بہت اچھا ... میں اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔''

اس قسم کی ان سے دو چار باتیں ہوئیں...پھر میں نے ان سے اجازت چاہی اور میں وہاں سے چلا آیا ... یہ کسی رسالے کے دفتر میں جانے کا میرا پہلا اتفاق تھا... اور یہ اتفاق بہرحال خوشگوار تھا۔

گھر پہنچا تو میں نے خورشید سے کہا:

'' اب مجھے کہانیوں کی کتابوں کی وہ الماری دکھاؤ ، جس کا تم ذکرکرتی نہیں تھکتی تھیں۔''

'' ہاں کیوں نہیں ۔''

وہ الماری ان کے گھر کے صحن ہی میں تھی...گھر کا صحن بہت چھوٹا تھا... صحن کے ساتھ ہی ایک بڑا کمرہ تھا ... اور اس بڑے کمرے کے سامنے باورچی خانہ تھا... یعنی درمیان میں وہ صحن تھا ... صحن کے اوپر دوسری منزل پر بھی ایک بڑا کمرہ تھا... اس کمرے کے سامنے کھلی چھت تھی ... گرمیوں کے موسم میں یہ چھت سونے کے کام آتی تھی۔

خورشید نے الماری کھولی تو وہ واقعی کہانیوں کی کتابوں اور بچوں کے رسالوں سے خوب بھری ہوئی تھی ... میں دو دن وہاں ٹھہرا... اور اس دوران بس کہانیوں کی کتابیں ہی نکال نکال کر پڑھتا رہا... دو دن بعد واپس جھنگ پہنچا تو سلامت اللہ کے گھر پہنچ گیا ... باجی رابعہ نے ماہنامہ زیب النسا کا نیا شمارہ میرے سامنے رکھ دیا ... میں سمجھ گیا کہ ان کا کوئی افسانہ شائع ہوا ہے ... گویا وہ کہہ رہی تھیں:

'' لو اشتیاق ! میرا افسانہ پڑھو۔''

ان کا افسانہ پڑھا... اس وقت افسانے میری سمجھ میں کم ہی آتے تھے۔ افسانہ کافی غمگین تھا ... باجی رابعہ ہمیشہ غمگین افسانے لکھتی تھیں ... افسانہ پڑھ کر

میرا جی چاہا... کیوں نہ میں بھی ایک افسانہ لکھوں ... میں نے ان سے کہا :

''میرا جی چاہتا ہے ... میں بھی ایک افسانہ لکھوں۔''

وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں :

''ابھی تم کہانیاں ہی لکھتے رہو۔''

ان کی نصیحت پر عمل کیا اور کہانیاں لکھنے کا کام جاری رکھا۔ اب میں قندیل کے علاوہ بھی چند دوسرے رسائل میں کہانیاں بھیجنے لگا تھا... ان حالات میں ہم میٹرک میں آ گئے... سلامت اللہ کی والدہ نے اس کے لیے ایک ٹیوٹر رکھ دیئے... وہ گھر آ کر انہیں پڑھاتے تھے ... سلامت اللہ نے مجھے بتایا، ان کی فیس سو روپے ماہوار مقرر کی گئی ہے ۔

''سو روپے ؟'' میرے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

دوسری طرف آصف محمود کے والد نے بھی اس کی ٹیوشن کا انتظام کر دیا۔ یہ دونوں ٹیوٹر کے ذریعے میٹرک کے امتحان کی تیاری کرنے لگے ... جب کہ مجھے ٹیوٹر میسر نہیں تھا ... ایک سو روپے ماہوار ادا کرنا اس زمانے میں بہت مشکل تھا... میرے والد صاحب کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کے دونوں دوستوں نے ٹیوشن رکھ لی ہے تو وہ بھی پریشان ہوئے ۔ انہیں پریشان دیکھ کر میں نے ان سے کہا :

''آپ فکر نہ کریں... میں ٹیوٹر کے بغیر ہی ان شاء اللہ کامیابی حاصل کروں گا۔''

والد صاحب مطمئن ہو گئے اور میں نے اپنے طور پر خوب محنت شروع کر دی۔ آخر میٹرک کا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ میں نے 672، آصف نے 663 اور سلامت اللہ نے 601 نمبر حاصل کیے ۔ یہ نمبر گزٹ میں دیکھے گئے ... میں نے دکان پر آ کر والد صاحب کو نمبر بتائے اور بتایا کہ میری ہائی فسٹ ڈویژن آئی ہے ... والد صاحب بہت خوش ہوئے ۔ آس پاس کے دکان داروں کو بھی یہ بات معلوم

ہوئی تو سب مبارک باد دینے کے لیے دکان پر آ گئے... بعد میں معلوم ہوا ، پورے محلے میں یہ نمبر سب سے زیادہ ہیں ۔

سلامت اللہ کے گھر پہنچا تو وہاں سوگ سا طاری تھا ... کیونکہ اس کے 601 نمبر آئے تھے... اور ان کے نزدیک یہ نمبر بہت ہی کم تھے ... اگرچہ تھی اس کی بھی فسٹ ڈویژن ... لیکن اس کی بہنیں اور والدہ اس پر بگڑ رہی تھیں اور سلامت اللہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا ... میں گھر میں داخل ہوا تو باجی رابعہ ، باجی راشدہ اور ان کی والدہ زور شور سے مبارک باد دینے لگیں ۔

O

میٹرک کرنے کے بعد آصف محمود تو مزید تعلیم کے لیے اپنے بہنوئی میاں احسان الحق بختیار ایڈووکیٹ کے پاس چلا گیا ... سلامت اللہ نے کراچی کی راہ لی ... میں رہ گیا ... والد صاحب نے مجھ سے صاف کہہ دیا :

'' بیٹا ! اب کوئی ملازمت ڈھونڈو ... آگے پڑھانا ہمارے بس کی بات نہیں ۔''

'' جھنگ میں تو پھر ملازمت ملنے کے امکانات بہت کم ہیں ... آپ اجازت دیں تو میں لاہور چلا جاتا ہوں۔ بڑا شہر ہے... امید ہے کوئی ملازمت مل جائے گی ۔''

'' ٹھیک ہے ... تم لاہور چلے جاؤ ... یہاں میرے کچھ ملنے والے ہیں... ان کے قریبی رشتے دار لاہور میں سرکاری ملازم ہیں... تمہیں ضرور کوئی ملازمت دلوا دیں گے ، سنا ہے ... وہ ریلوے میں بڑے افسر ہیں ۔''

'' تب پھر آپ ان سے بات کریں ... اگر وہ مجھے اپنے ساتھ لاہور لے جائیں اور ان سے بات کریں تو اس طرح تو کام آسانی سے ہو سکتا ہے ۔''

'' ٹھیک ہے ... میں ان سے بات کرتا ہوں ۔''

والد صاحب نے اپنے دوست سے بات کی... تو انہوں نے کہا :

'' ٹھیک ہے... میں آپ کے بیٹے کو خود لاہور لے جاتا ہوں،انشاء اللہ اسے ریلوے میں ملازمت مل جائے گی ۔''

اس طرح چند دن بعد لاہور جانے کا پروگرام طے ہو گیا۔ والد صاحب کے دوست لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ پہلے مجھے اپنی ہمشیرہ کے گھر لے گئے... پھر دوسرے دن لے کر ریلوے آفیسر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ان کا نام محمد حنیف بھور تھا۔ وہ اچھی طرح ملے۔ ملازمت کی بات سن کر فکرمند سے ہو گئے، کہنے لگے:

'' فی الحال تو میرے پاس مزدوروں کی کچھ جگہیں خالی ہیں ... انہیں وہاں لگا لیتے ہیں۔ کچھ کلرکوں کی جگہیں نکلیں تو پھر انہیں وہاں لگوا دوں گا۔''

والد صاحب کے دوست نے میری طرف دیکھا، میں نے فوراً سر ہلا دیا ... مجھے رضامند پا کر انہوں نے محمد حنیف بھور صاحب سے کہا:

'' ٹھیک ہے ... آپ اسے لگوا دیں۔''

'' آپ کل صبح آٹھ بجے میرے پاس آ جائیں۔''

'' جی بہت بہتر۔''

ہم وہاں سے چلے آئے۔ اب والد صاحب کے دوست نے کہا:

'' میں تو پھر واپس جھنگ جاتا ہوں... تم کل وہاں چلے جانا ... رہ گئی رہائش کی بات تو میری بہن تمہیں ایک چارپائی جتنی جگہ تو دے ہی دیں گی۔''

اس پر میں نے فوراً کہا:

'' میں آپ لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا ... یہاں میرے ماموں کے دوست رہتے ہیں، ان کا ہمارے ہاں بہت آنا جانا ہے ... دونوں گھرانوں کے قریبی تعلقات ہیں ... لہٰذا میں ان کے ہاں ٹھہر جاؤں گا۔''

یہ سن کر ان کی بہن بولیں:

'' جیسے تمہاری مرضی ... ویسے آتے جاتے رہنا ... کوئی پریشانی ہو تو مجھے بتا دیا کرنا۔''

'' جی اچھا۔'' یہ کہہ کر میں نے ان سے اجازت لی۔

اور سچ یہ ہے کہ وہ خاتون واقعی بہت مہربان تھیں...بہت محبت سے پیش آتی رہیں ... ان کا گھر رام گلی میں تھا... چوک دال گراں کے آس پاس... اب میں قدرے بھول گیا ہوں ... بہر حال ... خاتون بہت محبت کرنے والی ثابت ہوئیں ... میں کبھی کبھار ان سے ملنے چلا جاتا تو مجھے کھانا کھلائے بغیر آنے نہ دیتیں۔

وہاں سے اجازت لے کر میں سیدھا شاہ عالمی پہنچا ... کیونکہ لاہور میں میرے لیے واحد گھرانہ وہی تھا ... یعنی ماموں ماسٹر نذیر احمد آثم صاحب... اور میرے ماموں جان نے بھی یہی ہدایت کی تھی ... لاہور بس وہیں جا کر رہنا۔

اور وہ یہ بات کیوں نہ کہتے ... ماسٹر نذیر احمد آثم ان کے بچپن کے دوست تھے ... پانی پت میں ان کا یارانہ مشہور تھا... پھر گرمیوں کی چھٹیوں میں ان کا ہمارے گھر آنا معمول کی بات تھی ... اب اگر مجھے لاہور جا کر رہنا پڑا تو میں کہاں جاتا۔

ماموں ماسٹر نذیر احمد آثم کے گھرانے نے مجھے خوش آمدید کہا۔ ماموں جان کا خط انہیں مل چکا تھا۔وہ سب مجھے دیکھ کر خوش ہوئے ... ماموں جان نے کہا: '' تمہارا اپنا گھر ہے... جب تک چاہو، رہو۔''

خورشید نے بھی چھوٹتے ہی کہا:

'' اور میں تمہارا انتظار کر رہی تھی ... اب دونوں مل کر بابو جی کا کام کیا کریں گے۔

خورشید اپنے والد کو بابو.جی کہا کرتی تھی ... میں اس کی بات سن کر چونکا:

'' کیسا کام۔''

'' پروف ریڈنگ کا۔''

پروف ریڈنگ کا لفظ اس روز زندگی میں پہلی بار سامنے آیا ...اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ اب اس لفظ سے ساری زندگی واسطہ رہے گا ... میں نے

حیران ہو کر پوچھا: ''پروف ریڈنگ کیا۔''

''تم بھی عجیب ہو خورشید ... ابھی ابھی تو بے چارہ آیا ہے ... اسے سانس تو لینے دو۔'' خورشید کی والدہ نے منہ بنا کر کہا۔

''تو میں نے کب اسے سانس لینے سے روکا ہے۔'' خورشید نے شریر لہجے میں کہا ... میں مسکرا دیا۔

دوسرے دن میں صبح سویرے محمد حنیف بھور سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ ان کے دفتر کے دروازے پر چپراسی تھا... لیکن چونکہ وہ ایک دن پہلے مجھے دیکھ چکا تھا، اس لیے اس نے اندر جانے دیا ... اندر محمد حنیف صاحب ایک سڈول اور صحت مند سے آفیسر سے بات کر رہے تھے ...میں نے سلام کیا تو انہوں نے سلام کا جواب دیا اور اس سڈول سے آدمی سے بولے:

''اس بچے کو مزدوروں میں رکھ لیں ... میٹرک پاس ہے ... کوئی جگہ نکلے گی تو لگا لیں گے ... میرے ایک عزیز اسے لائے تھے۔''

''اوکے سر ... بیٹا تم باہر بیٹھو... میں صاحب سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔''

''جی اچھا۔''

میں باہر بیٹھ گیا ... کوئی ایک گھنٹے بعد وہ باہر آئے... اب میں ان کا نام بھول گیا ... انہوں نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا ... پھر وہ اپنے دفتر میں داخل ہوئے ... وہ محمد حنیف بھور کے نائب تھے ... انہوں نے مجھے اپنے ایک ماتحت کے حوالے کر دیا ... ریلوے لائنوں پر مزدوروں سے کام لینا ان کی ذمے داری تھی .... انہوں نے مجھے اپنے مزدوروں میں شامل کرلیا ۔اب میں صبح آٹھ بجے وہاں آجاتا اور دوپہر دو بجے چھٹی کرکے واپس گھر آتا۔ مزدوروں کی ڈیوٹی ان دنوں لاہور اسٹیشن کے عقب میں تھی ۔ وہاں سے پیدل گھر جاتا اور صبح پیدل وہاں پہنچتا ...شاہ عالمی سے اسٹیشن تک تانگے چلتے تھے ... لیکن ان کے لیے

کرایہ کہاں سے لاتا ... ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ریلوے سے مجھے کیا تنخواہ ملتی ہے۔

پہلے دن ہی شام کے وقت خورشید نے کہا :

'' آؤ ... اب پروف ریڈنگ کر لیں ۔''

'' مجھے معلوم تو ہو ... پروف ریڈنگ کیا ہوتی ہے ۔''

ہاں ہاں ... بتاتی ہوں۔''

ہم چھت پر آکر دری بچھا کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے میرے سامنے کتابت کیے ہوئے کچھ صفحات رکھ دیئے ... اور کہنے لگی :

'' دیکھو ... یہ کتابت ہے ... کوئی کتاب چھاپنی ہو تو پہلے کتابت کی جاتی ہے۔ کتابت کرنے والے کچھ لفظ غلط لکھتے ہیں یا کچھ الفاظ چھوڑ جاتے ہیں لہٰذا کتابت کی غلطیوں کو درست کرنا ہوتا ہے ... اسے پروف ریڈنگ کہتے ہیں۔''

وہ مجھے دیر تک سمجھاتی رہی... آخر دو دن بعد میں پروف ریڈنگ کرنے کے کسی قدر قابل ہو گیا ... اب ہم یوں کرتے ، وہ اصل مسودہ مجھے دے دیتی... میں اس سے دیکھ کر پڑھنا شروع کرتا، وہ کتابت دیکھتی جاتی اور ساتھ ساتھ غلطیاں لگاتی جاتی ... پھر جب مجھے بھی غلطیاں لگانا آگئیں تو ہم باری باری پڑھنے لگے ...

اس پروف ریڈنگ کی اجرت اس وقت ہمیں ایک پیسہ فی صفحہ ملتی تھی ... جو ہم آپس میں تقسیم کر لیتے تھے ... یعنی اگر کل سولہ صفحات پڑھتے تو آٹھ آٹھ پیسے لے لیتے تھے جو کہ دو آنے بنتے تھے ... لیکن اس زمانے میں دو آنے کی مزدوری بھی بہت تھی ...

ادھر ریلوے میں کام کرتے ایک ماہ گزر گیا تو وہاں سے 66روپے تنخواہ ملی ... بہت خوش ہوا... پہلی تنخواہ ملی تھی ... خوش کیوں نہ ہوتا ... میں نے گھر آکر ماموں جان وغیرہ کو بتایا کہ 66روپے تنخواہ ملی ہے ... انہوں نے سر ہلا

دیا... ظاہر ہے ان کے لیے یہ بہت معمولی سی تنخواہ تھی ... لیکن میں کیا کرتا ، کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر تھا۔

بہرحال ملازمت تو تھی جیسی بھی تھی ... لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ فرصت کے لمحات بھی ملنے لگے۔ اب پھر خیال آیا کہ اتنے دن سے کوئی کہانی نہیں لکھی سو کہانیاں لکھنے کا کام پھر سے شروع کر دیا۔ کہانی لکھتا اور کسی رسالے کو بھیج دیتا۔ ان دنوں خورشید ایف اے میں تھی ... وہ افسانے لکھا کرتی تھی۔ کالج کے میگزین میں اس کے چند افسانے شائع ہوئے تھے ... اس نے وہ مجھے بھی دکھائے ... میں نے پڑھے تو پکار اٹھا: ''میں بھی افسانہ لکھوں گا۔''

''تم اور افسانہ لکھو گے ... افسانہ لکھنا بچوں کا کام نہیں ... کہانیاں ہی لکھتے رہو ...'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

میں منہ بنا کر رہ گیا ... لیکن افسانہ لکھنے کا بھوت سوار ہو چکا تھا... لہٰذا گھر کی چھت پر جا کر چوری چھپے افسانہ لکھنے لگا ... افسانہ آدھ گھنٹے میں لکھا گیا ... بہت حیران ہوا ... اس کا نام فریم رکھا۔ اس زمانے میں کراچی سے شمع رسالہ نکلتا تھا ... اس میں افسانے بھی شائع کیے جاتے تھے اور فلمی خبریں بھی ہوتی تھیں ... مطلب یہ کہ ملا جلا سا تھا اور مجھے دو تین بار پڑھنے کا اتفاق ہو چکا تھا ... سو افسانہ اس رسالے کو بھیج دیا۔

اس گھر میں پڑھنے کے لیے بہت کچھ تھا ... خورشید کی پوری بھری ہوئی الماری بھری پڑی تھی ... اس میں سے کتابیں نکال نکال کر پڑھتا رہتا تھا۔ پھر یہ گھرانا اردو ادب کا گھرانہ تھا ... ہر وقت اردو زبان کے چٹخارے ملتے رہتے تھے ... ان حالات میں میں نے افسانہ فریم لکھا ... یہ ایک رومانی افسانہ تھا ... حالانکہ میری عمر رومانی افسانہ لکھنے کی نہیں تھی... میں نے اس افسانے کا کسی سے ذکر نہ کیا ... ذکر کرتا تو خورشید ضرور مذاق اڑاتی ... بلکہ آڑے ہاتھوں لیتی ... اس کے خیال میں تو صرف بچوں کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہی لکھ سکتا تھا۔ شمع رسالے کا پتا اس

سے نوٹ کر کے لفافے پر تحریر کیا، اس میں افسانہ رکھا اور لیٹر بکس میں ڈال دیا ...
اس طرح زندگی کا پہلا افسانہ پوسٹ ہوا۔

اگلے مہینے کے شمارے میں اس کی اشاعت کا کوئی امکان نہیں تھا ، کیونکہ اس وقت تک میں اتنی بات تو سمجھنے لگا تھا کہ کہانی ارسال کرنے کے فوراً بعد ہی وہ شائع نہیں ہو جاتی ... کچھ وقت تو لگتا ہے ... تاہم افسانہ بھیجنے کے ایک ہفتے بعد ہی شمع کراچی کا خط آ گیا... انہوں نے لکھا تھا۔

''آپ کا افسانہ فریم ملا ... بہت جلد شمع کی زینت بنے گا۔''

یہ خط پڑھ کر میں پھول گیا ... سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس قدر جلد جواب دیں گے اور افسانہ قابل اشاعت قرار دیئے جانے کی اطلاع دیں گے ... اب میں نے اس کے شائع ہونے کا انتظار نہیں کیا... فوراً ہی ایک اور افسانہ لکھ مارا ... اس کا نام تھا نئی کار۔

ایک ماہ بعد ہی فریم شائع ہو گیا۔ میں نے فریم خورشید کو دکھایا... وہ لگی مجھے گھورنے ... پھر اس نے افسانہ پڑھ کر دیکھا... اور بس اتنا کہا ۔

''بس اچھا ہے۔''

میں نے ماموں نذیر احمد کو دکھایا ... انہوں نے بھی بس اتنا کہا :

''ٹھیک ہی ہے۔''

انہی دنوں شمع والوں کی طرف سے پھر خط ملا ...انہوں نے لکھا تھا۔
نئی کار قابل اشاعت ہے ... جلد شائع ہو گا ... میں اور زیادہ حیران ہوا ... اب میں نے پہلی بات یہ سوچی کہ بس ... اب میرے افسانے شائع ہونے لگ گئے ہیں ... اب میں بچوں کی کہانیاں نہیں لکھا کروں گا ... افسانہ ہی لکھا کروں گا ... بڑوں کے لیے افسانے۔''

نئی کار بھی دوسرے ہی ماہ شائع ہو گیا ... اس وقت تک میں تیسرا افسانہ بھی لکھ چکا تھا ...اس کا نام تھا گنجی، وہ بھی فوراً چھپ گیا... اب میرے اندر ایک

احساس بیدار ہوا... یہ کہ مجھے اچھے ادبی رسالوں میں بھی افسانے بھیجنے چاہییں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے اس جذبے کے تحت ایک افسانہ لکھا ... اس کا نام مجبور بھائی ، غیور بہن رکھا۔ اب لگا سوچنے ، یہ کس رسالے کو بھیجوں ... شمع میں صرف رومانی افسانے چھپتے تھے جب کہ یہ افسانہ خالص معاشرتی تھا ... ایسے میں سیارہ ڈائجسٹ کا خیال آیا۔ سیارہ ڈائجسٹ انہی دنوں نیا شروع ہوا تھا ... اس سے پہلے اردو ڈائجسٹ کی شہرت تھی... میں نے سوچا نیا رسالہ ہے ... اس میں کوشش کرنی چاہیے ۔ پھر میں نے سیارہ ڈائجسٹ کے ایک دو شمارے کرائے پر لے کر پڑھے بھی تھے... یہ لوگ بار بار اعلان کر رہے تھے :

'' ہم سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی تحریروں کا معاوضہ 5روپے فی صفحہ دیتے ہیں ۔''

سو میں نے سوچا، چلو اس بہانے کچھ پیسے بھی ملیں گے ... یہ بات یوں بھی زندگی میں پہلی بار سامنے آئی تھی کہ لکھنے والوں کو ان کی تحریروں کا معاوضہ بھی مل سکتا ہے ... میں نے اللہ کا نام لے کر افسانہ سیارہ ڈائجسٹ کو پوسٹ کر دیا۔ ایک ماہ کا جان لیوا انتظار کیا ...آخر رسالہ بازار میں آگیا ... ایک بک اسٹال پر گیا ... اسے دیکھا ... اس میں میرا افسانہ نہیں تھا ...پریشانی سی محسوس ہوئی ... ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ سیارہ ڈائجسٹ سے خط موصول ہوا ،لکھا تھا :

'' آپ کا افسانہ مجبور بھائی غیور بہن ملا۔ باری آنے پر چھپ جائے گا ... مزید افسانے بھیجتے رہیں ۔''

اظہر جاوید

مدیر معاون

یہ خط پڑھ کر اطمینان ہوا کہ چلو افسانہ ناقابل اشاعت نہیں ہے ... دیر سے سہی ... چھپ تو جائے گا ... میں نے اظہر جاوید صاحب کی ہدایت پر عمل کیا اور ایک اور افسانہ لکھ کر بھیج دیا۔ اظہر جاوید صاحب نے اس کے ملنے کی اطلاع

بھی دی اور یہ بھی لکھا کہ افسانہ قابل اشاعت ہے ۔

اس کے ایک ماہ بعد جو رسالہ آیا اس میں مجبور بھائی غیور بہن موجود تھا۔ اسے دیکھ کر میں خوشی سے اچھل پڑا ، کیونکہ کسی ادبی پرچے میں افسانہ پہلی بار شائع ہوا تھا... اب جو میں نے افسانہ خورشید اور ماموں جان کو دکھایا تو وہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے ... دونوں نے افسانہ پڑھا... دونوں کا تعلق اردو ادب سے تھا... بلکہ پورا گھرانہ ہی اردو ادب کا گھرانہ تھا ... یہاں تو ہر طرف اردو ادب ہی اردو ادب نظر آتا تھا ... اس مرتبہ انہوں نے یہ کہا :

'' یہ افسانہ واقعی اچھا ہے ۔''

ان کی طرف سے یہ الفاظ سن کر مجھے خوشی ہوئی ... میرے اعتماد میں اضافہ ہوا اور میں نے سیارہ کے لیے تیسرا افسانہ لکھ کر بھیج دیا ... ساتھ ہی سوچا... شمع والوں کو بھی افسانہ بھیجتا رہوں ... سو انہیں بھی ایک دو افسانے لکھ کر بھیج دیئے۔

مجبور بھائی غیور بہن کے بعد سیارہ ڈائجسٹ میں دو اور افسانے شائع ہو گئے... لیکن ان کے اعلان کے مطابق مجھے ان افسانوں کا کوئی معاوضہ نہیں ملا تھا... میں نے سوچا ، چل کر اظہر جاوید صاحب سے ملنا چاہیے ... انہیں بتانا چاہیے کہ معاوضہ نہیں ملا ، کیونکہ تین کہانیوں کا معاوضہ چالیس پچاس روپے تو ملنا ہی تھا ... ان دنوں یہ اتنی چھوٹی رقم نہیں تھی ... مجھے تو ریلوے میں سارا مہینا کام کر کے 66روپے ملتے تھے ان میں سے نصف میں گھر والوں کو منی آرڈر کر دیتا تھا۔

سیارہ ڈائجسٹ کا دفتر بھی نوائے وقت بلڈنگ میں اوپر والی منزل پر تھا۔ میں دفتر میں داخل ہوا تو پہلے ہی کمرے میں لمبی سی ناک والے ایک صاحب بیٹھے کام کرتے نظر آئے ...میں نے ان سے کہا :

'' اظہر جاوید صاحب سے ملنا ہے ۔''

'' جی فرمائیے... میں اظہر جاوید ہوں ۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

'' اوہ ! السلام علیکم ۔''

’’ وعلیکم السلام ! فرمائیے۔‘‘

’’ جی ... میرا نام اشتیاق احمد ہے ... میرے تین افسانے شائع ہو چکے ہیں... یہ ہیں آپ کے ہاتھ کے خطوط ... جو مجھے مل چکے ہیں ۔‘‘

خطوط دیکھتے ہی انہوں نے کہا : ’’ بیٹھیے۔‘‘

وہاں پرانی طرز کی دو کرسیاں موجود تھیں ، میں ایک پر بیٹھ گیا ... انہوں نے کہا : ’’ میں ابھی پتا کرتا ہوں‘‘

جلد ہی انہوں نے مجھ سے کہا :

’’ آپ کی کہانیوں کا معاوضہ آپ کو دو چار دن کے اندر مل جائے گا... آپ بے فکر رہیں اور افسانے ارسال کرتے رہیں ۔‘‘

جی اچھا ۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا ۔

’’ چپراسی کسی کام سے گیا ہوا ہے ... ورنہ میں آپ کو چائے پلا تا۔‘‘

’’ جی کوئی بات نہیں ... شکریہ!‘‘

ان سے ہاتھ ملا کر میں واپس روانہ ہوا ...ان دنوں یہ طویل فاصلے مجھے پیدل ہی طے کرنے پڑتے تھے ... تانگوں کا کرایہ ادا کرنے کی ہمت نہیں تھی ... اور سائیکل میرے پاس تھی نہیں ... نہ ہی مجھے سائیکل چلانی آتی تھی ...آج کل کے بچے اس لیے جلدی سیکھ لیتے ہیں کہ تقریباً ہر گھر میں سائیکلیں یا موٹر سائیکلیں موجود ہیں ... لیکن اس وقت سائیکلیں بھی بہت کم لوگوں کے پاس تھیں ... لہٰذا مجھے سیکھنے کا موقع مل بھی کیسے سکتا تھا ۔

واپس گھر پہنچا اور افسانہ لکھنے لگا ... اب میرا معمول یہ بن گیا کہ روزانہ کوئی نہ کوئی چیز ضرور لکھتا تھا ... کوئی چیز تھوڑی بہت پسند آتی تھی اسے شمع کراچی کو بھیج دیتا تھا ... زیادہ اچھا محسوس ہوا تو سیارہ ڈائجسٹ کو یا اردو ڈائجسٹ کو بھیج دیتا تھا۔

اظہر جاوید صاحب کے وعدے کے مطابق چھ دن بعد ہی ان کا خط ملا

... خط کے ساتھ پچاس روپے کا چیک تھا... میں اس چیک کو دیکھ کر پریشان ہوگیا ... کیونکہ چیک بھی کراس تھا ... اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانا پڑتا تب یہ پیسے مل سکتے تھے ... اور میرا ان دنوں کسی بینک میں اکاؤنٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب میں کیا کرتا ... پچاس روپے اچھی بھلی رقم تھی ... آخر پیدل چل کر پھر نوائے وقت بلڈنگ پہنچا ... اظہر جاوید دفتر میں موجود تھے ... ان سے مصافحہ کیا پھر چیک ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا :

''اظہر جاوید صاحب ! میرا تو بنک میں اکاؤنٹ نہیں ہے ۔''

''اچھا آپ ٹھہریں ۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور دوسرے کمرے میں چلے گئے ... جلد ہی واپس آئے اورانہوں نے تین افسانوں کا معاوضہ میرے ہاتھ میں رکھ دیا ... یہ زندگی میں پہلی بار لکھنے کے سلسلے میں مجھے کچھ معاوضہ ملا تھا ۔ خوشی خوشی گھر آیا۔

اس وقت تک اردو ڈائجسٹ میں بھی کچھ افسانے بھیج چکا تھا ۔ انہیں پہلا افسانہ جھیل میں کنکر بھیجا اور دوسرا تھا آخری تاریخ ... ان کا بھی اعلان تھا ... کہ ہم معاوضہ دیتے ہیں ... لیکن ان کی طرف سے مجھے کوئی معاوضہ نہیں ملا تھا ، آخر اسی طرح میں ان کے دفتر پہنچ گیا ... اردو ڈائجسٹ سمن آباد سے نکلتا تھا ۔ راستہ پوچھتا وہاں پہنچا ... الطاف حسن قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی ... میں نے انہیں بتایا کہ میرے فلاں فلاں اور فلاں تین افسانے ان کے شماروں میں چھپ چکے ہیں ، لیکن مجھے آج تک ان کا معاوضہ نہیں ملا ... انہوں نے بہت خوش اخلاقی سے کہا : ''ابھی پتا کراتا ہوں ...'' یہ کہہ کر انہوں نے گھنٹی بجائی۔

چپراسی اندر داخل ہوا تو انہوں نے کسی کا نام لے کر کہا :

''انہیں بلاؤ ۔''

''جی اچھا۔'' چپراسی چلا گیا تو وہ بولے ۔

''ویسے کیا آپ انگریزی کتابوں سے ترجمہ کر لیتے ہیں ... ہم آپ کو

انگریزی کی کوئی کتاب دے سکتے ہیں ... آپ اس کا ترجمہ کر لائیں ۔''

''جی نہیں... مجھے ترجمہ نہیں آتا ۔''

اتنے میں ایک صاحب اندر داخل ہوئے ... الطاف حسن صاحب نے ان کا نام لیتے ہوئے کہا :

'' ان کی تین کہانیاں شائع ہو چکی ہیں ... ان کا کہنا ہے کہ انہیں ان کا معاوضہ نہیں ملا... آپ چیک کر کے ان کا معاوضہ انھیں دے دیں ۔''

'' بہت بہتر جناب ! انہوں نے کہا، پھر میری طرف مڑے :

'' آیئے میرے ساتھ ۔''

وہ مجھے اندر دفتر میں لے آئے ... رجسٹر کھول کر ان مہینوں میں کہانیوں کو چیک کیا ... پھر مجھ سے مخاطب ہوئے :

''ٹھیک ہے ... آپ کی تین کہانیاں شائع ہوئی ہیں ... آپ فکر نہ کریں... ایک دو دن تک آپ کو معاوضہ جائے گا ... آپ جائیں ۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چلا آیا ... یہ معاوضہ مجھے کبھی نہیں ملا نہ میں پھر کبھی اردو ڈائجسٹ کے دفتر گیا ... میں نے جان لیا تھا کہ سیارہ ڈائجسٹ والے معاملے کے اچھے ہیں ،شمع والے بھی برابر افسانے شائع کر رہے تھے... شمع نے گنجی اور چند افسانے شائع کیے... ان حالات میں میرے دماغ میں یہ بات سمائی کہ بہت لکھ ڈالیں بچوں کی کہانیاں اور بڑوں کے لیے افسانے ... اب مجھے کوئی رومانی ناول لکھنا چاہیے... اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ کیا وقت آنے والا ہے ...شمع اور سیارہ ڈائجسٹ کی طرف سے ملنے والے جوابی خطوط مجھے گویا پھلا رہے تھے ... میں نے اس بات کا ذکر خورشید سے کیا :

'' میں ایک رومانی ناول لکھنا چاہتا ہوں۔''

'' دماغ تو نہیں چل گیا ... کہانیاں اور افسانے لکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم ناول بھی لکھ سکو... بھئی ناول لکھنا اور کام ہے ... افسانے لکھنا اور ... تم

بس بچوں کی کہانیاں اور افسانے ہی لکھتے رہو ۔'' خورشید نے مجھے جھاڑ پلا دی ... میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ۔

''بری بات ہے خورشید! ایسے نہیں کہتے ۔''

'' شکریہ ماموں جان ۔'' میں نے فوراً کہا ۔

'' اب زیادہ چوڑے نہ ہو ۔'' خورشید کی شوخ آواز گونجی ۔

ایسے میں دروازے پر زور دار انداز میں دستک ہوئی ... خورشید نے کہا :

'' دیکھنا اشتیاق ... کون ہے ۔''

باورچی خانے میں کھڑکی تھی ... وہ کھڑکی دروازے کے عین اوپر کھلتی تھی ... میں نے کھڑکی کھولی اور نیچے جھانکا ... نیچے ایک مرد ، ایک عورت اور ایک لڑکی کھڑے نظر آئے ... مرد کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا ۔ میں جلدی سے مڑا اور صحن میں پہنچ کر ان سے گویا ہوا :

'' شاید آپ کے ہاں مہمان آئے ہیں ... نیچے ایک مرد ، ایک عورت اور ایک لڑکی کھڑے ہیں ، مرد نے ایک سوٹ کیس اٹھا رکھا ہے ۔''

'' ارے ۔'' خورشید چونک اٹھی ... اس نے کھڑکی کی طرف دوڑ لگا دی ... جلد ہی اس نے واپس آ کر کہا :

'' ارشاد انکل ... آنٹی اور روبی آئے ہیں ۔''

'' اوہو اچھا ... انہوں نے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی ۔''

ان لوگوں نے نیچے کا رخ کیا ... میں اوپر ہی رہ گیا ... میں نے اس وقت قدرے پریشانی سی محسوس کی کہ یہ کون لوگ آ گئے ۔

☆☆☆☆☆

O

ان تینوں کو اوپر لایا گیا ... اب سب لوگ اندر کمرے میں بیٹھ گئے۔

''بہت دنوں بعد چکر لگایا بھائی صاحب۔'' ماموں نذیر احمد آثم ان سے کہہ رہے تھے۔

''بس بھائی صاحب... کیا بتاؤں... زندگی بہت عجیب ہے ... اس میں فرصت کے لمحات بہت کم ملتے ہیں... میرا کام ہی ایسا ہے کہ کبھی کہیں جانا پڑتا ہے... کبھی کہیں۔ اب بھی روبی کی وجہ سے آنا پڑا ... اسے یہاں کالج میں داخلہ دلوانا ہے ... میٹرک کر چکی ہے ... اور آپ کو تو پتا ہے ... ہمارے شہر میں کوئی ڈھنگ کے اسکول بھی نہیں ... کالج تو کہاں ہوں گے۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہماری بیٹی نے میٹرک کر لیا ہے... اب یہ ہمارے پاس رہے گی۔''

''نہیں بھائی صاحب... ہوسٹل میں رہے گی۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں ... جب اپنا گھر موجود ہے ... تو ہوسٹل میں کیوں ... یہاں سے بسیں چلتی ہیں... وہ سیدھی کالجوں تک جاتی ہیں... طالبات کی الگ بسیں بھی چلتی ہیں...رنگ محل سے۔'' انہوں نے بتایا۔

میں اس وقت تک کئی بار روبی کی طرف دیکھ چکا تھا ... اس میں شک نہیں ، وہ ایک بہت ہی حسین لڑکی تھی ... اس قدر خوبصورت لڑکیاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں ... اس کی بڑی بڑی آنکھیں بھورے رنگ کی تھیں ... چہرہ گول تھا

جب کہ ٹھوڑی میں ہلکا سا گڑھا تھا ... دانت بالکل سفید ... موتیوں جیسے ... اور ناک سیدھی لیکن نوک پر سے قدرے اوپر کو اٹھی ہوئی ... جسم کے اعتبار سے وہ دبلی پتلی سی تھی ... لیکن قد لمبا تھا ... ان تمام خوبیوں سے بڑھ کر اس کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی ... اس مسکراہٹ نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

میں نے یہ بات صاف محسوس کی کہ اس نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا...اس بات نے نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک چبھن سی پیدا کر دی ۔ میرا جی چاہا بے تحاشہ چاہا ...وہ بھی میری طرف دیکھے... اور پھر ایسا ہو گیا ... وہ بہت غور سے اپنے ابواور ماموں نذیر احمد کی باتیں سن رہی تھی ... لیکن ایسے میں اچانک اس نے سر اوپر اٹھایا اور کمرے میں نظر دوڑائی... ایسے میں اس کی نظر مجھ پر بھی پڑی... لیکن ایسا لگا جیسے اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی ہو ۔

اس کے ابو ارشاد احمد نے ماموں نذیر احمد کی کسی بات کا جواب دینے کے لیے سر اٹھایا تو اس وقت انہوں نے مجھے دیکھا ... ساتھ ہی ان کی بیگم نے بھی میری طرف دیکھا اور پھر انہوں نے پوچھ ہی لیا : '' یہ لڑکا کون ہے ۔''

'' یہ اشتیاق احمد ہیں ... میرے بچپن کے دوست محمد رفیع کے بھانجے... محمد رفیع صاحب سے تو آپ کی ملاقات ہوئی تھی نا ۔''

'' ہاں! وہ جو جھنگ میں رہتے ہیں ... ایک بار آپ کے ساتھ میرا جھنگ جانا ہوا تھا ... تب ان سے ملاقات ہوئی تھی ۔''

'' بس وہی ... یہ لاہور میں ملازمت کرتے ہیں... اور دوسری بات بہت اچھی کہانیاں بھی لکھتے ہیں... نام ہے اشتیاق احمد ۔''

'' کہانیاں ۔'' روبی کے لہجے میں میں نے حیرت محسوس کی تو نہ جانے کیوں مجھے خوشی سی ہوئی ۔

'' ہاں روبی ... ان کی بہت سی کہانیاں بچوں کے مختلف رسائل میں

چھپ چکی ہیں ... بلکہ کئی ایک افسانے ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ... اور اب تو یہ ناول لکھنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔''

'' کیا ... ناول !'' روبی کی آنکھوں میں پہلی بار دلچسپی نظر آئی ... مجھے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی ... نہ جانے اس عمر میں ایسا کیوں ہوتا ہے ... میرے لیے یہ بات بالکل نئی تھی ۔

'' ہاں! یہ بہت اچھا لکھ لیتے ہیں ...''

'' پھر تو میں بھی ان کی کہانیاں پڑھوں گی ... مجھے افسانے پڑھنے کا بہت شوق ہے ۔''

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں... میں خاموش بیٹھا رہ گیا۔ ایسے میں خورشید کی آواز نے مجھے چونکا دیا :

'' آؤ... ہم مہمانوں کے لیے کچھ تیار کریں ۔''

یہ بات اس نے مجھ سے دبی آواز میں کہی تھی ...ہم دونوں اٹھ گئے ... دو دن رہ کر روبی کے والد اور والدہ چلے گئے ... تین دن بعد روبی کالج جانے لگی ...پہلے دن جب وہ جانے کے لیے تیار ہو ئی تو ماموں اسکول جا چکے تھے ... خورشید بھی کالج جا چکی تھی ... لہٰذا خورشید کی والدہ نے مجھ سے کہا :

'' اشتیاق میاں ... تم روبی کو بس اسٹاپ تک پہنچا آؤ ... کالج کی بس میں بٹھا کر آ جا نا ... اور ہاں مختار کو گود میں لے جاؤ ... ضد کر رہا ہے ۔''

'' جی اچھا!''

خورشید کا چھوٹا بھائی اس وقت ڈیڑھ سال کا ہو گا ... اور اس سے بڑی بہن خوش طینت تیرہ چودہ سال کی تھی ... وہ اسکول جاتی تھی ، اس کا اسکول وہیں گلی ہی میں تھا۔

میں روبی کے ساتھ گھر سے نکلا ... اس کے ایک ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ اب وہ بھی چپ اور میں بھی چپ ... یوں لگتا تھا جیسے ہم دونوں میں کوئی شناسائی

نہ ہو ... میں چاہتا تھا ... وہ کوئی بات کرے ... لیکن ... اس کے ہونٹ ساکن ہی رہے ... یہاں تک کہ ہم بس اسٹاپ پر پہنچ گئے ... کالج جانے والی بس، اسٹاپ پر موجود تھی... اس نے صرف اتنا کہا :

"شکریہ!" اور بس میں سوار ہو گئی ۔

میں گھر کی طرف مڑ گیا... اب یہ میرا روز کا معمول بن گیا ۔ اسے بس تک پہنچا کر گھر آتا اور ناشتا کرکے دفتر چلا جاتا... اس دوران میں خود کو برابر اس کی طرف کھنچتا محسوس کرتا رہا ... میں نے بہت کوشش کی ... اپنے خیالات کا رخ موڑنے کی بہت کوشش کی ... لیکن خیالات تھے کہ بار بار اس کی طرف رخ کر جاتے تھے ... دوسری طرف روبی صاحبہ کو شاید میرے جذبات ، خیالات اور احساسات کا ذرا بھی علم نہیں تھا ... وہ اپنے آپ میں مگن تھی ۔

اتوار کا دن آیا تو اس نے مجھ سے کہا :

"آج فرصت ہے ... اپنے افسانے دکھائیں ۔"

اس وقت تک جتنے افسانے شائع ہوئے تھے... میں نے سب اس کے سامنے رکھ دیے ... اسی وقت خورشید کی والدہ کی آواز سنائی دی :

"اشتیاق ! ذرا بازار سے یہ چیزیں لا دو ۔"

گھر کا سودا لانا ، مختار عالم کو گود میں لے کر بازار کے کئی چکر لگانا ...یہ سب کام میرے ذمے تھے ... روبی کو صبح بس تک چھوڑنے کے لیے جاتا تھا... واپسی پر وہ خود آجاتی تھی ، کیونکہ واپسی کا وقت بالکل طے شدہ تو تھا نہیں ۔

اس روز گھر کے کئی کام اوپر تلے خورشید کی والدہ نے بتائے... وہ سب کرکے میں بڑی طرح تھک گیا اور چھت پر جا کر لیٹ گیا ... گرمی کا موسم تھا... اور چھت کی ہوا بند کمروں کی نسبت بہت اچھی لگتی تھی ...میں بستر پر لیٹا ہوا تھا ... آنکھیں بند تھیں ... ایسے میں میں نے محسوس کیا ... کہ کوئی دبے پاؤں اوپر آرہا ہے ... مجھے حیرت سی ہوئی ... آنکھیں کھولیں تو روبی چارپائی کے بالکل قریب

کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی ... جونہی اس نے میری آنکھیں کھلتی دیکھیں ... وہ بوکھلا گئی اور فوراً کہنے لگی :

'' آپ کے افسانوں کے بارے میں بتانے آئی تھی ... میں نے سب پڑھ لیے ہیں ... آپ بہت اچھا لکھتے ہیں ۔''

'' شکریہ !'' میں نے فوراً کہا ... نہ جانے کیوں ... مجھے اس وقت ایک انجانی خوشی کا احساس ہو رہا تھا ۔

'' میں نے آپ کے رسالے آتش دان پر رکھ دیئے ہیں ۔''

'' اچھا !''

'' اور بھی کچھ چیزیں شائع ہوئی ہیں آپ کی ۔''

'' جی ... بچوں کی بہت سی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔''

'' کہانیاں نہیں ... افسانے ... ناول ۔''

'' افسانے تو سب آپ کو دکھا دیے ... بہت جلد آپ کو ناول بھی دکھا سکوں گا ۔''

'' مجھے پڑھ کر خوشی ہوگی۔''

اس نے کہا اور نیچے جانے کے لیے مڑ گئی ... میں برابر اس کی طرف دیکھتا رہا ... میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ زینہ اترنے سے پہلے میری طرف دیکھتی ہے یا نہیں ... جونہی اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ... میری طرف مڑ کر دیکھا ... میرا دل زور سے دھڑکا ... اسی وقت اس نے رخ موڑ لیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی ۔

اس وقت تک یہ بات کئی بار ضرور سوچی تھی کہ مجھے ایک رومانی ناول لکھنا چاہیے ... لائبریری سے چند ایک رومانی ناول پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا ، لیکن میرے پاس رومانی ناول لکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا ... کوئی سامان نہیں تھا ... یہ جواز اور سامان مجھے روبی کی شکل میں نظر آ گیا ۔ روبی کے بارے میں خورشید سے

اب تک یہ معلوم ہوا تھا کہ :

'' یہ بڑے خاندان کی بیٹی ہے ... باپ دادا جاگیردار ہیں ... ان کے خاندان میں باہر شادی کرنے کا تصور تک نہیں پایا جاتا ... بلکہ خاندان میں بھی یہ لوگ اپنی حیثیت کے لوگوں ہی میں شادی کرتے ہیں ... مطلب یہ کہ جس قدر دولت مند گھرانہ یہ ہے... اسی قدر دولت مند گھرانے میں روبی کی شادی ہوگی... لہٰذا بدھو میاں ... اس لڑکی کا خیال بھی دل میں نہ لانا ...''

جب سے خورشید نے یہ محسوس کیا تھا کہ میں روبی میں دلچسپی لے رہا ہوں ... وہ مجھے بدھو میاں کہنے لگی تھی ... کبھی کہتی :

'' تم عجیب احمق ہو ... میں نے تم جیسا بدھو آج تک نہیں دیکھا... تم جانتے ہو ... روبی تمہارے اسٹیٹس کی نہیں ... تم اس کے اسٹیٹس کے نہیں ... تم ایک سو روپے ماہوار پانے والے شخص ہو ... ان کی لاکھوں کی جائیداد ہے ... کہنے کا مطلب یہ کہ جس طرح آگ اور پانی کا میل ممکن نہیں ، اسی طرح تمہارا اور اس کا ملاپ ممکن نہیں ... اور یوں بھی ... میں نے روبی کی آنکھوں میں تمہارے لیے کوئی اپنائیت نہیں دیکھی... تم نے سنا ... بدھو میاں... میں کیا کہہ رہی ہوں ..''

'' ہاں خورشید... تم نے بالکل ٹھیک کہا... تمہارے محسوسات غلط نہیں... میں نے خودبھی یہی محسوس کیا ہے... کل تک میں خود بھی یہی سمجھتا تھا ، جانتا تھا اور میں نے پاکستان اور ہندوستان کی بے شمار فلمیں دیکھی ہیں ... ان فلموں میں عام طور پر یہی موضوع ہوتا ہے ... ایک غریب ہیرو اور امیر ہیروئن ... یا ایک دولت مند ہیرو اور غریب ہیروئن ... ان فلموں میں دکھائی جانے والی معاشرتی اقدار ... اونچ نیچ کے جھگڑے ... معاشرے کی نا ہمواریاں ... شاعر کا یہ کہنا کہ '' کہتے ہیں جسے عشق خلل ہے دماغ کا'' وغیرہ ... خورشید میں یہ سب باتیں سمجھتا ہوں... اور تم مطمئن رہو ... روبی میرے ناولوں کا ، میرے افسانوں کا موضوع تو

ہو سکتی ہے ... ان میں سے اکثر کا عنوان تو ہو سکتی ہے... میری زندگی کا مسئلہ نہیں بن سکتی۔''

'' یہ کی ہے تم نے عقل مندی کی بات شاباش... آؤ تمہیں اس خوشی میں چائے بنا کر پلاتی ہوں ... تم جانتے ہی ہو ... میں چائے کتنی مزے کی بناتی ہوں۔''

'' کیا واقعی ... تم آج میرے لیے چائے بناؤ گی ... '' میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

'' حد ہو گئی ... تم تو اس طرح کہہ رہے ہو ... جیسے میں نے آج تک تمہارے لیے کبھی چائے نہ بنائی ہو ... بدھو میاں ... میں تو اب تک تمہارے لیے نہ جانے کتنی مرتبہ ناشتا تیار کر چکی ہوں ... کھانا بنا چکی ہوں... '' اس نے غصیلے انداز میں مجھے گھورا۔

'' مم... وہ ... ہپ۔'' میں بوکھلا گیا۔

'' یہ تم نے کیا کہا ؟''

'' میرا مطلب ہے ... میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

'' تو پھر تم نے روبی کا بھوت سر سے اتار دیا نا ؟'' اس نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

میں نے قدرے حیران ہو کر خورشید کی طرف دیکھا ... اس روز اتفاق ایسا ہوا تھا کہ روبی ابھی کالج سے نہیں آئی تھی ... ماموں نذیر احمد ابھی اسکول سے نہیں آئے تھے۔ خورشید کی والدہ اس کی بہن خوش طینت کے ساتھ مختار عالم کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھیں...اس طرح میں اور خورشید گھر میں بالکل تنہا تھے ... لیکن ایسے مواقع تو گھر میں نہ جانے کتنی مرتبہ پیش آ چکے تھے ... اور میں نے کبھی کوئی بات محسوس نہیں کی... اس روز جب چائے بناتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے حد درجے عجیب سا احساس ہوا ... یہ احساس پہلی بار ہوا تھا ... میرے

ذہن میں ایک خیال گونجا۔

''کیا... کیا خورشید مجھ میں دلچسپی لیتی ہے ...''

نن نہیں نہیں ... یہ کیسے ہوسکتا ہے ... اس نے تو کبھی ایسا کوئی اظہار نہیں کیا ... کوئی اشارہ نہیں دیا ... میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے چہرے کا اس رخ سے جائزہ لیا ... یوں ہم بالکل بچپن میں مدتوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے رہے تھے... کھیلے کودے تھے... ہم نے ایک دوسرے سے خوب خوب شرارتیں کی تھیں ... اس کی شرارتوں کی وجہ سے ماموں جان نے تو مجھے کئی بار مارا پیٹا بھی تھا ... یعنی شرارت وہ کرتی تھی اور نام میرا لے دیتی تھی ... اور جب مجھے مار پڑ رہی ہوتی تو وہ دور کھڑی ہنس رہی ہوتی تھی ... اس قسم کے دن ہم نے بے شمار اکٹھے گزارے تھے ... لیکن ... یہ احساس پہلی بار جاگا تھا ... کیا یہ مجھ میں دلچسپی لیتی ہے... نن نہیں...

میں گھبرا گیا ...' اور کیا وہ اسی لیے میرا ذہن روبی کی طرف سے موڑ دینا چاہتی ہے ... کیا یہ گھبراہٹ محسوس کر رہی ہے کہ کہیں میں روبی میں دلچسپی نہ لینا شروع کر دوں ...اس وقت جونہی میں نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا ... تو وہ کسی صورت بھی روبی سے کم خوب صورت نظر نہ آئی... اس کی شکل صورت میں کوئی کمی نہیں تھی ... بلکہ دیکھا جائے تو خود میں کوئی بہت زیادہ خاص شکل صورت کا مالک نہیں تھا ...اور میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خورشید مجھ میں دلچسپی لے سکتی ہے ...

خود اس کے خیالات بھی بہت اونچے تھے ... جب بھی میری اس سے بات چیت ہوتی تھی ... مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ دولت مندی کی دلدادہ ہے، اس کے تصورات میں رہائش کے لیے ایک بڑی سی خوبصورت سی کوٹھی بسی ہوئی تھی ... جس میں سے روزانہ چمکتی دمکتی کار نکلا کرے اور وہ اس میں اپنے خاوند کے ساتھ باہر جایا کرے ... یہ تھے اس کے تصورات ... اس قسم کے خیالات

کا اظہار وہ ان الفاظ میں کئی بار کر بھی چکی تھی ... یہی وجہ تھی کہ میں نے کبھی اس کی طرف اس نظر سے نہیں دیکھا تھا ... بہرحال اسی وقت اس نے چائے کا کپ میرے ہاتھ میں تھما دیا :

'' لو بدھو میاں !''

'' شکریہ !'' میں مسکرا دیا۔

دوسرے دن جب میں گھر آیا تو خورشید کے ہاتھ میں ایک بلیڈ نظر آیا اور دوسرے ہاتھ میں بجلی کا تار ... وہ بلیڈ سے تار پر لپٹی ربڑ اتارنے جا رہی تھی ... چہرے پر اس قدر غصہ تھا کہ میں بتا نہیں سکتا ... اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے ... بیرونی دروازہ چونکہ اندر سے بند نہیں تھا اور دروازہ آدھا کھلا تھا ، اس لیے میں اندر داخل ہوا تو کوئی آواز نہ ہوئی... سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو یہ خوفناک منظر دیکھا ... میں کانپ گیا ... اور چلا اٹھا :

'' خبردار خورشید ... یہ کیا کرنے جا رہی ہو ۔''

وہ زور سے اچھلی... پھر اسی عالم میں بولی:

'' مجھے نہ روکنا ... میں خودکشی کر رہی ہوں ۔''

'' ارے باپ رے۔''

میں اس کی طرف دوڑ پڑا... اور پھر بلیڈ والا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا... اس کے دوسرے ہاتھ میں بجلی کا تار تھا ... میں نے دوسرے ہاتھ سے تار چھڑا دیا ... اس کے بعد بلیڈ جو چھینا تو وہ میرے بائیں ہاتھ کی درمیان والی انگلی کے پور میں لگا ... اس جگہ سے خون بہنے لگا ... خون بہتے دیکھ کر وہ گھبرا گئی ... چہرے سے غصہ کافور ہو گیا... اس نے فوراً اپنا دوپٹہ پھاڑا اور میری انگلی پر پٹی باندھتے ہوئے کہنے لگی :

''یہ کیا کیا ۔''

'' اور تم کیا کرنے چلی تھیں ... ایسی کیا بات ہوگئی... جو اتنا بڑا قدم

اٹھانے چلی تھیں حرام موت ... توبہ توبہ۔''

''بس ... کوئی ایسی بات ہوگئی تھی۔''

''پھر بھی ... پتا تو چلے۔''

''امی کی کسی بات پر شدید غصہ آ گیا تھا ... وہ تو کہہ کر چلی گئیں ... بس مجھے یہی سوجھی کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں۔''

''توبہ کرو ... توبہ کرو ...''

''اور تم نے اپنی انگلی ... زخمی کر لی۔''

''اس کا ... کیا ہے ... معمولی زخم ہے۔''

اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی ... خورشید نے گھبرا کر کہا :

''امی آ گئیں۔''

یہ کہہ کر وہ فوراً زینے پر چلی گئی ... اس کی امی واقعی آ گئی تھیں ... انہوں نے اوپر آتے ہی میری انگلی کی طرف دیکھا تو پکار اٹھیں :

''یہ کیا ہوا۔''

''کچھ نہ پوچھو امی ... اس بیوقوف کو روک رہی تھی ... بلیڈ سے نہ کھیلو... آخر اپنی انگلی کاٹ کر رہا۔''

''پتا نہیں ... کیا ہے تم لوگوں کو ... '' انہوں نے بُرا سا منہ بنایا اور اندرونی کمرے میں چلی گئیں۔

روبی آئی تو اس نے بھی انگلی کٹنے کی وجہ پوچھی ... خورشید نے اسے بھی یہی بتایا ... میں دل ہی دل میں جلتا رہا... اور اسے دل میں جلی کٹی سناتا رہا... کیا دھرا سب اس کا تھا اور مجھے بے وقوف ثابت کر رہی تھی۔

اس روز سے میں عجیب الجھن کا شکار ہو گیا ... میرے افسانوں کا موضوع یہ الجھن بن گیا ... ایک ہی وقت میں دو لڑکیاں میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں... دونوں ہی میری پہنچ سے دور تھیں... میں ان دونوں کے قابل نہیں

تھا... معمولی آدمی تھا ... معمولی ملازم ... یہ احساس ہر وقت میرے سامنے رہنے لگا ... اور میں سوچنے لگا ... مجھے اپنا کام کرنا ہے ... میں تو ابھی حالات کے منجدھار میں ہوں... زندگی کا راستہ بھی متعین نہیں ہوا ...مجھے ان جھمیلوں سے الگ رہنا چاہیے... میں اپنے آپ میں یہ باتیں سوچتا رہتا ... اور میں نے اپنی ان سوچوں کے مطابق ... لکھنے کے کام پر توجہ شروع کر دی ...

لیکن اب یہ ہونے لگا کہ لکھنے بیٹھتا کچھ اور لکھ جاتا کچھ اور... لیکن جو لکھا جاتا ... وہی پوسٹ کر دیتا ... اس طرح میرے افسانوں میں اب نیا رنگ آنے لگا... میں اپنے افسانے خورشید اور روبی دونوں کو دکھاتا ... دونوں پڑھتیں... اور میں خود کو دو کشتیوں میں سوار محسوس کرتا ... جب کہ میں ان میں سے ایک کشتی کے بھی قابل نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

O

آٹھ ماہ اسی طرح گزر گئے ...

اب میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ مجھے ماموں نذیر احمد آثم صاحب پر بوجھ نہیں بنے رہنا چاہیے ... رہائش کے لیے کوئی جگہ دیکھنی چاہیے ... لیکن رہائش کہاں سے لاتا ... میں سلام کرنے کے لیے محمد حنیف صاحب کے پاس جاتا رہتا تھا ... ایک دن میں نے یہ بات ان سے کہہ دی کہ مجھے کوئی چھوٹی سی یعنی ایک کمرے کے برابر جگہ کسی ماتحت سے دلا دیں ... انہوں نے سر ہلا دیا ... پھر ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلایا ... ان سے کہا :

'' اس بچے کو اپنے کوارٹر ز میں کوئی جگہ رہنے کے لیے دلوا دیں ۔''

'' بہت بہتر سر ۔'' اس نے کہا اور مجھے اپنے ساتھ باہر لے آئے۔

وہ دوپہر کے بعد مجھے ریلوے روڈ کے ریلوے کوارٹرز میں لے گئے... یہ کوارٹر ز اسٹیشن کے سامنے ریلوے روڈ پر واقع ہیں ... وہ خود بھی انہی کوارٹرز میں رہتے تھے ... انہوں نے ایک کوارٹر کے دروازے پر دستک دی ... کوارٹر میں رہنے والا شخص باہر نکلا تو اس نے کہا :

''صاحب نے کہا ہے ... اس لڑکے کو اپنے کوارٹر کی بیٹھک دے دو ۔''

اس نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا... بُرا سا منہ بنایا ، پھر بولا :

'' اچھی بات ہے ...'' پھر مجھ سے مخاطب ہوا:

'' کل اپنا سامان لے آنا... میں یہ بیٹھک خالی کردوں گا ۔''

" شکریہ"

وہ تو فوراً ہی گھر کے اندر چلا گیا ...ادھر ادھیڑ عمر آدمی نے مجھ سے کہا :

" یہ سامنے والا کوارٹر ہمارا ہے ...اب تم ہمارے پڑوسی بن گئے ہو... بے فکر ہو کر جاؤ... اور کل سامان لے آنا۔"

" لیکن ... شاید ان صاحب کو میرا آنا اچھا نہیں لگا۔"

" یہ اکیلا آدمی ہے ... پورا کوارٹر اس کے پاس ہے ... بیٹھک بالکل فالتو ہے ، تمہیں دے دینے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا ... ہو جائے گی اس کی ناگواری بھی ختم ... بہرحال میرا نام فیض ہے ... اس کا نام یاسین ہے ... ٹھیک ہے۔"

" جی بالکل ٹھیک ہے ... " میں نے جواب دیا۔

اس وقت تک مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ فیض صاحب ریلوے میں بطور مستری کام کرتے ہیں۔

اب میں گھر آیا اور ماموں جان کو یہ خبر سنائی:

" میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔"

" کیوں... یہ کیا بات ہوئی۔"

" میرا مطلب ہے ... رہائش کے لیے ایک مفت کی جگہ مل گئی ہے... اب جب کہ لاہور ہی میں رہنا ہے تو مستقل طور پر تو یہاں نہیں رہ سکتا نا۔"

" اچھا ٹھیک ہے ... " ماموں جان اور ممانی جان نے فوراً ہی کہہ دیا... لیکن خورشید کو میرا فیصلہ پسند نہیں آیا ...اس کے چہرے پر اداسی تھی ۔ اس کی چھوٹی بہن خوش طینت بھی اداس ہو گئی تھی ... یہ سب لوگ آخر مجھ سے بہت گھل مل گئے تھے اور پھر بچپن کے دن گرمیوں کی چھٹیوں میں ان کے ساتھ گزرتے رہے تھے ... لیکن مجھے اس وقت یہی اچھا لگا تھا۔خورشید نے اس موقعے پر کہا:

" لیکن تم آتے جاتے تو رہنا۔"

''ہاں کیوں نہیں... کیوں نہیں ،آتا جاتا رہوں گا۔''

دوسرے دن میں صبح ان سے رخصت ہوا... سامان ایک ٹانگے میں رکھ کر ریلوے کوارٹرز پر لے آیا... اس طرح مجھے وہ چھوٹا سا کمرہ مل گیا... اس وقت تک تو کھانا ماموں نذیر احمد آثم صاحب کے گھر کھاتا رہا تھا... اب یہاں آیا تو کھانا بازار سے کھانے لگا...

اس وقت ایک آنے کا حلیم یا چنے اور ایک آنے کی روٹی سے کام چل جاتا تھا... یعنی دو آنے میں ایک وقت کا کھانا کھا لیتا تھا... صبح ناشتے کے لیے چائے خود بنا لیتا، چائے کے ساتھ ایک روٹی لگا لیتا... کھانا میں شاہ عالمی ہی میں کھاتا تھا... وہاں شو مارکیٹ کے باہر ایک حلیم والا بیٹھتا تھا... اس کا حلیم بہت اچھا تھا... بس سیدھا وہاں پہنچ جاتا اور ایک آنے کی ایک روٹی اور ایک آنے کا حلیم لے کر کام چلاتا... ساتھ ہی ماموں نذیر احمد آثم صاحب کے ہاں بھی ہو آتا... خورشید سے ملاقات ہوتی... اس سے لکھنے لکھانے کی باتیں کر لیتا... دوسرے دن پھر روٹی کھانے کے لیے حلیم والے کے پاس پہنچ جاتا... ایک روز گیا تو جیب میں پیسے نہیں تھے... میں نے کھانا کھا لیا، پھر اس سے کہا:

''یہ میرا پین رکھ لیں... چھ آنے کا ہے... کل آپ کو دو آنے دے دوں گا اور پین لے لوں گا...''

وہ کہنے لگا:

''کوئی بات نہیں... پین آپ رکھیں... دو آنے کل دے دیجیے گا۔''

لیکن میں نہ مانا... پین اس کے ہاتھ پر رکھ کر چلا آیا... وہ پین ایگل کا تھا... ان دنوں تو بس وہی پین خرید سکتا تھا۔

وہ حلیم والا مجھے آج تک یاد ہے... کافی مدت بعد کسی کام سے شاہ عالمی جانا ہوا تھا... تو وہ مجھے یاد آگیا... میں نے سوچا، شو مارکیٹ جا کر دیکھتا ہوں، وہ اب بھی بیٹھا ہے یا نہیں... جا کر دیکھا تو وہ اسی طرح حلیم پلیٹوں میں

ڈال ڈال کر لوگوں کو دے رہا تھا ... میں بھی ایک پٹڑی پر بیٹھ گیا ... اور اس سے روٹی اور حلیم لے کر کھایا... وہ مجھے پہچان نہ سکا تھا ... کیونکہ کافی مدت بعد گیا تھا۔

ایک روز مستری فیض صاحب کے بیٹے محمد مشتاق صاحب نے مجھ سے ملاقات کی...وہ بھرے بھرے جسم کے چھوٹے قد کے شخص تھے ... پوچھنے لگے :

"بچوں کو پڑھا لیتے ہیں ۔"

میں نے فوراً کہا :

"جی ہاں!"

"تو پھر میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھا دیا کریں... کھانا آپ کو ہمارے ہاں سے آجایا کرے گا ۔"

"جی اچھا !" میں نے جواب دیا ۔

دوسرے دن سے ان کی دو بہنوں اور ایک بھائی کو پڑھانا شروع کر دیا ... وہ پانچویں چھٹی جماعت کے بچے تھے... میرے لیے انہیں پڑھانا کچھ مشکل کام ثابت نہ ہوا... اب کھانا اور ناشتے کی طرف سے میں بے فکر ہو گیا... ان حالات میں آٹھ ماہ گزر گئے ... پھر ریلوے کی نوکری ختم ہو گئی ...

میں محمد حنیف بھور صاحب سے ملا اور انہیں بتایا کہ اس ملازمت کی مدت پوری ہو گئی ...دراصل مجھے وقتی مزدور کے طور پر رکھا گیا تھا ... اس طرح اور مزدور بھی رکھے جاتے تھے ۔ یہ نہیں کہ انہوں نے خاص طور پر مجھے ہی رکھا تھا ... محمد حنیف بھور صاحب نے بتایا :

"پانچ چھ ماہ تک اور جگہیں نکلیں گی ، میں تمہیں وہاں لگوا دوں گا ... فی الحال ریلوے کوارٹر والے کمرے میں رہتے رہو ... میں مستری فیض سے کہہ دوں گا۔"

"جی اچھا۔"

اب ریلوے کی ملازمت چھوٹ گئی ... البتہ رہائش اور کھانے کی طرف سے بے فکر ہو گیا، کیونکہ محمد مشتاق صاحب کے بھائی اور بہنوں کو پڑھا جو رہا تھا ... ملازمت چھوٹنے کے بارے میں میں نے ان سے کہا :

'' مہربانی فرما کر مجھے کہیں ملازمت دلوا دیں ۔''

انہوں نے چھوٹتے ہی کہا :

'' اکاؤنٹ جانتے ہیں ۔''

'' جی اکاؤنٹ ... نہیں تو ۔''

''خیر! میں آپ کو اکاؤنٹ کا کام سکھا دیتا ہوں ... میں کوئلے اور لکڑی کی ایک آڑھت پر کام کرتا ہوں ... آپ کو بھی کسی آڑھت پر ملازم رکھوا دوں گا ... لیکن پہلے آپ اکاؤنٹ کا کام سکھ لیں ۔''

'' جی اچھا ۔'' میں نے جواب دیا۔

انہوں نے مجھے اکاؤنٹ سکھانا شروع کیا ... پندرہ بیس دن میں میں اس کام کے قابل ہو گیا ... وہ مجھے اپنے ساتھ بادامی باغ لے گئے ... وہاں لکڑی اور کوئلے کی بہت سی آڑھتیں تھیں... یعنی وہاں دوسرے شہروں سے لکڑی اور کوئلے کے ٹرک آتے تھے ... آڑھتی لوگ وہ مال اپنی آڑھت پر رکھ لیتے تھے ...شہر کے لوگ ان سے لکڑی کوئلہ خریدتے تھے ...

محمد مشتاق صاحب مجھے ایک آڑھتی کے پاس لے گئے۔ ان کا نام محمد حسین تھا ... انہوں نے کسی ملازم کے لیے محمد مشتاق سے کہہ رکھا تھا... لہٰذا انہوں نے فوراً ہی رکھ لیا اور تنخواہ ایک سو روپے ماہوار طے کر دی ... اب میں صبح سے شام تک آڑھت پر اکاؤنٹ کا کام کرتا ... شام کو واپس آتا تو ان کے بھائی بہنوں کو پڑھاتا ... اس طرح شاہ عالمی جانے کا وقت بہت کم ملتا ۔

دو سال تک میں یہ کام کرتا رہا ... پھر محمد حسین سے ان بن ہو گئی اور انہوں نے مجھے ملازمت سے فارغ کر دیا ... میں گھر آ گیا ... اور کیا کرتا ... ایک

سو روپے ماہوار کا سلسلہ بھی رک گیا۔

اس وقت میرا معمول یہ رہا تھا کہ ہر ماہ دو دن کے لیے جھنگ چلا جاتا تھا... ماں باپ بہن بھائیوں کے ساتھ یہ دن گزارتا اور پھر لاہور آجاتا۔ میں نے گھر والوں کو یہ نہ بتایا کہ ملازمت چھوٹ گئی ہے ... وہ پریشان ہو جاتے۔بس ملازمت کی کوشش کرتا رہا ... اخبارات میں ملازمتوں کے اشتہارات شائع ہوتے تھے... صبح سویرے کسی سے اخبار لے کر وہ اشتہارات دیکھتا... ان کے پتے نوٹ کرتا اور درخواست دے دیتا ... بہت سے محکموں میں انٹرویو دیے...انٹرویو میں ہمیشہ اچھے نمبر لئے ... لیکن ملازمت کے لیے تو صرف سفارش یا رشوت کی ضرورت تھی ... اچھے نمبروں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا ... ان حالات میں پیسے بالکل ختم ہونے کے قریب تھے ...کسی سے مانگنے کی عادت بالکل نہیں تھی ... بہت شرم محسوس کرتا تھا ... اب بھی یہی عادت ہے ... کسی سے مانگتے ہوئے بہت گھبراتا ہوں۔"

اب سوال یہ تھا کہ کیا کروں ... سر پکڑ ے بیٹھا تھا کہ اچانک ایک بات سوجھی۔

پان منڈی پہنچا ... ریڈ لیمپ سگریٹ کا ایک ڈبا خریدا... سوچا یہ تھا کہ سگریٹ بیچتے ہیں ... کچھ لوگوں کو سگریٹ کے خوانچے لیے پھرتے دیکھا تھا ... میں نے سوچا اس طرح کچھ تو منافع ہو گا۔

سگریٹ کا ڈبا تو خرید لیا ... لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ سگریٹ کی ڈبیوں کو کس چیز پر رکھوں ... میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پر سگریٹ کی ڈبیاں رکھتا ... پریشانی کے عالم میں اپنے چھوٹے سے کمرے کو دیکھ رہا تھا کہ دیوار سے لٹکے فریم پر نظر پڑی ... اس میں میں نے اپنی میٹرک کی سند فریم کرا رکھی تھی ... اور تو کچھ نہ سوجھی ، اسے دیوار سے اتار لیا ... یہ ایک چھوٹی سی ٹرے تو تھی ہی ... بس ریڈ لیمپ سگریٹ کے پیکٹ اس پر رکھنے لگا... جب تمام پیکٹ رکھ دیے تو

بیچنے نکل کھڑا ہوا ... گرمی اور دھوپ میں فریم اٹھائے دال گراں سے گزرا ... برانڈرتھ روڈ سے ہوتا شاہ عالمی آ گیا ... وہاں سے انارکلی کا رخ کیا ... انارکلی سے نکل کر بائیں طرف مال روڈ پر چلنے لگا ... اب تک کسی نے ایک سگریٹ بھی نہیں خریدا تھا ... شدید تھکن محسوس ہوئی تو گھاس کے قطعے پر بیٹھ گیا ... مال روڈ پر بائیں طرف گھاس لگی ہوئی تھی ... وہاں صرف بے فکرے اور فارغ لوگ بیٹھ جاتے تھے ... میں بھی گھاس پر بیٹھ گیا ... ٹرے بھی گھاس پر رکھ دی ... پینٹ بوشرٹ میں ملبوس چند نوجوان پاس ہی بیٹھے تھے ... ان کی نظر سگریٹ کے پیکٹوں پر پڑی ... ساتھ ہی انہوں نے دیکھا ... پیکٹ ایک فریم پر رکھے ہیں... غالباً انہیں حیرت سی ہوئی... ایک نے نزدیک آ کر پیکٹوں کو ہلایا تو نیچے میٹرک کی سند نظر آئی :

"ارے ... یہ دیکھو ... یہ کیا ۔" اس کے منہ سے آواز نکلی ۔

دوسرے بھی فریم کی طرف متوجہ ہو گئے... انہوں نے حیران ہو کر پیکٹ ہٹا دیے اور سند کو پڑھنے لگے :

"حیرت ہے ... آپ میٹرک پاس ہیں... فسٹ ڈویژن لی ہے آپ نے اور بیچ رہے ہیں سگریٹ ۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ... اب ان سے کیا کہتا ... سگریٹ فریم پر رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا ... وہاں سے واپس چل پڑا... کافی دیر بعد ایک آواز نے قدم روک لیے :

"اے لڑکے ادھر آ ۔"

ایک شخص مجھے بلا رہا تھا ... میری آنکھوں میں امید کی کرن چمکی ... اس کے نزدیک چلا گیا ... اس نے سگریٹ کے پیکٹوں پر نظر ڈالی ... ایک پیکٹ اٹھایا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر دو پیسے فریم پر ڈال دیے ... میں آگے بڑھ گیا... تقریباً تین گھنٹے پھرنے کے بعد دو پیسے کا ایک گاہک ملا تھا ... آنکھیں

آنسوؤں سے بھر گئیں ... ان آنسوؤں کی وجہ سے فریم دھندلا نظر آنے لگا ... سڑک بھی دھندلا گئی...راہ گیر بھی دھندلا گئے ... میں نے ضبط سے کام لیا ، آنکھیں صاف کیں اور آگے بڑھ گیا۔ گرمی کے دن کا سورج سر پر اور میرے سامنے مسئلہ تھا سگریٹ فروخت کر کے چند آنے کمانے کا۔

سوچا تھا کہ اگر یہ کام بن گیا تو روزانہ سگریٹ بیچ لیا کروں گا... لیکن شاید میں اس کام کے لیے نہیں تھا ... اس لیے سگریٹ نہ بیچ سکا ... تھک تھکا کر فریم اٹھائے ایک سگریٹ فروش کے پاس آیا ... میں نے اس سے کہا :

'' بھائی! یہ سگریٹ مجھ سے خرید لو۔''

اس نے پہلے تو میری طرف دیکھا ... پھر فریم پر رکھے پیکٹوں پر نظر ڈالی... سمجھ گیا کہ میں کیا کرتا رہا ہوں... اس نے پیکٹ اٹھا کر گنے اور پھر پیسے مجھے دے دیے... وہ کوئی نیک شخص تھا ... اس نے کوئی بات نہیں کی...بس خاموشی سے قیمت دے دی ، میں فریم اور پیسے لے کر ریلوے روڈ کی طرف چلا... ایسے میں خیال آیا کہ شاید اس نے بھول میں کچھ پیسے زائد دے دیئے ہیں ... میں نے گنے تو واقعی زیادہ تھے... اگر چہ میں اس وقت شدید مشکل میں تھا ... پیسوں کی بہت ضرورت تھی ، نصف دن کے قریب دھکے کھاتے گزر گیا تھا ... ایک لمحے کے لیے بھی میں نے یہ نہیں سوچا کہ چلو ...زاید پیسے آگئے تو کیا ہوا ... میں فوراً واپس مڑا ... اور دکاندار سے کہنے لگا:

'' آپ نے کچھ پیسے زائد دے دیے ہیں ۔''

'' اوہو اچھا !'' وہ چونکا ... اس نے سارے پیسے مجھ سے لے کر گنے اور زائد پیسے اپنے پاس رکھ کر باقی مجھے دے دیئے ... ساتھ ہی اس نے کہا :

''شکریہ ! تم اچھے لڑکے ہو ۔''

میں آگے بڑھ گیا ... بہرحال یہ تجربہ فیل ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

O

چند دن انتہائی بے چارگی کے عالم میں گزر گئے ... دنیا اندھیر نظر آنے لگی... بار بار آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے...ان دنوں میں نماز پابندی سے نہیں پڑھتا تھا ... کبھی پڑھ لیتا تھا تو کبھی چھوڑ دیتا تھا ... اب جب اس پریشانی نے آگھیر لیا تو اللہ تعالیٰ یاد آئے۔

نماز پڑھ کر خوب دعا کی ... اور اس کے صرف تین دن بعد میں بلا مقصد چلا جارہا تھا کہ راستے میں ہائی اسکول کے زمانے کا دوست آصف محمود مل گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر اچھل پڑا...نہایت گرم جوشی سے ملا ... میں نے چھوٹتے ہی اس سے کہا : '' تم لاہور میں کہاں... تم تو گوجرانوالہ میں نہیں تھے ؟''

'' ہاں! اب لاہور آ گیا ہوں... مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ لینا ہے ۔''

'' اوہ اچھا ؟'' میرے منہ سے نکلا ۔

'' اورتم ... تم یہاں کہاں ۔''

'' میری داستان تو ذرا طویل ہے۔'' میں غمگین انداز میں مسکرایا ۔

'' آؤ ... کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں ۔''

'' وہ مجھے چائے کی ایک دکان پر لے آیا ۔ اس نے دو چائے کا آرڈر دیا اور کہنے لگا:

'' ہاں تو وہ داستانِ غم کیا ہے ۔''

'' میں نے میٹرک کے بعد لاہور آنے اور پھر عارضی ملازمتوں کی کہانی

سنا ڈالی...اس نے چھوٹتے ہی کہا :

'' فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ... ملازمت کا بندوبست ہو جائے گا اگر اللہ نے چاہا ۔''

'' وہ کیسے ؟'' میں نے خوش ہو کر کہا ۔

'' بس ... ہو جائے گا ۔''

'' آخر کیسے ... پتا بھی تو چلے ۔''

'' میں بتاتا ہوں... ان دنوں لاہور میونسپل کارپوریشن میں جو ہیلتھ آفیسر لگے ہوئے ہیں ... وہ میرے بہنوئی کے گہرے دوست ہیں... ان کے پاس چلیں گے... وہ کہیں نہ کہیں لگا لیں گے ۔''

'' لیکن یار ... وہ تمہارے بہنوئی کے دوست ہیں ... تمہارے تو نہیں ۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا ۔

'' وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں... میں اپنے بہنوئی کا حوالہ دے دوں گا ۔''

'' لیکن یہ تو جھوٹ ہو گا ۔''

'' اوہو بھئی ! میں میاں صاحب کو بتا دوں گا کہ اپنے دوست کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا ۔''

آصف کے بہنوئی کا نام میاں احسان الحق بختیار تھا ۔ اسکول کے زمانے میں ایک بار آصف کے ساتھ گوجرانوالہ جانے کا اتفاق ہوا تھا ... میاں صاحب اور آصف کی بہن باجی رضیہ بہت محبت سے پیش آئے تھے ... میاں صاحب گوجرانوالہ شہر کے بہت مشہور وکیل تھے ... لاہور میونسپل کارپوریشن کے ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر محمد عبدالحکیم کھوکھر صاحب ان کے گہرے دوست تھے ... اس طرح آصف محمود کے ساتھ دوسرے دن صبح میونسپل کارپوریشن کے دفتر ٹاؤن ہال میں پہنچ گیا ... ہیلتھ آفیسر کے دفتر کے باہر پندرہ بیس آدمی ملاقات کے لیے

کھڑے تھے۔ آصف نے کوئی چٹ اندر نہیں بھجوائی، وہ سیدھا اندر چلا گیا۔ میں باہر کھڑا رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد آصف باہر آیا ، اس نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا ... میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوا تو سامنے والی کرسی پر بڑی میز کے پیچھے ایک سڈول سے گورے رنگ کے ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے تھے ... میز کے سامنے آٹھ دس کرسیاں بچھی تھیں... ان کرسیوں پر بھی کچھ لوگ بیٹھے تھے ... دو تین کرسیاں خالی بھی تھیں ... میں نے السلام علیکم کہا اور آصف کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب ان لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے ... آخر انہوں نے باری باری ان سب کو فارغ کر دیا ... پھر آصف کی طرف مڑے :

'' ہاں آصف میاں ... کیسے آئے۔''

'' یہ میرے اسکول کے زمانے کے دوست اشتیاق احمد... ان دنوں بیکار ہیں... میاں صاحب نے انہیں آپ کے پاس لے جانے کے لیے کہا تھا ... سو میں لے آیا ... میٹرک پاس ہیں۔''

'' اوہ اچھا ۔ میٹرک کون سی ڈویژن میں کی ہے انہوں نے۔''

'' جی فسٹ دویژن ... سائنس کے ساتھ ۔''

'' اچھی بات ہے ... لاہور میں بی پی فیکٹری ہے ... میں اس کے منیجر سے بات کرتا ہوں ، کیونکہ فی الحال میرے دفتر میں کوئی جگہ ہے نہیں ان کے لیے... ہاں جونہی جگہ نکلی میں خود انہیں لگا لوں گا ۔''

'' جی اچھا ۔'' آصف نے فوراً کہا ۔

انہوں نے بی پی فیکٹری کے منیجر کو فون کیا ... میرا نام بتا کر کہنے لگے ... انہیں اپنی فیکٹری میں کوئی ملازمت دے دیں ... دوسری طرف کی بات سن کر انہوں نے فون بند کردیا اور کہنے لگے :

'' آپ صبح بی پی کی فیکٹری چلے جائیں... میں اپنا کارڈ دے دیتا

ہوں... وہاں کے منیجر سے مل لیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کارڈ مجھے دے دیا۔

''جی اچھا... بہت بہت شکریہ۔''

ہم ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئے... اس وقت میں نے آصف سے پوچھا:

''یار... یہ بی پی فیکٹری کہاں ہے۔''

''فیروز پور روڈ مسلم ٹاؤن کے پاس ہے۔''

''اوہ! تب تو وہ بہت دور ہے۔'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔

''ہاں بھئی... بس پر بیٹھ کر چلے جانا۔''

''اچھی بات ہے۔''

آصف نے کچھ پیسے میری جیب میں ڈال دیے، میں نہیں نہیں کرتا رہ گیا۔ اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے... دوسرے دن صبح سویرے اٹھا... نہا دھو کر بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ آخر بس میں بیٹھ کر بی پی فیکٹری جا پہنچا۔ منیجر صاحب کے بارے میں پوچھا... ایک ملازم نے اشارے سے بتایا کہ وہاں بیٹھتے ہیں... میں ان کے سامنے حاضر ہوا... ڈاکٹر صاحب کا کارڈ ان کے سامنے رکھا... انہوں نے فوراً کہا:

''ہاں! ڈاکٹر صاحب نے فون کیا تھا... تم اپنی ملازمت پکی سمجھو... صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک ڈیوٹی دینا ہو گی، اسی روپے ماہوار تنخواہ ملے گی۔''

''جی... جی اچھا!'' میں نے کہا۔

اسی روپے کا سن کر میں پریشان ہو گیا تھا... کیونکہ جس بس میں بیٹھ کر یہاں تک آیا تھا، اس نے آٹھ آنے کرایہ لیا تھا۔ آٹھ آنے واپسی پر بھی دینے تھے... اس طرح ایک روپے روز جب کرایہ ادا کرنا پڑتا تو پچاس روپے بچتے... بس اس بات نے مجھے پریشان کر دیا... ایسے میں منیجر صاحب نے پوچھا:

''اور ہاں! تم آئے کیسے؟''

’’ جی ! بس میں بیٹھ کر ۔‘‘

’’ تو تمہارے پاس سائیکل نہیں ہے ۔‘‘ انہوں نے پوچھا ۔

’’ جی نہیں ۔‘‘

’’ لیکن یہاں آنے کے لیے سائیکل ضروری ہے ... بس تو لیٹ کر دیتی ہے... اور ہمارے ہاں صبح سویرے پہنچنا ضروری ہے ... کیونکہ آخر یہ ڈبل روٹی کی فیکٹری ہے ۔‘‘

’’ جی اچھا ... میں سائیکل کا انتظام کرلوں گا ۔‘‘

’’ ہوں... تب تو ٹھیک ہے ۔‘‘ انہوں نے مطمئن ہو کر کہا ۔

منیجر نے مجھے اپنے ایک ماتحت کے حوالے کر دیا ... میں شام تک اس کے پاس رہا... فیکٹری میں جو کرنا تھا ، وہ سمجھتا رہا ... شام کو واپس لوٹا ۔ سائیکل کے مسئلے نے پریشان کر رکھا تھا ... میں سیدھا آصف کے گھر گیا ... وہ اپنی والدہ کے ساتھ دھرم پورہ میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا ... اس نے مجھے پریشان دیکھا تو مسکرایا : ’’کیا ہوا ؟‘‘

’’ تنخواہ اسی روپے ملے گی ... وہاں آنے جانے کے لیے سائیکل ضروری ہے ... منیجر صاحب کہتے ہیں بس لیٹ کر دیتی ہے ... اب اگر میں کرائے کی سائیکل لوں... تو کم از کم تیس روپے ماہوار کرایہ دینا ہوگا ... سائیکل نہ لوں ... بسوں میں سفر کروں تو بھی تیس روپے ماہوار خرچ ہوگا... اس طرح صرف پچاس روپے ہی بچا کریں گے ... یہ ہے مسئلہ ۔‘‘

آصف نے ساری بات سن کر کہا :

’’ خیر کوئی بات نہیں ... صبح پھر کھوکھر صاحب کے پاس چلے چلتے ہیں ۔‘‘

’’ لیکن مجھے تو صبح فیکٹری جانا ہے ۔‘‘

’’ بھئی فیکٹری کی ملازمت کا کیا فائدہ ... پچاس روپے ماہوار ملیں گے ۔ میں میاں صاحب سے رقعہ لکھوا لاتا ہوں، کھوکھر صاحب ضرور کچھ کریں گے ۔‘‘

بے چارہ آصف اسی روز گوجرانوالہ گیا اور رقعہ لکھوا لایا ... دوسرے دن ہم پھر ڈاکٹر عبدالحکیم کھوکھر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آصف نے انہیں بتایا:

'' انکل ... فیکٹری ملازمت صرف اسّی روپے ماہوار کی ہے ... اس میں سے 30روپے بس کے کرائے کے نکل جائیں گے ... میاں صاحب نے آپ کے نام یہ رقعہ بھیجا ہے۔''

''آصف ! رقعے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ...انہوں نے رقعہ پڑھ کر کہا، پھر چند لمحے کے لیے سوچ کر کہنے لگے :

'' اتنے روپے کی ملازمت تو یہاں بھی ہو سکتی ہے ، فی الحال یہیں رکھوا دیتا ہوں ... جب کوئی اچھی جگہ نکلی ... وہاں سیٹ کر دوں گا ... میرے پاس اس وقت چند بیلداروں کی جگہ خالی ہے ... وہاں بیلدار رکھوا دیتا ہوں ۔''

بیلدار کا لفظ پہلی بار سنا تھا ۔ بہت حیران ہوا اور پوچھے بغیر رہ نہ سکا :

'' جناب! یہ بیل دار کیا ہوتے ہیں ۔''

'' بیلدار مزدور ہوتے ہیں... لیکن آپ کو مزدور والا کام نہیں کرنا پڑے گا... دفتر میں بیٹھ کر کام کریں گے ۔''

'' تب تو ٹھیک ہے ... '' میں نے خوش ہو کر کہا ۔

خوش ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں بسوں کے کرائے یا سائیکل کے کرائے کا مسئلہ نہیں تھا... ٹاؤن ہال ، مال روڈ پر واقع ہے اور یہاں سے اسٹیشن والا گھر زیادہ دور نہیں تھا ۔

ادھر کھوکھر صاحب نے گھنٹی بجائی... چپراسی اندر داخل ہوا تو انہوں نے کہا: '' عطا محمد صاحب کو بلائیں ۔''

'' بہت بہتر جناب!'' چپراسی یہ کہہ کر باہر نکل گیا ۔

جلد ہی ایک موٹے سے صاحب اندر داخل ہوئے۔

انہوں نے کھوکھر صاحب کو سلام کیا ،تو کھوکھر صاحب نے کہا :

'' عطا محمد صاحب ... یہ بچہ میٹرک پاس ہے ... بیلداروں میں رکھ لیں... لیکن بٹھا لیں اپنے پاس دفتر میں ... کلرکوں والے کام لیتے رہیں ۔''

'' بہتر سر۔'' عطا محمد نے فوراً کہا ... پھر مجھ سے بولے :

''آؤ میاں ۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل آئے... میں اور آصف بھی ان کے پیچھے باہر آ گئے۔ آصف تو مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوا اور عطا محمد صاحب مجھے اوپر والی منزل پر لے آئے ... ان کا دفتر یہاں تھا ... اپنی کرسی پر بیٹھ کر بولے :

''تمہیں بیلدار رکھ لیتے ہیں ... کل سے صبح آجایا کرو۔''

'' جی اچھا !''

اب انہوں نے مجھ سے درخواست لکھوائی اور میز کی دراز میں رکھ لی... دو تین دن تک میں ان کے پاس دفتر میں بیٹھتا رہا ... انہوں نے مجھے کوئی کام نہ دیا... پھر کہنے لگے :

'' میرے پاس تو کلرکوں والا یہاں کوئی کام ہے نہیں... تم بیلداروں کے ساتھ چلے جایا کرو۔''

یہ سن کر میں بہت گھبرایا ... میں نے کہا :

''لیکن جناب ! کھوکھر صاحب...''

'' ہاں ہاں ! انہوں نے کہا تھا ... لیکن دفتر کی صورت میں سمجھتا ہوں ... تمہیں کچھ معلوم نہیں ... شکر کرو نوکری مل گئی ... بیلداروں کی جگہ کے لیے بھی لوگ دھکے کھاتے ہیں ... تم صبح سے بیلداروں کے ساتھ جاؤ ۔''

دوسرے دن مجھے بیلداروں کے ساتھ بھیج دیا گیا ... ان دنوں بیلداروں سے دیواروں پر لگائے گئے اشتہارات اتروائے جاتے تھے ... مجھے بھی دیواروں کے ساتھ سیڑھی لگا کر اشتہارات اتارنے پڑے۔

بیلدار عام طور پر ان پڑھ لوگوں کو رکھ جاتا تھا ... اب مجھے یہ احساس

بھی تھا کہ مجھے بھی ان پڑھوں کی ڈیوٹی دے دی گئی ہے ... چند دن تک دھوپ اور گرمی میں اشتہارات اتارتا رہا ... پھر گھبرا کر کھوکھر صاحب کے دفتر چلا گیا ... انہوں نے دیکھا تو پوچھا:

'' آؤ اشتیاق ! کیسے آئے۔''

'' سر ... آپ نے عطا محمد صاحب کو ہدایت کی تھی کہ وہ مجھے دفتر میں بٹھا لیں۔''

'' ہاں ہاں ... میں نے ان سے کہہ دیا تھا ... کیوں کیا بات ہے۔'' وہ ہمدردانہ انداز میں بولے ... آخر میں ان کے قریبی دوست کی طرف سے ان تک پہنچا تھا۔

'' وہ مجھ سے بیلداروں کا کام لے رہے ہیں ... صبح سے شام تک دیواروں پر سے اشتہارات اتارنے پڑتے ہیں ۔''

'' اچھا میں ان سے کہہ دیتا ہوں ... تم کل سے بیلداروں کے ساتھ نہ جانا ... اگر وہ بھیجیں تو میرے پاس آجانا ۔''

'' جی اچھا ! بہت بہت شکریہ ۔''

میں انہیں سلام کرکے چلا آیا ... نہ جانے کھوکھر صاحب نے عطا محمد صاحب سے کیا کہا ... وہ مجھ سے ناراض ہو گئے ... تاہم اس دن کے بعد انہوں نے مجھے بیلداروں کے ساتھ نہیں بھیجا ... دفتر میں بٹھا لیا ... اب وہ مجھے طرح طرح سے تنگ کرنے لگے ... میں صبر کے گھونٹ بھرتا رہا ۔آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ میں نے کب اس قسم کے کام کیے تھے ...

میٹرک سے پہلے تک تو والد صاحب کا کام بہت اچھا چل رہا تھا ... اچانک کاروبار تباہ ہوا تھا ... نازونعم میں پلا بڑھا تھا ... ایک دن طبیعت گھبرائی تو سوچا دو دن کے لیے جھنگ ہو آتا ہوں ... ماں باپ بہن بھائی سب بڑی طرح یاد آرہے تھے ... چنانچہ دو دن کی درخواست لکھ کر کھوکھر صاحب کے کمرے میں

چلا گیا ...وہ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے :

''اشتیاق ! نائب داروغہ کی ایک جگہ خالی ہوئی ہے ... کہو تو تمہیں وہاں لگا دیا جائے ۔''

'' جی ضرور لگا دیں ۔'' میں نے خوش ہو کر کہا ۔

'' اچھا درخواست لکھ دو ... اور یہ کیا ہے ... اچھا ... چھٹی کی درخواست ہے ... خیر ... دو دن کی چھٹی بھی منظور ، نائب داروغہ کے لیے درخواست بھی لکھ کر مجھے دے جاؤ اور چلے جاؤ۔''

میں بہت خوش ہوا ... اس وقت تک میں جان چکا تھا کہ نائب داروغہ بیلداروں سے کام لیتا ہے ۔ سوچا، چلو اب بیلداروں سے کام لیا کروں گا ... پوسٹر اتارنے کا خطرہ تو ختم ہوا ... اور کچھ تنخواہ بھی بڑھ جائے گی ... چنانچہ درخواست لکھ کر چلا گیا ... واپس آیا تو پتا چلا، نائب داروغہ بن چکا ہوں۔

نائب داروغہ کی ڈیوٹی سنبھالی تو سوچا ، کیوں نہ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر آؤں ... ورنہ وہ کیا سوچیں گے کہ کیسا آدمی ہے ... اتنا بھی نہیں کیا کہ شکریہ ہی ادا کر دیتا ۔ مجھے ان کا گھر معلوم تھا ... دو تین بار کسی کام سے وہاں جا چکا تھا۔ وہ سنت نگر میں ہوتا سنگھ روڈ پر رہتے تھے ... ان کے دروازے پر پہنچا ۔ گھنٹی بجائی تو ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکا باہر آیا ... میں نے اسے اپنا نام بتایا اور کہا :

'' ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے ۔''

اس نے اندر جا کر میرا نام بتایا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے اندر بلوا لیا۔ اندر پہنچا ... ڈاکٹر صاحب اس وقت اپنے بچوں کو پڑھا رہے تھے ...ان میں وہ لڑکا بھی تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا :

'' آؤ اشتیاق! کیسے آئے ۔''

'' جی آپ کا شکریہ ادا کرنے ...آپ نے مجھ پر اتنی مہربانی کی ہے۔''

'' ارے نہیں... اس کی ضرورت نہیں... کہو ... نئ جگہ پسند آئی۔''

'' جی ہاں! اچھی ہے ۔''

وہ مسکرا دیئے ... ادھر میں سوچنے لگا، اب کیا کہوں ... شکریہ ادا کرنے کے لیے آیا تھا ... وہ تو ادا کر چکا تھا ... کہنے کے لیے اب میرے پاس کچھ نہیں تھا ... سوچا اجازت لیتا ہوں ... لیکن پھر اچانک اللہ تعالیٰ نے میرے منہ سے یہ الفاظ نکلوا دیے :

'' سر! آپ خود بچوں کو پڑھاتے ہیں ... آپ نے ان کے لیے کوئی استاد نہیں رکھا ۔''

'' استاد تو ایک رکھا تھا ... لیکن اس بے چارے کو ٹی بی ہو گئی ہے ، ٹی بی کے مریض سے بچوں کو نہیں پڑھوایا جا سکتا ، اب کسی دوسرے استاد کی تلاش میں ہوں۔''

'' سر ... مجھے بھی پڑھانے کا تجربہ ہے ۔'' میں بے ساختہ کہہ اٹھا۔

'' اچھا ... وہ کیسے ؟'' ان کے لہجے میں حیرت تھی ۔

'' اول تو میں اسکول میں گروپ مانیٹر رہا ہوں ... دوسرے بیکاری کے دنوں میں بچوں کو پڑھاتا رہا ہوں۔ آپ مجھے ایک موقع دے کر دیکھیں۔'' میں نے دبی آواز میں کہا ۔

'' اچھا تو اشتیاق ! کل سے آجانا ۔'' انہوں نے کہا ۔

میں بہت خوش ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحکیم کھوکھر صاحب پورے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے انچارج تھے ۔ ان کے گھر میں میرا روز کا آنا جانا ہوجاتا تو میرے لیے بہت آسانیاں پیدا ہونے کا امکان تھا۔

☆☆☆☆☆

O

دوسرے دن شام پانچ بجے میں پڑھانے کے لیے پہنچ گیا ... میں نے دستک دی تو ان کا وہی بیٹا دروازہ کھولنے کے لیے آیا۔ وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گیا ... اوپر والی منزل پر ان کے کمرے کے ساتھ ہی دوسرا کمرہ تھا، درمیان میں دروازہ کھلتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر بچوں سے تعارف کرایا۔

ڈاکٹر صاحب کے چھ بچے تھے ... ان میں بڑے صاحب زادے اور صاحب زادی تو کالج میں زیر تعلیم تھے ... باقی چار ...عبدالحفیظ ،عبدالسعید، طلعت جبیں اور عبدالجلیل اسکولوں میں پڑھ رہے تھے، چنانچہ ان چاروں کو پڑھانے کی ذمے داری مجھے سونپی گئی ... یہ چاروں پانچویں جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے طالب علم تھے۔

ڈاکٹر صاحب ان سے تعارف کرانے اور ان کی کتابیں دکھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور میں نے پڑھانا شروع کیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب ساتھ والے کمرے میں دروازہ ذرا سا کھول کر مجھے پڑھاتے ہوئے بغور سن رہے ہیں، میں تقریباً دو گھنٹے بعد فارغ ہوا ...کرسی سے اٹھا اور بچوں سے اجازت لے رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور کھوکھر صاحب اندر آگئے... وہ بہت خوش نظر آرہے تھے... میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہنے لگے:

''بہت خوب! آپ تو بہت ماہر ہیں پڑھانے میں ... اب آپ ان کے

ماسٹر پکے ہیں ،کل سے باقاعدہ آیا کریں ۔''

'' جی بہت بہتر !'' میں بھی خوش ہوگیا۔

اس طرح مجھ پر کسی حد تک بے فکری کے دن آئے۔ بے روز گاری کی پریشانی دور ہوئی۔ تنخواہ اگرچہ نائب داروغہ کی بھی زیادہ نہیں تھی، لیکن اب پریشانی نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بہت مہربان انسان ثابت ہوئے۔ ان کی بیگم بھی میرا بہت خیال رکھنے لگیں۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا :

'' ماسٹر صاحب! اب آپ دروازے کی گھنٹی نہ بجایا کریں ... ایسے ہی اندر آجایا کریں ۔''

وہ چائے بسکٹ وغیرہ بھی مجھے بھجواتی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب بھی اب مجھے ماسٹر صاحب کہنے لگے تھے ... پہلے اشتیاق کہہ کر بلاتے تھے ... لیکن جب سے ان کے بچوں کو پڑھانا شروع کیا ، اس کے بعد انہوں نے پھر مجھے نام سے نہ پکارا... ہمیشہ ماسٹر صاحب ہی کہا ، پھر تو اس پورے گھرانے کے لیے میں ماسٹر صاحب بن گیا ... سب مجھے ماسٹر صاحب کہنے لگے ... ہر روز کا آنا جانا جو ہوگیا تھا ... مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میں بھی اس گھر کا ایک فرد ہوں۔

اب پھر لکھنا شروع کر دیا ۔ انہی دنوں کراچی سے ایک رسالہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کا نام ماہنامہ افسانہ تھا ...میں نے ایک اسٹال سے اٹھا کر اسے دیکھا ... اس میں صرف افسانے تھے۔ افسانوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک افسانہ الاؤ لکھا ااور انہیں بھیج دیا ... دو ماہ بعد ہی افسانہ شائع ہوگیا۔ اب میرے پاس افسانہ ارسال کرنے کے لیے تین چار رسالے ہو گئے ... کبھی کسی رسالے میں افسانے لکھ دیتا تو کبھی کسی میں ... خورشید اور ماموں نذیر احمد آثم صاحب کو تو افسانے دکھانے کا معمول تھا ہی ... اب سوچا، کھوکھر صاحب کو بھی کوئی افسانہ پڑھوانا چاہیے۔ میں نے سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا ایک افسانہ انہیں دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب قدرے ادبی ذوق رکھتے تھے ...افسانہ پڑھ کر بہت خوش

ہوئے ... کہنے لگے :

'' ماسٹر صاحب! آپ تو چھپے رستم ہیں ۔''

میں شرما گیا ۔ اب یہ میرا معمول بن گیا ... شائع ہونے والا ہرافسانہ انہیں دکھاتااور وہ اسے پڑھتے ۔ خورشید اور ماموں نذیر احمد صاحب کو بھی دکھاتا تھا ... وہ بھی خوشی ظاہر کرتے ۔

ان دنوں جن ادبی رسالوں میں افسانے شائع ہوئے تھے ۔ ان کے نام یہ ہیں ، افسانہ ، تخلیق ، بیسویں صدی ، اردو ڈائجسٹ ، سیارہ ڈائجسٹ ، حور ، ادبی دنیا ، فنون روزنامہ امروز کے ادبی ایڈیشن میں بھی افسانے شائع ہوئے ۔

''تخلیق'' اظہر جاوید صاحب نے شروع کیا تھا۔ انہوں نے سیارہ ڈائجسٹ کو چھوڑ دیا تھا اور اپنا ادبی پرچہ شروع کر لیا تھا ...اظہر جاوید تو مجھے پہلے ہی جانتے تھے، لہٰذا افسانوں کا مطالبہ کرنے لگے ... اب میں نے شمع کو افسانے بھیجنا بند کر دیئے... کیونکہ اس کا مقام ادب کی دنیا میں نہیں تھا ... بس ان ادبی پرچوں کو افسانے بھیجتا رہا اور الحمدللہ وہ شائع ہوتے چلے گئے ۔

ڈاکٹرعبدالحکیم کھوکھر صاحب ان افسانوں کی وجہ سے اب مجھ سے بہت زیادہ متاثر ہو چکے تھے ۔ ایک دن انہوں نے کہا :

'' اشتیاق سینٹری انسپکٹر کا کورس کر لو ... تمہیں سینٹری انسپکٹر لگا دیں گے ۔''

'' جی بہتر ! کر لوں گا یہ کورس بھی ۔''

'' اچھی بات ہے ... اب جب اس کلاس کے داخلے شروع ہوں گے تو داخلہ دلوا دوں گا ... اس طرح تم سینٹری انسپکٹر لگ جاؤ گے ۔''

'' جی بہت بہتر !'' میں خوش ہو گیا ۔

چند ماہ بعد ہی سینٹری انسپکٹر کلاس کے داخلے کا اشتہار شائع ہو گیا ۔ کھوکھر صاحب نے مجھ سے درخواست لکھوائی اور اس طرح ان کے ذریعے مجھے اس کلاس میں داخلہ مل گیا۔

سینٹری انسپکٹر کلاس برڈ ووڈ روڈ پر واقع ہائی جین اینڈ فزیالوجی کالج میں ہوتی تھی ... اب وہاں جانے کا مسئلہ پیدا ہوا ... ابھی تک تو سائیکل کے بغیر کام چل رہا تھا ... ایک پرانی سائیکل خرید ی ... سائیکل تو خرید لی ... لیکن میں تو سائیکل چلانا جانتا ہی نہیں تھا۔ اس زمانے میں سائیکل بھی بہت کم لوگوں کے پاس ہوتی تھی ... میں صبح سویرے سائیکل چلانے کی مشق کرتا ... ایک پڑوسی لڑکا میری سکھانے کے سلسلے میں مدد کرتا تھا ... چھوٹا قد ہونے کی وجہ سے میں سائیکل جلد نہ سیکھ سکا ... کئی بار گرا، ٹخنو ں وغیرہ پر چوٹیں لگیں ... لیکن آخرکار گرتے پڑتے سائیکل چلانا سیکھ ہی گیا ... اب سینٹری انسپکٹر کلاس میں جانا آسان ہوگیا۔

ان دنوں میں لوہاری میں رہتا تھا ... ریلوے ملازمت چھوٹنے کے بعد مشتا ق صاحب نے لکڑی اور کوئلے کی آڑھت پر رکھوا دیا تھا ... لیکن وہاں بھی میں دو سال گزار سکا تھا... اس کے بعد ریلوے کے کوارٹر میں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا اور یوں بھی اب میں میونسپل کارپوریشن میں ملازم ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ چھوٹا سا کمرہ چھوڑ کر لوہاری میں کرائے کی ایک جگہ میں رہنے لگا تھا... اس طرح ریلوے کوارٹرز چھوٹ گئے ... ان کوارٹروں میں رہنے والوں سے جو محبت اور ہمدردی ملی تھی... آج بھی یاد ہے ...

وہاں ایک خاتون تھیں... انہیں جب پتا چلا کہ مشتاق احمد صاحب کے بھائی بہنوں کو ایک نوجوان پڑھاتا ہے تو میرے پاس آئی تھیں۔کہنے لگی :

"میرے بچوں کو بھی پڑھا دیا کریں ..."

"میں انکار نہ کر سکا ... وہ خاتون اس قدر محبت والی ثابت ہوئیں کہ کیا بتاؤں... لیکن بہر حال کوارٹرز کی رہائش مجھے اپنی نئی ملازمت کے بعد چھوڑنا ہی پڑی ... اور کر بھی کیا سکتا تھا ... یہ لوگ اب بھی یاد آ جاتے ہیں۔

اب جب کہ میں سینٹری انسپکٹر کورس کر رہا تھا اور اس سلسلے میں دفتر سے مجھے چھٹی دے دی گئی تھی ... تو فرصت مجھے خوب میسر آ گئی تھی ... دوپہر سے پہلے

انسٹی ٹیوٹ آف ہائی جین سے آجاتا ... اور افسانہ شروع کر دیتا ... شام کو کھوکھر صاحب کے ہاں پڑھانے چلا جاتا ... فرصت کے ان دنوں میں یہ بات سوجھی :

'' بہت افسانے لکھ لیے ... کیوں نہ اب ایک ناول لکھا جائے۔''

اس عمر میں یوں بھی ہر نوجوان پر رومانی خیالات سوار رہتے ہیں، میں بھی ان خیالات سے فارغ نہیں تھا ... یہ مجھ پر بھی سوار رہتے تھے ... رومانی ناول کا خیال آنے پر میں شاہ عالمی گیا ... لوہاری سے شاہ عالمی زیادہ دور نہیں ، پھر اگر گلیوں کے اندر سے نکل جائیں تو اور بھی نزدیک ہو جاتا ہے ... سو میں گلیوں میں سے نکل کر شاہ عالمی چلا جاتا تھا ... ویسے بھی اس طرف کو جانا ہی پڑتا تھا ... دوپہر کا کھانا اسی حلیم والے سے کھا لیتا تھا ... کھانے کا معمول اب بھی وہی تھا ... ایک آنے کی روٹی ایک آنے کا حلیم ... یا ایک آنے کے چنے یا ایک آنے کی روٹی۔

ماموں نذیر احمد کے ہاں پہنچا تو وہ موجود نہیں تھے ... خورشید اپنی والدہ، بہن اور بھائی اور روبی کے ساتھ موجود تھی :

'' سنو... میں نے ناول لکھنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے ... اس سلسلے میں مجھے مشورہ دو ۔''

وہ چھوٹتے ہی بولی :

'' میرا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ پاگل نہ بنو ۔''

'' اور تمہارا دوسرا مشورہ کیا ہے ۔'' میں نے جل کر کہا۔

'' دوسرا مشورہ یہ ہے کہ اس بھوت کو سر سے اتار دو۔'' وہ ہنسی ۔

'' مطلب یہ کہ تم سے کسی کام کے مشورے کی کوئی امید نہیں ،خیر میں روبی سے مشورہ کر لیتا ہوں۔''

'' کہہ جو دیا ... ناول لکھنا تمہارے بس کا روگ نہیں... منہ دھو رکھو ... بیچاری روبی اس معاملے میں کیا مشورہ دے گی ۔''

''لیکن میں تو نہا دھو کر آیا ہوں۔'' میں نے اور زیادہ بھنا کر کہا۔

''یہ تو حال ہے... محاورے کی زبان سمجھتے نہیں ... چلے ہیں ناول لکھنے۔''

''ہاں چلا ہوں ... تم دیکھ لینا ... میں ناول لکھ لوں گا ان شاء اللہ!''

''جب لکھ لو ... تو مجھے بتانا ... پھر شاباش دے دوں گی۔'' وہ شوخی پر اتر آئی تھی... روبی بھی ہنس رہی تھی ... مجھے غصہ آیا اور میں وہاں سے چلا آیا ... گھر میں آتے ہی ناول شروع کر دیا ...

ناول پر کام تقریباً ایک ماہ جاری رہا اور آخر تقریباً تین سو صفحات کا ناول تیار ہو گیا ... میں نے اس کا نام ''منزل انہیں ملی'' رکھا۔

اب جونہی ناول تیار ہوا ،میں مسودہ دکھانے ماسٹر نذیر احمد صاحب کے گھر پہنچ گیا ... وہ گھر میں موجود تھے ... میں نے انہیں سلام کیا اور بتایا :

''ماموں جان ! میں نے ایک ناول لکھا ہے۔''

''جو ایک دم فضول ہوگا۔'' خورشید پاس چلی آئی... روبی اس روز جانے کہاں تھی۔

''بُری بات خورشید۔'' انہوں نے اسے گھورا... وہ مسکرا دی اور بول اٹھی:

''جی اچھا۔''

''ٹھیک ہے اشتیاق ! میں اسے دیکھوں گا ... خورشید تم بھی پڑھ کر دیکھنا ... یہ بیچارہ لکھنے کے میدان میں اتنی کوشش کر رہا ہے ... ہمیں اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔''

''جی اچھا ! اب کردوں گی۔'' اس کا انداز اب بھی مذاق اڑانے والا تھا۔

میں نے پروا نہ کی... اور مسودہ وہیں چھوڑ کر چلا آیا ... اس دوران میری نظریں روبی کی تلاش میں بھٹکتی رہی تھیں... چند دن بعد گیا۔

''مسودہ میں نے دیکھا ہے ... اچھا ہے ... اب تم کیا کہتے ہو۔''

ماموں جان مجھے دیکھ کر بولے۔

''میں چاہتا ہوں... آپ اس کے سلسلے میں کسی پبلشر سے بات کریں ... تاکہ وہ اس مسودے کو پڑھ کر دیکھ لیں... اور پسند آجائے تو شائع کر دیں۔''

''دیکھو اشتیاق! میری جن پبلشر صاحب سے علیک سلیک ہے ... وہ صرف درسی کتب چھاپتے ہیں ۔ یہ ناول وغیرہ ان کی لائن نہیں ہے ... ویسے میں تمہیں ایک دوست کے پاس بھیجتا ہوں... اس کے کچھ پبلشروں سے تعلقات ہیں ...وہ شاید کچھ کر سکے۔''

''ٹھیک ہے ۔آپ اپنے دوست کے نام رقعہ لکھ دیں ... میں مسودہ لے کر ان کے پاس چلا جاتا ہوں ۔''

انہوں نے رقعہ لکھ دیا ... اپنے دوست کا پتا بھی لکھ دیا۔ میں نے جا کر ملاقات کی ...مسودے کے بارے میں بتایا ... اس کے چہرے پر کوئی دلچسپی کے آثار نظر نہ آئے... مجھے یوں لگا جیسے ماموں نے مجھے کسی غلط آدمی کے پاس بھیج دیا ہے ... میں اٹھا اور مسودہ اٹھا کر باہر آ گیا ...

دوسرے دن ماموں نذیر احمد نے پوچھا : '' ہاں! کیا بنا ؟''

'' وہ کوئی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں ۔''

'' چھوڑو... دفع کرو... اللہ تعالیٰ کوئی اور سبب بنا دیں گے ۔''

میں نے مایوسانہ انداز میں مسودہ الماری میں رکھ دیا ... خورشید کو پتا چلا تو لگی چھیڑنے ...روبی کی آنکھوں میں البتہ ہمدردی تھی ... میں نے سر کو جھٹک دیا ... اور کرتا بھی کیا۔

O

ان دنوں میں پھر ناولوں پر ناول پڑھ رہا تھا... لوہاری گیٹ کے ساتھ موری گیٹ کے اندر ایک آنہ لائبریری نظر آ گئی تھی ... اس میں ابن صفی کے ناول بھی تھے ۔ میں نے دکاندار سے ابن صفی کا نیا ناول مانگا ... اس نے فوراً دے دیا، میں نے اپنا نام پتا لکھوایا ، دس روپے بطور ضمانت بھی رکھوا دیئے اور ناول لے لیا... ناول پڑھا۔ دوسرے دن ایک اور لے آیا ... اس طرح میں نے ایک ایک کرکے ابن صفی کے سب ناول پڑھ ڈالے ... پھر دکاندار سے کہنے لگا :

''اب پھر پہلے ناول سے دینا شروع کر دیں ۔''

دکان دار ہنس پڑا ... میں پھر سے ناول پڑھنے لگا۔ اس دوران ابن صفی کا نیا ناول آتا تو وہ بھی پڑھ لیتا ۔ ایک دن دکان دار کہنے لگا :

''آپ صرف ابن صفی کے ناول کیوں پڑھتے ہیں ... میرا مطلب ہے کہ جاسوسی ناول لکھنے والے اور لوگ بھی ہیں ... مثلاً اکرم الہ آبادی ... اظہار اثر ... اور انگریزی ناولوں کے ترجمے بھی کیے گئے ہیں ... ان میں بھی مشہور لکھنے والے ہیں ... مثلاً اگاتھا کرسٹی، ارل سٹینلے گارڈنر ، السٹیئر میکلین وغیرہ ... پھر تاریخی ناولوں میں نسیم حجازی اور صادق حسین صدیقی کے ناول ہیں ...''

دکاندار کی بات سن کر مَیں نے کہا :

''ٹھیک ہے ... اکرم الہ آبادی اور اظہار اثر کے ناول پڑھ لیتا ہوں۔''

میں نے ان رائٹروں کے ناول شروع کیے... ان دونوں کے ناول اچھے

تھے، لیکن ابن صفی کے پائے کے نہیں ... لیکن مجبوری کی حالت میں یہ ناول بھی پڑھ ڈالے ، کیونکہ ابن صفی کے پڑھے ہوئے ناولوں سے یہ نہ پڑھے ہوئے بہتر تھے... ان دونوں مصنفوں کے ناول ختم ہوگئے تو اگاتھا کرسٹی کے ناولوں کے ترجے شروع کر ڈالے... اگاتھا کرسٹی کے ناول طویل تھے ... ہر ناول تین سو سے چار سو صفحات کا تھا ... یہ ناول کافی خشک انداز کے تھے ... ان میں بہت آہستہ انداز میں سراغ رسانی تھی ... لیکن پھر بھی میں نے یہ ناول پڑھ ڈالے ... ارل سٹینلے گارڈنر کو بھی پڑھا ... پھر نسیم حجازی کے ناول پڑھے ... اس طرح میں نے اس شخص کی گویا پوری لائبریری چاٹ ماری ... ایک دن وہ کہنے لگا:

'' دل محمد روڈ پر ایک بہت بڑی لائبریری ہے ... اس کے پاس میری نسبت کئی گنا زیادہ کتابیں ہیں ...آپ کو وہاں سے ایسے بہت سے ناول مل جائیں گے جو آپ اب تک نہیں پڑھ سکے۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ... اور سیدھا دل محمد روڈ پہنچا... جلد ہی اس لائبریری تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ... میں نے وہاں بطور ضمانت پچاس روپے جمع کروائے اور ناول شروع کر دیئے ...یہاں واقعی موری گیٹ والی لائبریری کی نسبت زیادہ کتب تھیں... اب میں اس لائبریری پر شروع ہو گیا ... دھڑا دھڑ کتب پڑھنے لگا... اس لائبریری والے نے دو تین فہرستیں بنائی ہوئی تھیں... لیکن ان کی کوئی ترتیب بھی نہیں تھی ... یعنی حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں تھیں... اس طرح کتاب تلاش کرنے میں بہت دیر لگتی تھی۔ ایک دن تنگ آ کر میں نے اس سے کہا :

'' آپ پسند کریں تو میں آپ کی لائبریری کی فہرست نئے سرے سے ترتیب دے دوں ... اس طرح کتاب تلاش کرنے میں آسانی ہو جائے گی ۔''

'' اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے ۔''

میں اس کی فہرستیں گھر لے گیا اور کئی دن لگا کر ایک مکمل فہرست تیار

کر دی۔ فہرست تیار ہوگئی تو اس کے پاس لے گیا ... اس نے فہرست کو دیکھا تو بہت خوش ہوا... اس دن کے بعد میری اس سے بہت اچھی علیک سلیک ہوگئی ... وہ میرا بہت لحاظ کرنے لگا ... ابن صفی، اکرم الہ آبادی یا اظہار اثر میں جس کا بھی نیا ناول آتا تو وہ پہلے مجھے دیتا۔

اس طرح میں نے اس لائبریری کو بھی چاٹنا شروع کیا ... دوسری طرف ناول'' منزل انہیں ملی'' کا ابھی تک کچھ نہیں بنا تھا ... سیارہ ڈائجسٹ وغیرہ کو البتہ افسانے بھیجتا رہتا تھا...

ایسے میں، میں نے سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر کو ایک خط لکھا ... اپنا تعارف کرایا ... اپنی کہانیوں اور افسانوں کے بارے میں بتایا اور یہ لکھا کہ اس وقت تک سو کے قریب کہانیاں اور افسانے شائع ہو چکے ہیں ... لہٰذا اگر آپ کے ادارے میں کسی پروف ریڈر کی ضرورت ہو تو میری خدمات حاضر ہیں ... مجھے پروف ریڈنگ کا تجربہ ہے... درسی کتب کی پروف ریڈنگ کرتا رہا ہوں۔''

اس خط کے جواب میں سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر مقبول جہانگیر کا خط مجھے ملا تھا ... انہوں نے لکھا تھا:

'' دفتر آ کر مجھ سے مل لیں۔''

میں ان سے ملا ... تو انہوں نے سیارہ ڈائجسٹ کا کتابت شدہ ایک صفحہ مجھے دیا اور کہنے لگے:

'' یہ پروف ریڈنگ کر کے دکھائیں۔''

میں نے اس صفحے کی پروف ریڈنگ کر کے انہیں دکھا یا ... انہوں نے دیکھا تو سر ہلا دیا:

'' ٹھیک ہے ... آپ روزانہ دو گھنٹے کے لیے آجایا کریں ... کمپوز شدہ جتنے صفحات آپ کر سکیں ... ان کی پروف ریڈنگ کر دیا کریں اور میرے نائب ... ابو ضیا اقبال کو دے دیا کریں ... ہم آپ کو ایک سو روپے ماہوار دیا کریں گے۔''

'' جی بہت اچھا! میں کل سے آجاؤں گا۔'' میں نے خوش ہو کر کہا... کیونکہ اب تک میونسپل کارپوریشن سے بھی تنخواہ 97روپے ملتی تھی ... جب کہ سیارہ والے صرف دو گھنٹے میں ایک سو روپے دیتے ... خوش نہ ہوتا تو کیا کرتا۔

اس طرح میں نے سیارہ ڈائجسٹ میں پروف ریڈنگ کا کام شروع کیا...

اس دوران ابو ضیا اقبال کو تین چار افسانے وہی دن وغیرہ لکھ کر دیے تھے۔

ابوضیااقبال صاحب کو وہ افسانے پسند آئے اور انہوں نے فوراً شامل اشاعت کر دیے ... ان سے اب اچھی علیک سلیک ہو گئی ... اب میرے معمولات کچھ اس طرح تھے، صبح میونسپل کارپوریشن کی ڈیوٹی دیتا...اس وقت تک سینٹری انسپکٹر کلاس پوری ہو چکی تھی ... میں اس کا امتحان دے چکا تھا، اس لیے پھر سے ڈیوٹی شروع ہو گئی تھی ... وہاں سے سیدھا سیارہ ڈائجسٹ جاتا۔ دو گھنٹے وہاں کام کر کے بازار سے کھانا کھاتا ... اسٹیٹ بنک کے پاس ایک چھولوں والا بیٹھتا تھا۔ اس کے چھولے بہت اچھے تھے... بس وہیں سے چنوں سے روٹی کھا لیتا تھا۔ گھر آکر کچھ لکھنے بیٹھ جاتا اور شام کو کھوکھر صاحب کے ہاں چلا جاتا ... اس طرح تمام دن کام کرتے گزر جاتا۔

انہی دنوں میں ایک دن خورشید کے گھر گیا تو روبی نظر نہ آئی ... میں نے خورشید سے پوچھا:

'' آج روبی صاحبہ نظر نہیں آرہیں۔''

'' اب وہ تمہیں نظر آئے گی بھی نہیں ... اس کے والد کو سرکاری طور پر ملک سے باہر بھیج دیا گیا ہے ... وہ اپنی فیملی سمیت جا چکے ہیں ... بجر بٹو!''

میں حیرت زدہ رہ گیا ... روبی اس طرح اس گھر سے رخصت ہو جائے گی ... میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا ... لیکن یہ زندگی ہے ... اس میں نہ جانے کیا کچھ پیش آتا ہے ... سو یہ بھی ہوا ...

'' کیا سوچنے لگے؟''

کک ... کچھ نہیں۔''

''میں نے کہا تھا نا ... اونچی ہواؤں میں نہ اڑا کرو۔'' وہ بولی۔

''ایسی کوئی بات نہیں خورشید ... کوئی انسان کسی کے ساتھ رہتا ہے ... اٹھتا بیٹھتا ہے تو کسی حد تک اس سے انس ہوجاتا ہے ... ہم ایک جانور کو پالتے ہیں تو اس سے انس بھی ہوجاتا ہے ... روبی تو پھر ایک انسان تھی۔''

''ٹھیک کہتے ہو ... اب روبی ووبی کی باتیں ختم ... مجھ سے میری باتیں کرو۔''

''اوہ اچھا۔'' میں ہنس دیا۔

اس طرح روبی جس طرح آئی تھی ... اسی طرح اس گھر سے رخصت ہوگئی۔

O

انہی دنوں زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔

والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے جھنگ پہنچا تو والدہ نے مجھے سینے سے لگا لیا ... کہنے لگیں :

'' اب تو تم اچھے ملازم ہوگئے ہو ... تنخواہ بھی پہلے سے بہتر ہوگئی ہے ... لہٰذا ہم سوچ رہے ہیں ، اب تمہاری شادی کر دیں ۔''

'' جی... میری شادی۔'' میں دھک سے رہ گیا ... اس پہلو پر زندگی کے جھمیلوں نے سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی ... اب والدہ نے بات کی تو خیال آیا... پھر میں فوراً ہی سنبھل گیا:

'' لیکن ماں! پہلے میں اپنی بہن کی شادی کروں گا ... بہن مجھ سے تین سال چھوٹی ضرور ہے لیکن پہلے ہم اس فرض سے سبکدوش ہو نا پسند کریں گے۔''

'' تم نے یہ کہہ کر میرا جی خوش کر دیا ... میں یہی سننا چاہتی تھی ... تمہارے پھوپھا بھی جلد شادی کر دینا چاہتے ہیں ... لہٰذا اگر تم کوشش کرو ... تو نسیم کی شادی تو ہم چھ ماہ میں ہی کر دیں گے ... اس کے بعد تمہاری باری آئے گی ... تم اگر ہمیں اشارۃً بتا دو کہ میں تمہارا رشتہ لے کر کہاں جاؤں ... تو ہم وہیں کوشش کریں گے ... ورنہ میری نظر میں دو تین لڑکیاں ہیں ... کہو تو تمہیں بتادوں ۔''

'' جی ابھی نہیں... پہلے ہم نسیم کی شادی کریں گے ۔''

'' چلو ٹھیک ہے ... ہم اپنے طور پر تیاری شروع کر دیتے ہیں... تمہارے پھوپھا سے بھی کہہ دیتے ہیں ... اور تم سے جو ہو سکے ... کر گزرو۔''

'' آپ فکر نہ کریں۔''

اس طرح ہم سب نے تیاری شروع کر دی ... اس زمانے میں شادی بیاہ اتنے مشکل نہیں تھے جس قدر آج ہو گئے ہیں ... نہ اس قدر تیاریوں کی ضرورت ہوتی تھی نہ سج دھج کی ... سادگی سے زیادہ تر شادیاں ہوتی تھیں ... نسیم کا رشتہ پھوپھی زاد سے طے ہوا تھا ... سو چھ ماہ بعد ہم نے یہ شادی کر دی ... اس کے چند دن بعد جب میں نے جھنگ کا چکر لگایا تو والدہ پھر مجھے پکڑ کر بیٹھ گئیں ... کہنے لگیں :

'' دیکھو بیٹا ... تمہیں پتا ہے نا ... میں اب بیمار رہنے لگی ہوں ... تمہارے ابا جان نے ایک ڈاکٹر سے چیک کرایا تھا ... ان کا کہنا ہے کہ مجھے ٹی بی ہو گئی ہے۔''

'' کیا ... نہیں۔'' میں دھک سے رہ گیا۔

'' ہاں بیٹا ... لیکن اس میں فکر کی کیا بات ہے ... میں جتنی زندگی لے کر آئی ہوں ... وہی یہاں جیوں گی نا ... اس سے زیادہ تو جینے سے رہی... لہٰذا تم میری فکر چھوڑو اور اپنی شادی کی بات کرو۔''

ٹی بی کی بات پہلی بار سامنے آئی تھی ...ان حالات میں تو والدہ کو بہت زیادہ آرام کی ضرورت تھی ... اور یہ آرام انہیں اسی صورت مل سکتا تھا جب گھر میں کوئی کام کرنے والا ہوتا ... کام کرنے والا اسی صورت میں آ سکتا تھا ، جب میں شادی کر لیتا ... یہ سوچ کر میں نے والدہ سے کہا :

'' اس بار میں لاہور سے آؤں گا تو آپ کو بتا دوں گا۔''

'' اچھی بات ہے ... کیا میں تمہیں ان کے نام بتا دوں۔''

'' جی بتا دیں۔''

انہوں نے تین لڑکیوں اور ان کے گھرانوں کے بارے میں بتا دیا ... تینوں لڑکیاں جانی پہچانی تھیں۔ برادری کی تھیں ... بلکہ قریبی رشتے داریاں تھیں... چنانچہ نام سن کر میں نے کہا :

'' میں سوچ کر بتا دوں گا ... ویسے میں اگر میں کسی چوتھی لڑکی کا نام لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا ۔''

'' مجھے تو خوشی ہوگی ... میں تو چاہتی ہوں ... تمہاری شادی وہاں ہو ... جہاں تم چاہو۔'' ماں نے خوش ہو کر کہا ۔

سبھی کی مائیں شفیق اور مہربان ہو تی ہیں ... میری والدہ بھی تمام ماؤں کی طرح مجھ پر حد درجے مہربان تھیں :

'' ٹھیک ہے امی ... میں غور کرنے کے بعد آپ کو بتا دوں گا ... یا تو ان تین میں سے ایک نام بتا دوں گا ... یا چوتھی لڑکی کا ۔''

ماں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا ... میری پیشانی پر بوسہ دیا ... اور پھر میں لاہور چلا آیا ... دوسرے دن شام کو میں ماموں نذیر احمد آثم کے گھر پہنچ گیا ... میرے اندر آندھیاں چل رہی تھیں ... آج مجھے اپنی زندگی کی اہم ترین بات خورشید سے کرنی تھی ... اللہ کی شان کہ خورشید گھر میں تنہا تھی ... اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا:

'' خیر تو ہے ... آج گھر میں اکیلی ہو ۔''

'' سب کہیں نہ کہیں گئے ہوئے ہیں ۔''

'' اور تم کیوں نہیں گئیں ۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا ۔

'' میرے سر میں درد ہے ۔''

'' اوہ ! تب تو تم آرام کرو ... میں اپنی بات کل کر لوں گا ۔''

'' سر کا درد تو تمہیں دیکھتے ہی جاتا رہا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

'' واقعی ۔'' میں نے حیران ہو کر کہا ۔

'' نہیں ... جھوٹ ۔'' اس نے ہنس کر کہا ...پھر یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگی :

'' ہاں! کیا کہہ رہے تھے تم ؟''

'' میں کہہ رہا تھا ... میں اپنی بات پھر کرلوں گا ۔''

'' کون سی اپنی بات ... تمہاری تو سب باتیں اپنی ہوتی ہیں ۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

'' لیکن آج میں جو بات کرنے چلا ہوں ... وہ میں نے پہلے کبھی نہیں کہی ۔'' میرے لہجے میں سنجیدگی سمٹ آئی ۔

'' ارے ارے ... تم تو سنجیدہ ہو گئے ... خیر تو ہے ... ایسی بھی کیا بات ہے۔''

'' میری والدہ میری شادی کر دینا چاہتی ہیں ۔''

'' ارے واہ ... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے ۔'' وہ واقعی بے تحاشہ خوش نظر آئی اور مجھے ایک دھکا سا لگا ، نہ جانے کیوں ۔

'' تو تمہیں یہ جان کر خوشی ہوئی ۔''

'' تمہاری شادی ہو اور میں خوش نہ ہوں ... یہ کیسے ممکن ہے۔''

'' سچ کہہ رہی ہو ۔'' میں نے ایک اور کوشش کی ۔

'' ہائیں... اس میں جھوٹ بھلا کہاں سے آئے گا۔'' اس نے حیرت ظاہر کی۔

'' اچھی بات ہے... تب میری والدہ جہاں کہتی ہیں... وہاں ہاں کہہ دیتا ہوں ... ٹھیک ہے ۔''

'' کیا مطلب ...کیا تم اپنی شادی کہیں اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہو۔''

'' اگر تم کہو ... تم اجازت دو... تو ...''

'' ہاں ہاں ... کہو رک کیوں گئے ... کہہ دو ... جو کہنا چاہتے ہو ...

میں بُرا نہیں مانوں گی ۔'' اس نے جلدی جلدی کہا۔
'' اگر تم کہو ...'' اس لمحے مجھے اپنی آواز دور کسی ویرانے سے آتی محسوس ہوئی... مجھے یوں لگا جیسے میری آواز میری اپنی نہ ہو پرائی ہوگئی ہو ...وہ آواز جس کا مجھ سے پیدائش سے لے کر آج تک تعلق تھا... جو میری اپنی تھی... خالص اپنی... آج وہ آواز میری نہیں رہی تھی... اس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا ...لیکن میں کیا کرسکتا تھا... میرے پاس کوئی دوسری آواز تھی بھی تو نہیں... وہی آواز مجھے منہ سے نکالنی پڑی... اس وقت آواز بہت بھاری ہوگئی... بہت بھاری بوجھ تلے دب گئی تھی... منوں بوجھ تلے ... اس وقت اس سے یہ الفاظ نکلے :
'' تم کہو تو خورشید ... میں ماموں جان اور امی جان کو یہاں بھیج دوں۔''
میں کہہ ہی گیا... نہ جانے مجھے کہنے کے لیے کتنا زور لگانا پڑا تھا... اور اس کے بعد میں خاموش ہوگیا ... کیونکہ اس کے بعد میرے پاس کہنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا... مجھ میں اس کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں رہ گئی تھی، کیونکہ اس کی آنکھوں سے میں اس کا جواب صاف پڑھ لیتا... لیکن مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی... آخر اس کی آواز سنائی دی :
'' میں نے آج تک اس پہلو سے نہیں سوچا ... تم میرے بچپن کے دوست ضرور ہو ... اور اس میں بھی شک نہیں کہ بہت اچھے دوست ہو ... لیکن جہاں تک شادی کا تعلق ہے ... اس پہلو سے تم سوچو بھی نہیں۔ میری ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ میری شادی کسی مالدار آدمی سے ہو جس کی ایک خوبصورت کوٹھی ہو ... اس کے پاس نئی کار ہو ... یہ ہے میرا خواب ! میں اپنے خواب کی تعبیر چاہتی ہو ں... کیا تم میرا مطلب سمجھ گئے ۔''
یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گئی... یک دم میری ہمتیں جوان ہو گئیں... میری بزدلی پر لگا کر اڑ گئی... خوف دور ہو گیا ... ہچکچاہٹ ختم ہو گئی ...

میں مسکرایا۔ میرے ہونٹ ہلے :

'' یہ سن کر خوشی ہوئی... میرے سر سے بوجھ اتر گیا ... دراصل بات صرف یہ ہے کہ میں نے سوچا ... کہیں میری طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے اور تم دل میں یہ نہ کہو ... اشتیاق نے مجھے پوچھا تک نہیں... بچپن کے ساتھی ہونے کے ناطے... اسے پوچھنا تو چاہیے تھا ... کیا تم مجھ سے شادی کرو گی ... تم نے تو پوچھا تک نہیں... بس... میں نے اس لیے پوچھ لیا۔''

'' اور میں نے تمھیں صاف بتا دیا ...''

'' ہاں بالکل ... لیکن ہم اچھے دوست ہیں اور رہیں گے۔''

'' ہاں! کیوں نہیں ۔''

یہ بات چیت بس یہیں ختم ہو گئی۔

جھنگ جانے کے دن آئے تو میں ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا ... والدہ نے چھوٹتے ہی پوچھا:

'' اشتیاق ! تم نے کیا فیصلہ کیا ۔''

'' جو فیصلہ آپ کریں گی... وہی بہتر ہو گا ۔''

'' بس تو ... ہم تمہارا رشتہ تمہارے تایا کے گھر لے جاتے ہیں ... وہ پہلے ہی خواہش مند ہیں ۔''

'' جی ٹھیک ہے ۔''

اس کے بعد جب میں جھنگ گیا تو والدہ نے مجھے بتایا :

'' رشتہ طے ہو گیا ہے ...اور تمہارے تایا ... جلد شادی کر دینا چاہتے ہیں... تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

'' جی نہیں ... اعتراض کیسا۔''

پھر شادی کی تاریخ طے ہو گی ... میں نے خورشید کو یہ اطلاع دے دی... اس نے فوراً کہا :

’’مبارک ہو ...‘‘

’’شکریہ ... خیر مبارک۔‘‘

میری شادی 1967ء میں ہوئی ... خورشید اور اس کے گھر کے باقی سب افراد شادی میں شریک ہوئے ... مجھے دلہا بنے دیکھ کر خورشید نے گھر کی سیڑھیوں پر مجھے روک لیا ... کہنے لگی :

’’اشتیاق! دلہا بنے بہت خوب صورت لگ رہے ہو۔‘‘

’’شکریہ !‘‘ میں مسکرا دیا۔

اس طرح میں شادی کے بندھن میں بندھ گیا ... شادی کے تین دن بعد خورشید اپنے ماں باپ کے ساتھ لاہور چلی گئی ۔

شادی 1967ء میں ہوئی۔ ایک سال بعد میرے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا، لیکن وہ چھ ماہ کی عمر میں وفات پا گیا۔ 1968 کے شروع میں خورشید کی شادی ہوئی ... میں نے اس کی شادی میں شرکت کی... دلہن کے روپ میں وہ خوب پھب رہی تھی ... میں نے اسے مبارک باد دی ... اس نے بھی خوش دلی سے مبارک باد قبول کی... اور اس طرح خورشید شاہ عالمی والے گھر سے رخصت ہو کر اپنے خاوند کے گھر چلی گئی... خاوند کا گھر دل محمد روڈ پر تھا ...دوسرے دن میں خورشید کے اہل خانہ کے ساتھ وہاں گیا ... خورشید اپنے نئے گھر میں خوش نظر آئی... اس لمحے میں نے بھی ایک عجیب سی خوشی محسوس کی۔

1968 کے آخر میں میرے ماموں جھنگ میں شدید بیمار ہو گئے ... ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا ... میں انہیں علاج کے لیے لاہور لے آیا ... انہیں میو ہسپتال میں داخل کرایا... لیکن وہ دو دن بعد ہسپتال ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئے ۔

مجھے اپنے ماموں سے بہت محبت تھی ... ہم انہیں ایمبولینس میں جھنگ لے آئے۔ خورشید کے والد اور اس کے خاوند میرے ساتھ جھنگ آئے... والدہ نے ماموں جان کی وفات کا بہت اثر لیا اور وہ بیمار رہنے لگیں ... اس دوران

1971 میں میرے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی، اس کا نام فرحت جبیں رکھا گیا ...
1971 میں میری والدہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں ... مجھے اچھی طرح یاد ہے ... ان کی وفات سے کوئی پندرہ دن پہلے میں جھنگ گیا تھا ... اس وقت وہ چارپائی پر بیٹھی تھیں ... اور بہت کمزور نظر آ رہی تھیں۔ معمول کے مطابق دو دن ٹھہر کر جب میں لاہور جانے کے لیے ان سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا... اور ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے... شاید انہیں انداز ہو گیا تھا کہ ان کی رخصت کا وقت نزدیک ہے، لیکن انہوں نے ہم میں سے کسی کو بھی یہ احساس نہ ہونے دیا ... اس سے پہلے بھی میں ان سے رخصت ہو کر لاہور جاتا رہا تھا، لیکن انہوں نے میری پیشانی پر اس طرح بوسہ کبھی نہیں دیا تھا ... گویا وہ رخصتی کا بوسہ تھا ... اس کا احساس مجھے پندرہ دن بعد ہوا... جب ان کی وفات کی اطلاع ملی... وہ بوسہ مجھے آج بھی یاد ہے، یاد رہے گا۔

1972 میں میرے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، اس کا نام نوید احمد رکھا گیا...
اور یہ وہ دن تھے ... جب میرا پہلا ناول پیکٹ کا راز شائع ہوا تھا۔

میں شادی کی چھٹیاں گزرا کر لاہور پہنچا۔

☆☆☆☆☆

O

ان حالات میں اچانک مجھے ایک خیال آیا۔

وہ خیال ناول '' منزل ملی انہیں'' کے بارے میں تھا ... خیال یہ آیا تھا کہ ابو ضیا اقبال صاحب کے ہوسکتا ہے... کوئی پبلشر واقف ہو اور وہ ان سے میری ملاقات کرا دیں... خیال آتے ہی میں ان کے پاس گیا ... سلام کرکے ان کے سامنے بیٹھ گیا ... وہ لگے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے ... وہ بہت ملنسار آدمی تھے ... گورے رنگ کے 45,40 سال کی عمر کے انسان تھے ، آنکھوں پر ہروقت عینک رہتی تھی :

'' سر! ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''

'' ہاں ہاں ... کہیے ۔'' انہوں نے فوراً کہا ۔

'' سر! اس وقت تک میری سو کے قریب کہانیاں اور افسانے شائع ہو چکے ہیں ۔اب میں نے ایک ناول لکھا ہے ... آپ مہربانی فرما کر اس ناول کے سلسلے میں میری کسی پبلشر سے بات کرا دیں۔''

ابو ضیا اقبال میری بات سن کر مسکرائے ، پھر انہوں نے کہا:

'' ایک پبلشر میرے واقف تو ہیں... میں ان کے نام رقعہ لکھ دیتا ہوں ... لیکن پہلے مجھے اپنا مسودہ دکھائیں ۔''

'' جی اچھا ! میں کل لے آؤں گا ۔'' میں نے فوراً کہا ۔

دوسرے دن میں منزل ملی انہیں کا مسودہ دفتر لے گیا ... اور اسے ابو مینا

اقبال صاحب کے سامنے رکھ دیا ... وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے... کہیں کہیں سے انہوں نے پڑھ کر دیکھا ... آخر کہنے لگے :

'' اپنے دوست کے نام رقعہ لکھ دیتا ہوں، ان کے ادارے کا نام مکتبہ عالیہ ہے ...آپ نے قطب الدین ایبک روڈ دیکھا ہے ۔''

'' جی وہ ... انارکلی میں... پان منڈی کے آس پاس ؟''

'' بالکل وہی ... قطب الدین ایبک کے مزار کے بائیں طرف ایک عمارت نظر آئے گی ... اس کی دوسری منزل کی دیوار پر آپ کو مکتبہ عالیہ لکھا نظر آئے گا... بس وہاں چلے جائیں... مکتبہ عالیہ کے مالک جمیل صاحب اور الطاف حسین صاحب ہیں ... میں ان کے نام رقعہ لکھ دیتا ہوں... ہوسکتا ہے ، وہ آپ کا ناول لے لیں۔''

'' آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔'' میں نے ان سے کہا اور رقعہ لے کر مکتبہ عالیہ چلا آیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو دو کمروں کا ایک دفتر نظر آیا ... دائیں طرف ایک قدرے موٹے آدمی بیٹھے نظر آئے... وہ کچھ کاغذات میں گم تھے ... سامنے ہی دوسرا کمرہ تھا... اس میں سامنے کے رُخ پر ہی دوسرے صاحب بیٹھے نظر آئے...یہ مناسب جسم کے مالک گورے سے انسان تھے ... میں نے اندر داخل ہوتے ہی پہلے صاحب سے سوالیہ انداز میں پوچھا:

'' جمیل صاحب ؟''

انہوں نے انگلی سے اندر کی طرف اشارہ کیا ... میرے قدم اٹھ گئے... دوسرے کمرے میں پہنچ کر میں نے کہا :

'' السلام علیکم ۔''

یہ صاحب بھی اپنے کام میں مصروف تھے... غالباً کوئی مسودہ پڑھ رہے تھے... میری آواز سن کر انہوں نے نظر اوپر اٹھائی ... میری طرف دیکھا... پھر ان

کے ہونٹ ہلے :

'' فرمائیے ۔''

میں نے آگے بڑھ کر ان کے سامنے رقعہ رکھ دیا ۔ رقعے کے نیچے ابو ضیاء اقبال کا نام دیکھ کر انہوں نے کہا :

'' تشریف رکھیے ۔''

میں بیٹھ گیا ... انہوں نے رقعہ پڑھا... پھر نظریں اٹھا کر بولے :

'' کہاں ہے مسودہ ۔''

'' جی یہ رہا ۔''

میں نے مسودہ بھی ان کے سامنے رکھ دیا ... وہ اسے کئی منٹ تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے ... آخر کہنے لگے :

'' زندگی میں پہلی بار ہی یہ چیز لکھی ہے یا پہلے بھی کچھ لکھا ہے۔''

مجھے امید تھی کہ وہ یہ سوال پوچھیں گے ... اس کا جواب میں پہلے سے تیار کر کے لے گیا تھا ... یعنی اس وقت تک جو جو چیز جہاں جہاں شائع ہوئی تھی... اس کی تفصیل فل اسکیپ کے دو کاغذوں پر لکھ کر لے گیا تھا ... لٰہذا میں نے فوراً وہ دو صفحات نکالے اور ان کے سامنے رکھتے ہوئے گویا ہوا :

''اس کی تفصیل یہ ہے ۔''

انہوں نے ان دونوں صفحات کا غور سے معائنہ کیا ...اب ان کے چہرے پر قدرے حیرت نظر آئی... آخر انہوں نے کہا:

'' ٹھیک ہے ... مسودہ آپ چھوڑ جائیں ... میں اسے پڑھ کر دیکھوں گا... پھر آپ کو بتاؤں گا ...آپ تین چار دن بعد آئیں۔''

'' جی اچھا !'' میں نے مطمئن انداز میں کہا اور انہیں سلام کر کے واپس مڑا ... پہلے کمرے والے صاحب کو بھی سلام کیا ...

انہوں نے وعلیکم السلام کہنے کی بجائے صرف سر ہلا دیا۔ اس سے مجھے کچھ

ناگواری سی محسوس ہوئی... بعد میں پتا چلا ، اس ادارے کے دو حصے دار تھے... محترم جمیل النبی اور الطاف حسین صاحب۔

اب مجھے تین چار دن تک انتظار کرنا تھا ... اور انتظار بہت مشکل کام ہے... میں انتظار سے جتنا گھبراتا ہوں ...کسی اور چیز سے اتنا نہیں گھبراتا ... لیکن مجبور تھا ... انتظار کیے بغیر چارہ نہیں تھا ...

آخر چوتھے دن پھر مکتبہ عالیہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا ... دونوں حضرات اسی طرح بیٹھے نظر آئے ... میں نے پہلے صاحب کو سلام کیا اور آگے بڑھ گیا ... دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پھر گویا ہوا :

'' السلام علیکم ۔''

جمیل صاحب نے نظریں اٹھائیں اور فوراً بولے :

''آیئے آیئے ۔''

انہوں نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ... میں کرسی پر بیٹھ گیا ۔ انہوں نے میز کی دراز کھولی اور میر امسودہ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا اور ایک بار پھر اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔

اس سے میں نے گمان کیا کہ وہ پڑھ نہیں سکے ... اس خیال سے مجھے اپنادل بیٹھتا محسوس ہونے لگا ... اسی وقت انہوں نے کہا :

'' میں نے آپ کا ناول پڑھ لیا ہے... آپ کا ناول اچھا ہے ... اور ہم اسے شائع بھی کرنا چاہتے ہیں ... لیکن ہماری ایک شرط ہے ۔''

'' جی ... شرط... ؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

'' شرط یہ ہے کہ آپ اسے اپنے نام سے نہ چھپوائیں۔''

'' جی ... کیا مطلب ؟'' میں حیرت زدہ رہ گیا ۔

'' دیکھیے ... میں بتاتا ہوں ...آج کل رضیہ بٹ اور چند اور خواتین کے ناول دھڑا دھڑ فروخت ہو رہے ہیں ... اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ رومانی ناول پبلشر

حضرات صرف خواتین کے ناموں سے شائع کر رہے ہیں ... آپ کا نام تو ابھی نیا ہے ... آپ کے نام سے اگر ہم نے یہ ناول شائع کیا تو ہمارا سرمایہ ڈوب جائے گا ... ان دنوں تو مشہور لکھنے والے حضرات کے ناموں میں بھی کوئی رومانی ناول نہیں چھاپ رہا... مطلب یہ کہ ہم چھاپ بھی لیں گے تو وہ نہیں بکے گا... آپ کو تو کوئی جانتا تک نہیں ... پھر یہ ہے آپ کا پہلا ناول ... اگر آپ پسند کریں تو ہم یہ ناول آپ کی بیوی یا بیٹی کے نام سے شائع کر سکتے ہیں۔'' یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گئے ۔

میرے دماغ میں اس وقت آندھیاں سی چل رہی تھیں... میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسی بات سننے کو ملے گی ... آخر میں نے کہا :

'' اس کا مجھے کیا فائدہ ہو گا سر۔''

'' فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کو اس ناول کا معاوضہ مل جائے گا۔''

'' معاف کیجیے گا ... میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں ... معاوضے کے لیے نہیں... شوق کی خاطر لکھتا ہوں ... بیوی یا بیٹی کے نام سے اگر میں نے یہ ناول شائع کرایا تو اس کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا... لہٰذا مجھے یہ بات منظور نہیں ۔''

انہوں نے میری بات سن کر کوئی جواب نہ دیا۔ بس خلا میں گھورتے رہے... آخر ان کی آواز سنائی دی :

'' خیر فی الحال ! ہم اس ناول کو اپنے پاس رکھ لیتے ہیں... اس پر بعد میں بات کریں گے ... آپ کو اس ناول کا معاوضہ مل جائے گا ...فیصلہ بعد میں کریں گے ... آپ ایسا کریں ... بچوں کا ایک ناول لکھ کر لے آئیں ... لیکن ناول جاسوسی ہو۔ یہ ناول ہم آپ کے نام سے شائع کریں گے اور آپ کو اس کا معاوضہ بھی دیں گے، لیکن ناول طویل نہ ہو ، سو صفحات کا ہو ۔''

'' جی ... کیا کہا آپ نے بچوں کے لیے جاسوسی ناول ؟''

میں حیرت زدہ رہ گیا ... اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا

کہ آنے والے دن کیسے دن ہوں گے ...زندگی کا وہ پہلا دن مجھے رہ رہ کر یاد آتا ہے ... وہ وقت بھی کیا وقت تھا... جب محترم جمیل النبی صاحب نے یہ الفاظ کہے تھے... اور میں سمجھتا ہوں... انہوں نے کیا کہے تھے ... اللہ تعالیٰ نے ان کے منہ سے نکلوائے تھے۔

میں نے خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھا ... پھر میرے ہونٹ ہلے: ''

'' لیکن ... میں نے تو آج تک کوئی جاسوسی کہانی تک نہیں لکھی ... آپ تو بات کر رہے ہیں جاسوسی ناول کی، وہ بھی بچوں کے جاسوسی ناول کی ... ہاں میں بچوں کے لیے کہانیاں ضرور لکھتا رہا ہوں۔ اب تو وہ بھی کافی دیر ہو گئی چھوڑے ہوئے ... کیونکہ اب میں نے افسانے شروع کر رکھے ہیں۔''

'' اوہو ! آپ کوشش تو کریں ۔'' جمیل صاحب نے منہ بنایا۔

دراصل اس وقت میرے سر پر رومانی ناول سوار تھا اور میری خواہش تھی ... وہ جلد از جلد شائع ہو جائے ... ان کی بات سن کر مجھے مایوسی ہو ئی تھی... لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا ... وہاں سے اٹھ کر تھکے تھکے انداز میں گھر آیا۔

بے چینی کی حالت میں چارپائی پر بیٹھا تھا ... ایسے میں جمیل صاحب کے الفاظ یاد آئے :

'' بھئی آپ کوشش تو کریں ۔''

میں نے سوچا ... کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے... جاسوسی ناول لکھنے کے بارے میں میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا ... پورا ایک دن سوچتا رہا ... لکھوں نہ لکھوں اور لکھوں تو کیا لکھوں ...

دوسرے دن تک جب کچھ سمجھ نہ آیا تو تنگ آ کر میں نے قلم ہاتھ میں لے لیا ... کاغذ آگے رکھ کر بیٹھ گیا ...

ذہن میں دور دور تک کوئی بات نہیں تھی۔ کوئی خاکہ نہیں تھا۔ کوئی مرکزی

خیال ذہن میں نہیں تھا... ذہن میں کوئی بات تھی تو بس یہ کہ مجھے بچوں کا ایک جاسوسی ناول لکھنا ہے...

آخر میں نے سوچے سمجھے بغیر ایک جملہ لکھا :

''محمود اور فاروق چلتے چلتے رک گئے ...''

یہ پہلا جملہ تھا جو میرے قلم سے نکلا ... پھر تو جیسے گاڑی چل پڑی۔ جملے پر جملہ سوچے بغیر قلم سے لکھتا چلا گیا ... تیسرا نام ذہن میں فرزانہ آیا۔ بس ان تین کرداروں پر ناول لکھتا چلا گیا ... چوتھا کردار ان کی والدہ کا شامل ہوگیا۔ پھر ان کے والد کا نام ذہن میں انسپکٹر جمشید آیا ... پہلے دن جب تھک کر اٹھا تو پندرہ صفحات لکھ چکا تھا۔

دوسرے دن پھر ناول پر جٹ گیا ... یہاں تک کہ صرف چار دن میں ناول مکمل ہوگیا... ناول کا نام پیکٹ کا رازرکھا۔

ناول کا مسودہ لے کر مکتبہ عالیہ پہنچا۔ جمیل صاحب نے مسودے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور گویا ہوئے :

''پہلے سے لکھ کر رکھا ہوا تھا ؟''

''جی نہیں ... آپ کے کہنے پر لکھا ہے ۔''

''اتنی جلدی لکھا گیا ؟'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں! بس لکھ گیا ... میں خود حیران ہوں۔''

''اور ہے بھی جاسوسی ۔''

''جی ہاں! خالص جاسوسی ۔'' میں مسکرایا۔

''اچھا ٹھیک ہے ، چند دن بعد آ کر پتا کر لیں ... اس وقت تک میں اسے پڑھ کر دیکھ لوں گا ، پسند آ گیا تو ہم ضرور اسے شائع کریں گے۔''

''شکریہ! میں نے کہا اور جانے کے لیے مڑ گیا ... جمیل صاحب کو سلام کر کے پہلے کمرے میں آیا اور الطاف صاحب کو سلام کیا ...

ابھی ان سے معاملہ صرف علیک سلیک تک تھا... اس وقت بھی انہوں نے بس وعلیکم السلام کہا... کوئی بات نہ ہوئی...

اس سے مجھے گمان گزرا... وہ قدرے خشک مزاج ہیں ... جب کہ جمیل النبی صاحب خشک مزاج محسوس نہیں ہوئے تھے۔

چند دن بعد گیا تو الطاف صاحب کے چہرے پر اسی سختی کے آثار تھے جب کہ جمیل صاحب نے مسکرا کر استقبال کیا اور بولے :

'' آیئے آیئے ... تشریف رکھیے۔''

میں نے صاف محسوس کیا ... ان کے سلوک میں تبدیلی آ گئی تھی... آج بے رخی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

انہوں نے میز کی دراز میں سے پیکٹ کا راز کا مسودہ نکالا ... پھر کہنے لگے : '' میں نے آپ کا مسودہ پڑھ لیا ہے ... اچھا ہے ... ہم اسے شائع کریں گے... اور آپ کے نام سے شائع کریں گے ... اب پہلے اس کی کتابت کراتے ہیں... کتابت مکمل ہو جائے گی تو آپ کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا ... ٹھیک ہے۔''

''جی بہت بہت شکریہ۔'' میں نے خوش ہو کر کہا ... اور خوش کیوں نہ ہوتا... میرے اندر تو خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے... میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرا کوئی ناول بھی شائع ہوگا ۔ اور اب اس کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔

پندرہ بیس دن بعد میں پھر مکتبہ عالیہ گیا ... آج وہاں جمیل النبی نہیں تھے... البتہ پہلے کمرے میں الطاف صاحب موجود تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا :

'' آیئے... آیئے۔'' ان کے لہجے میں سختی کم محسوس ہوئی۔

میں ان سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گیا:

'' جمیل صاحب تو شاید کسی کام سے گئے ہیں... میں پتا کرنے آیا تھا...

ناول کی کتابت ہو گئی ہے یا نہیں ۔''

'' ناول کی کتابت تو ہو گئی ہے ... لیکن اس کے بارے میں جمیل صاحب ہی بتائیں گے۔ آپ کل یا پرسوں آ جائیں، آج وہ دفتر نہیں آئیں گے۔''

'' جی اچھا !'' میں کہہ کر اٹھ گیا ۔

چند دن بعد میں پھر وہاں گیا ... جمیل صاحب موجود تھے... وہ خوش ہو کر ملے اور کہنے لگے :

'' آپ کا ناول کتابت ہو گیا ہے ... 91 صفحات بنے ہیں ... ہم آپ کو اس کا معاوضہ دے دیتے ہیں... اس کے بعد اس کی اشاعت کی تیاری شروع کرتے ہیں۔''

'' جی بہتر !''

'' آپ ایک ہفتے بعد آ کر معاوضہ لے لیں ۔''

'' جی اچھا !'' میں نے کہا اور چلا آیا ۔

ایک ہفتے بعد گیا تو جمیل صاحب نہیں تھے... الطاف صاحب نے بتایا کہ وہ بیمار ہیں... اس طرح میں نے کئی چکر لگائے... لیکن جمیل صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی ... ان حالات نے مجھے بہت پریشان کر دیا ... لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا ...ایک ناول شائع ہونے کی امید بندھی تھی ... لہٰذا صبر کے گھونٹ بھرتا رہا ... صبر کے یہ گھونٹ چھ ماہ تک بھرنے پڑے... چھ ماہ گزر گئے تب کہیں جا کر ایک دن جمیل صاحب نے کہا:

'' ناول کا معاوضہ ہم آپ کو دے دیتے ہیں ... اس کی اشاعت کی تیاری بھی مکمل ہو گئی ہے ... بس اسے پریس بھیجنا باقی ہے ۔''

'' جی شکریہ !'' میں نے فوراً کہا۔

اب انہوں نے الطاف صاحب کی طرف دیکھا :

'' الطاف صاحب ! انہیں چیک لکھ دیں ۔''

''اچھا۔''

''اور وہ میرا رومانی مسودہ۔''

''اسے بھی ہم شائع کریں گے ... فی الحال آپ اس کا معاوضہ بھی لے لیں ... بعد میں شائع ہوتا رہے گا۔''

''جی اچھا۔''

''الطاف صاحب ... انہیں رومانی ناول کا معاوضہ بھی دے دیں۔''

''اچھی بات ہے۔''

اب الطاف صاحب نے میز کی دراز سے چیک بک نکالی اور لکھنے لگے:

میں اٹھ کر ان کی میز پر آگیا ... میرا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ نہ جانے یہ دونوں ناولوں کے کتنے پیسے دیتے ہیں ...الطاف صاحب نے چیک لکھ کر مجھے دے دیا ... میں نے دیکھا ... اس پر صرف 175 روپے لکھا تھا ... مجھے ایک دھچکا سا لگا، دو ناولوں کا معاوضہ 175 روپے ... میں نے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیے:

''پچاس روپے معاوضہ آپ کے ناول پیکٹ کا راز کا اور ایک سو پچیس روپے منزل انہیں ملی کا ... یہ ہو گئے پونے دو سو روپے ... انارکلی میں ہی یہ بنک ہے، کیش کرالیں۔''

''جی اچھا!'' میں نے مرے مرے انداز میں کہا اور پھر ان سے ہاتھ ملا کر واپس مڑنے لگا ... ایسے میں مجھے کچھ خیال آیا ... میں واپس جمیل صاحب کے پاس گیا... میں نے ان سے پوچھا:

''کیا میں کوئی اور ناول شروع کرلوں۔''

''ہاں ضرور ... کیوں نہیں۔''

''اور کیا انہی کرداروں پر لکھوں ... یا کچھ اور کرداروں پر۔''

''نہیں... اب دوسرے کرداروں پر لکھیں۔''

'' جی اچھا شکریہ۔''

میں واپس مڑا اور کمرے سے نکل آیا...میں نے معاوضے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا... کہتا بھی کیسے... میں کوئی جانا پہچانا مصنف تو تھا نہیں... کہ معاوضے کے سلسلے میں ان سے بات کرتا ... مجھے ان دنوں کون جانتا تھا...یہی بہت بڑی بات تھی کہ انہوں نے ناول شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ... اور کچھ نہ کچھ معاوضہ بھی دے رہے تھے... اب میں بنک پہنچا ... جس کھڑکی پر چیک لیے جا رہے تھے، اس پر میں نے بھی چیک دے دیا... انہوں نے پیتل کا ایک سکہ مجھے دے دیا ... اور میں بنچ پر جا بیٹھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد کیشیر نے آواز لگائی:

'' اشتیاق احمد ۔''

میں فوراً کھڑکی پر چلا گیا :

'' آپ کا ہے یہ چیک ۔'' اس نے چیک مجھے دے دیا ۔

''جی ہاں!''

'' اس اکاؤنٹ میں تو پیسے ہی نہیں ہیں ۔''

'' کیا !!!'' مارے حیرت کے میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں! ان کے اکاؤنٹ میں پیسے نہیں ہیں... چیک کیش نہیں ہوسکتا۔''

میں بہت حیران ہوا کہ جب ان کے اکاؤنٹ میں پیسے نہیں تھے تو انہوں نے چیک کیوں لکھ کر دیا ... پریشان بھی بہت ہوا۔ آخر پھر ان کے پاس گیا... الطاف صاحب موجود تھے ... میں نے ان سے کہا :

'' جناب!یہ چیک کیش نہیں ہوا ... وہ کہتے ہیں ، اس اکاؤنٹ میں تو پیسے نہیں ہیں ۔''

'' اوہ اچھا ! بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے اپنے اکاؤنٹ میں ادھر ادھر کے آئے ہوئے کچھ چیک جمع کرا رکھے ہیں ...معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک حساب

میں جمع نہیں ہوئے ... جب کہ ہمار اندازہ تھا کہ وہ چیک جمع ہو گئے ہوں گے ... آپ دو تین دن بعد پھر بنک جایئے گا ... کیش ہو جائے گا ۔''

'' جی اچھا ۔''

دو تین دن بعد میں پھر بنک گیا۔ چیک کیش نہ ہو سکا ... میں پھر الطاف صاحب سے ملا ، اس وقت جمیل النبی بھی موجود تھے ... بات ان کے علم میں بھی آئی تو انہوں نے کہا :

'' یہ چیک آپ مجھے دے دیں ... میں آپ کو نقد پیسے دے دیتا ہوں ۔''

'' جی اچھا !'' میں خوش ہو گیا۔

اور اس طرح مجھے اپنے پہلے جاسوسی ناول کے صرف پچاس روپے مل گئے ... جب کہ منزل ملی انہیں کے انہوں نے 125 روپے دیئے تھے۔

بعد میں میں اس ناول کے بارے میں پوچھتا رہا اس کا کیا بنا ... یا اس کی اشاعت کا پروگرام بنایا نہیں ... لیکن اس ناول کے بارے میں انہوں نے کوئی بات پھر کبھی نہیں نہ بتائی... بس یہی کہہ دیتے تھے ... ابھی اس کا پروگرام نہیں بن سکا۔

اب رہ گیا پیکٹ کا راز... اس کے لیے میں ان کے دفتر کئی بار گیا۔ ہر بار وہ یہی کہتے رہے کہ بہت جلد چھپ جائے گا ... فکر نہ کریں ۔''

یہ بہت جلد چھ ماہ بعد آئی ... چھ ماہ بعد میں ان کے دفتر گیا تو انہوں نے شائع شدہ پیکٹ کا راز میرے سامنے رکھ دیا ... کتابی شکل میں اپنا پہلا ناول دیکھ کر میں کتنا خوش ہوا... بیان نہیں کر سکتا ... اس وقت کسے معلوم تھا کہ کیا دن آنے والے ہیں۔ اب میں نے جمیل سے کہا :

'' میں نے ایک اور ناول لکھ لیا ہے... وہ لے آؤں ۔''

انہوں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا :

'' ابھی نہیں... ابھی تو ہم یہ دیکھیں گے کہ اس ناول کی فروخت کیسی

رہتی ہے، پھر دوسرے ناول کی بات کریں گے۔''

'' خیر! آپ میری اعزازی کاپیاں دے دیں ۔''

انہوں نے مجھے پانچ کتابیں دے دیں ... میں لے کر چلا آیا... سب سے پہلے ناول ماموں نذیر احمد آثم کو دکھایا ... خورشید نے بھی دیکھا ... دونوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

دوسرے دن میں ایک ناول لے کر کھوکھر صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ اس وقت اپنے مکان کے باغ میں بیٹھے تھے... ان کے داماد محمد احمد بھٹی اور ایک دوست پراچہ صاحب وہاں موجود تھے ... میں بچوں کو پڑھانے کے لیے اوپر جانے سے پہلے باغ میں اس لیے چلا گیا کہ انہیں ناول دکھاؤں گا ...

میں نے سلام کیا اور ناول ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

کھوکھر صاحب سے پہلے پراچہ صاحب ناول اٹھا کر دیکھنے لگے... پراچہ صاحب کھوکھر صاحب کے قریبی دوست تھے اور محکمہ اطلاعات میں ملازم تھے ... ناول الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد انہوں نے حیران ہو کر کہا :

'' ماسٹر صاحب! یہ ناول آپ نے لکھا ہے۔''

'' جی ہاں! '' میں نے شرما کر کہا۔

'' تو آپ نے یہ مکتبہ عالیہ سے کیوں چھپوایا ... فیروز سنز سے کیوں نہیں چھپوایا۔''

ان کا جملہ سن کر میں چونک اٹھا... فوراً بولا :

'' وہاں بھلا مجھے کون گھاس ڈالے گا ... وہ تو بہت بڑا ادارہ ہے ۔''

'' فیروز سنز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالوحید صاحب سے میری علیک سلیک ہے ... اب جب آپ کوئی ناول لکھیں ...تو مجھ سے رقعہ لے کر وہاں جائیں... ''

'' اوہ... ایک ناول تو میرے پاس لکھا ہوا موجود ہے ۔''

'' بس تو پھر میں رقعہ لکھ دیتا ہوں ... آپ جا کر ان سے مل لیں۔ ویسے

میں یہ ناول خود بھی پڑھ کر دیکھوں گا... آپ کے پاس اس کی اور کاپی ہے۔"

"جی ہاں!"

میں نے ایک ناول انہیں دے دیا ... کھوکھر صاحب کے داماد صاحب نے بھی ایک ناول پڑھنے کے لیے لے لیا۔ ان حضرات نے ناول پڑھا ...

محمد احمد بھٹی صاحب نے یہ الفاظ کہے :

"ماسٹر صاحب آپ نے یہ ناول نہ جانے کیسے لکھ لیا ... ویسے میرا خیال ہے کہ اب آپ زندگی میں اس سے اچھا ناول نہیں لکھ سکیں گے۔"

"جی!"

کھوکھر صاحب کو بھی ناول پسند آیا ... ناول کی پسندیدگی پر بات تیسرے دن ہوئی تھی ... دوسرے روز میں وہاں اس لیے نہ جا سکا کہ اتوار تھا ... بہرحال میں نے پیر کے روز دوسرا مسودہ فیروز سنز لے جانے کی ٹھان لی ... اب تو میرے پاس پراچہ صاحب کا رقعہ بھی تھا ... پراچہ صاحب نے یہ بھی کہا تھا :

"جب آپ جانے لگیں تو پہلے میرے پاس دفتر آجائیں۔ میں انہیں فون کردوں گا ، پھر آپ کو وہاں بھیجوں گا۔"

"جی شکریہ۔"

O

دوسرے دن میں پراچہ صاحب کے دفتر پہنچ گیا ... وہ اچھی طرح ملے۔ میرے سامنے ہی انہوں نے فیروز سنز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالوحید صاحب کو فون کیا... میرے بارے میں بتایا ... انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس لڑکے کا ایک ناول پہلے ہی چھپ چکا ہے۔ فون بند کرکے انہوں نے کہا :

" آپ میرا کارڈ بھی ساتھ لے جائیں ... سیدھے فیروز سنز جائیں ... فیروز سنز کا شوروم مال روڈ پر چیئرنگ کراس کے پاس ہے ... وہاں جا کر کسی سے پوچھ لیجیے گا... ڈاکٹر عبدالوحید کہاں بیٹھتے ہیں ... انہیں میرا کارڈ دے دیجیے گا اور رقعہ بھی... "

" جی ٹھیک ہے ۔"

میں مال روڈ پر پہنچا ... فیروز سنز کا شوروم تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی ... اندر داخل ہوا تو دروازے پر موجود چوکیدار سے پوچھا:

" ڈاکٹر عبدالوحید صاحب کہاں بیٹھے ہیں۔"

" بالکل سیدھے چلے جائیں ... بالکل آخر میں آپ کو دو کمرے نظر آئیں گے ۔ ان میں سے ایک کمرہ ڈاکٹر صاحب کا ہے ۔"

" بہت بہت شکریہ ۔"

اب میں نے آگے کی طرف قدم بڑھانے شروع کیے... اس وقت دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل

آئے گا ... اس وقت مجھے اس بات کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ فیروز سنز کے مالک میرا ناول لے لیں گے ... بلکہ میرا خیال تھا وہ تو اسے ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گے ... یہ خیال ضرور تھا ... لیکن قسمت آزمائی تو کرنا تھی ... میں آگے بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ بالکل آخر میں پہنچ گیا ... یہاں دائیں طرف والے کمرے کے دروازے پر ڈاکٹر عبدالوحید لکھا نظر آیا۔ اسٹول پر چپراسی موجود تھا... میں نے پراچہ صاحب کا دیا ہوا کارڈ اسے دے دیا ... اور کہنے لگا:

"مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے ... ان کارڈ والے صاحب نے مجھے بھیجا ہے ... انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو فون بھی کیا تھا۔"

چوکیدار منہ سے کچھ نہ بولا ...اس نے صرف سر ہلا دیا اور کارڈ لے کر اندر چلا گیا ... مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا... چپراسی جلد ہی باہر آگیا۔

اس نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "جائیے۔"

میں اللہ کو یاد کرتا ہوا اندر داخل ہوا ... یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ چھوٹی سی میز کے دوسری طرف ڈاکٹر عبدالوحید بیٹھے نظر آئے... وہ صاف ستھرے رنگ کے ادھیڑ عمر کے انسان تھے ... آنکھوں پر عینک تھی ... میں نے انہیں السلام علیکم کہا تو انہوں نے فوراً کہا:

"وعلیکم السلام ... بیٹھئے اور بتایئے... کیا مسئلہ ہے۔"

"جی وہ! آپ کو پراچہ صاحب نے فون کیا تھا۔"

"ہاں ان کا فون مل چکا ہے ... آپ مسئلہ بتائیں۔" انہوں نے نرم آواز میں کہا۔ ان کے لہجے کی نرمی سے مجھے حوصلہ ہوا... میں نے باادب انداز میں پیکٹ کا راز ان کے سامنے رکھ دیا اور کہنا شروع کیا:

"میرا یہ ناول چھپ چکا ہے ... اس سے پہلے سو کے قریب کہانیاں اور افسانے لکھ چکا ہوں۔ اس ناول کے بعد دوسرا ناول لکھ چکا ہوں ... پراچہ صاحب نے میرا یہ ناول پڑھا تو وہ کہنے لگے ... اب کوئی ناول لکھیں تو اسے فیروز سنز

سے چھپوائیں ... کیونکہ وہ بہت بڑا ادارا ہے ...اس سے ناول کا چھپنا کوئی معنی رکھتا ہے ... میں نے انہیں بتایا کہ دوسرا ناول تو میں لکھ چکا ہوں... سو انہوں نے مجھے آپ کے پاس آنے کا مشورہ دیا ...''

'' ہوں ٹھیک ہے ... بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں مسودے سعید لخت صاحب پڑھتے ہیں ... یعنی کسی کتاب کا بھی مسودہ ہو ... پہلے وہ پڑھتے ہیں... اگر انہیں پسند آجائے تو پھر ہم اسے چھاپ دیتے ہیں، لہٰذا آپ اپنا مسودہ ان کے پاس لے جائیں ... میں انہیں فون کر دیتا ہوں ... بلکہ میں آپ کے سامنے فون کر رہا ہوں... سعید لخت صاحب تعلیم و تربیت کے ایڈیٹر بھی ہیں۔''

اب انہوں نے پہلے سعید لخت صاحب کو فون کیا ... پھر ریسیور رکھ کر میری طرف مڑے... انہوں نے کہا :

'' آج کل سعید لخت صاحب ایمپریس روڈ پر بیٹھتے ہیں ... وہاں ہمارا دفتر ہے ۔''

'' بہت بہت شکریہ !'' میں نے یہ کہتے ہوئے ان سے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔

اب میں اپنی سائیکل پر ایمپریس روڈ کی طرف روانہ ہوا۔

ایمپریس روڈ (موجود بن بادیس روڈ) کا راستہ معلوم نہیں تھا ... پوچھتا ہوا وہاں پہنچا ... یہ ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کے دروازے شیشوں کے تھے۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دروازے کے بائیں طرف استقبالیہ کاؤنٹر نظر آیا ... میں اسی طرف بڑھ گیا:

'' مجھے سعید لخت صاحب سے ملنا ہے۔''

'' اوپر چلے جائیں ... سیڑھیاں ختم ہوتے ہی جو کمرہ نظر آئے گا، وہ سعید لخت صاحب ہی کا ہے ۔''

میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ان دنوں میں دفتر کی طرف سے بھی بہت پریشان تھا ... جب سے نائب داروغہ لگا تھا ، اس وقت سے میونسپل کارپوریشن کی ملازمت چبھنے لگی تھی ... اب آکر پتا چلا تھا کہ وہاں رشوت کا بازار گرم تھا... میں سینیٹری انسپکٹر کا کورس پاس کر چکا تھا ... لیکن ابھی تک سینٹری انسپکٹر لگ نہیں سکا تھا ... اس کا دارومدار کچھ سینٹری انسپکٹروں کی ریٹائرمنٹ پر تھا۔

وہاں اوپر سے نیچے تک لوگ رشوت کھا رہے تھے۔ مجھے صاف طور پر بتا دیا گیا تھا کہ رشوت تو لینی ہی پڑے گی ... لینے والے ہی سکون سے ملازمت کر سکتے ہیں... لہٰذا سکون چاہتے ہیں تو آپ کو بھی اپنا حصہ لینا پڑے گا ... نہیں لیں گے تو آپ کو یہ لوگ اس حد تک تنگ کریں گے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ زندگی دو بھر ہو جائے گی ... جینا حرام ہو جائے گا اور پھر ملازمت چھوڑ کر ہی جان چھوٹے گی ... یہ سب باتیں سن کر میں اپنا حصہ تو لینے لگا تھا ، لیکن ایک چبھن سی تھی جو مجھے ہر وقت گھیرے رہتی تھی۔ ضمیر ملامت کرتا کہ یہ رشوت کی کمائی ہے ... رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔

دوسری طرف تنخواہ بہت تھوڑی تھی ... 97 روپے ملتے تھے۔ رشوت کے حصے کے بغیر یوں لگتا تھا کہ گزارا نہیں ہوگا۔ گویا دو کشتیوں میں سوار تھا ... رشوت لینا پسند نہیں تھا ، اور لیے بغیر گزارا ممکن نہیں تھا۔ ادھر تو حالات یہ تھے ... ادھر ادبی دنیا میں مشکلات ہی مشکلات تھیں ... مکتبہ عالیہ نے پیکٹ کا راز کے صرف 50 روپے ہی دیے تھے ... اس سے پہلے چند افسانوں کا معاوضہ ملا تھا اور بس ... اب لے دے کے سیارہ ڈائجسٹ سے سو روپے مزید ملنے لگے تھے۔

ان دنوں کا ایک واقعہ یاد آ گیا ... یکم تاریخ کو دفتر سے تنخواہ لینے گیا تو کیشیئر نے کہا:

'' آپ کے پاس تین روپے ہوں گے ... کیونکہ میرے پاس کھلے ستانوے روپے نہیں ہیں ... ''

میرے پاس تین روپے تھے... وہ میں نے کیشیئر کو دے دیے... اس نے مجھے سو روپے کا نوٹ دے دیا... وہ میں نے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا... میری چپل ٹوٹ گئی تھی... میں نے سوچا ہوا تھا کہ تنخواہ کے دن لوں گا... تنخواہ ملی تو چپل یاد آئی۔ اسی وقت انارکلی کے فٹ پاتھ پر پہنچ گیا... وہاں چپل وغیرہ والے بیٹھتے تھے۔

ایک چپل والے کے پاس رک کر میں چپل پسند کرنے لگا... آخر ایگل کی ایک چپل پسند آگئی... میں نے دکاندار سے اس کی قیمت پوچھی... اس نے تین روپے بتائی... اب میرے پاس تین روپے کھلے نہیں تھے... جو تھے، وہ کیشیر کو دے دیے تھے... میں نے سوروپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے ہاتھ کھینچ لیا... اس وقت سو روپے کا نوٹ چھوٹا سا نوٹ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس نے کہا:

''کھلے پیسے دیں... میرے پاس بھان نہیں تھی۔''

''میرے پاس بھی کھلے پیسے نہیں ہیں۔''

''ارے!'' اس کے منہ سے نکلا... پھر اس نے نوٹ لے لیا اور کہنے لگا:

''آپ میری چپلوں کا خیال رکھیں... میں نوٹ تڑا کر لاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

میں وہاں کھڑا ہوگیا... چپلوں والا چلا گیا... جلد ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا... جب کافی دیر گزر گئی تو میں پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ نہ جانے کہاں چلا گیا۔ پاس ہی ایک شخص لنڈے کے کپڑے بیچ رہا تھا... اس نے میری پریشانی بھانپ لی... پوچھنے لگا:

''بابو جی... کیا بات ہے۔''

''میں نے یہ چپل خریدی ہے... تین روپے کی... سو روپے کا نوٹ چپل والے کو دیا تھا... وہ بھان لینے گیا تھا... بہت دیر ہو گئی... واپس نہیں آیا۔''
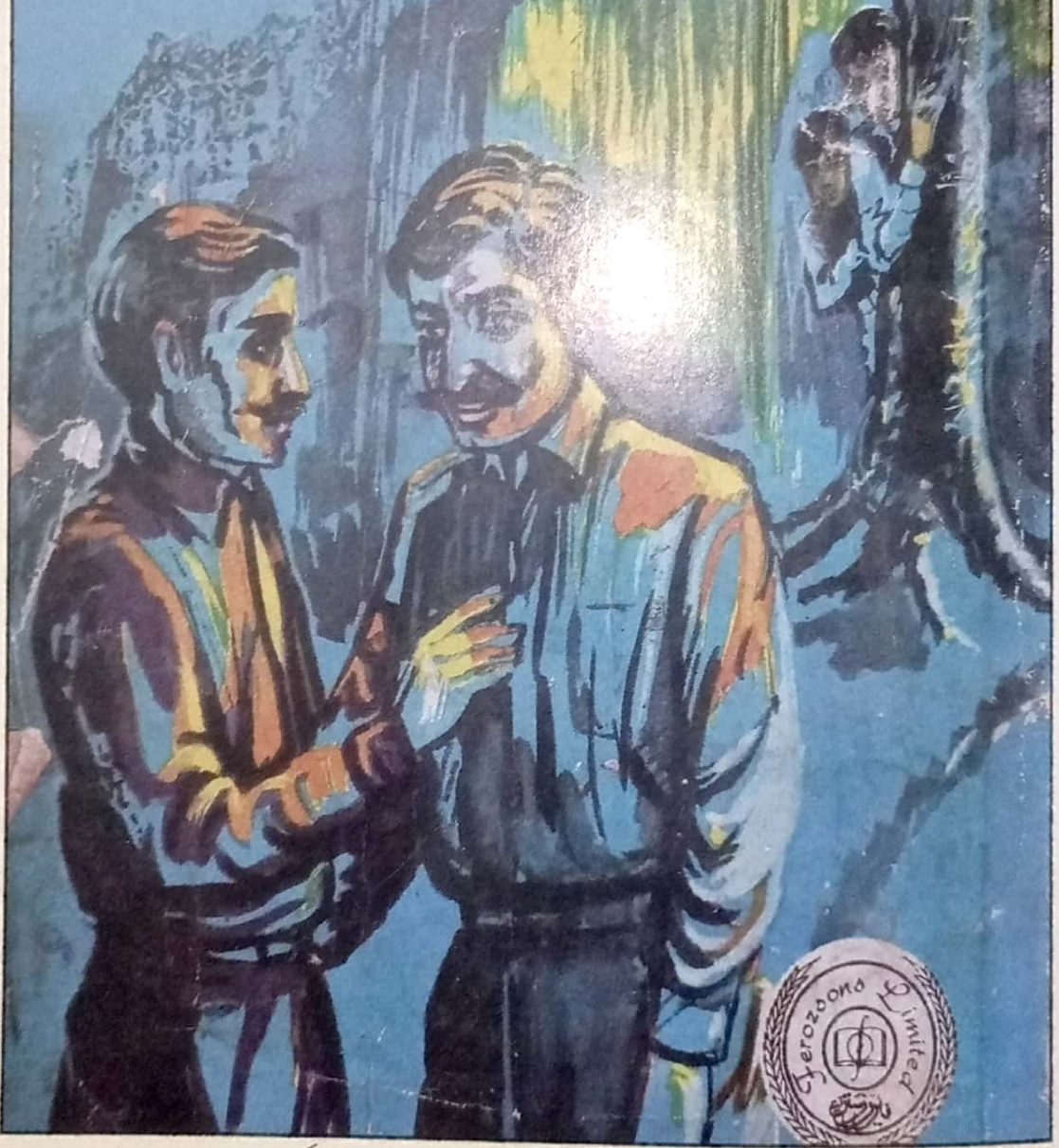
آستین کا سانپ ... پاکستان کے مشہور و معروف پبلشنگ ادارے ''فیروز سنز پبلشرز اینڈ بکسیلرز'' سے شائع ہونے والا اشتیاق احمد کا دوسرا ناول ... فیروز سنز سے شائع ہونے والا اشتیاق احمد کا یہ پہلا ناول تھا۔ اس ناول میں پہلی بار آصف، آفتاب، بیگم شہناز اور انسپکٹر کامران مرزا کے کردار سامنے آئے۔
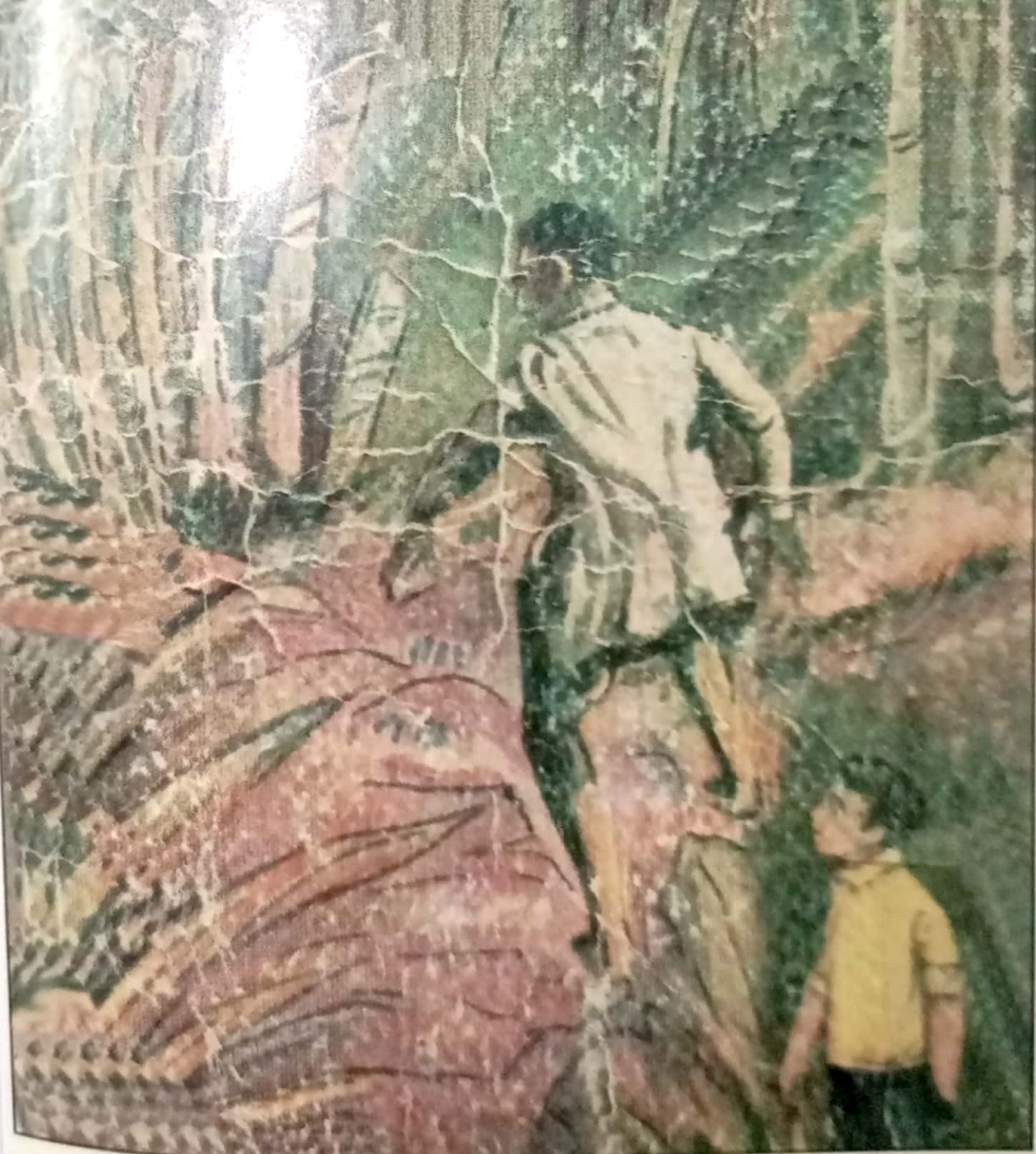
پیکٹ کا راز ... اشتیاق احمد کی زندگی کا سب سے پہلا ناول ہے جو کہ مکتبہ عالیہ سے 1972 میں شائع ہوا۔ اسی ناول میں سب سے پہلے محمود، فاروق، فرزانہ، انسپکٹر جمشید، شکیلہ بیگم (بیگم جمشید)، بیگم شیرازی اور سب انسپکٹر اکرام کے کردار متعارف ہوئے۔
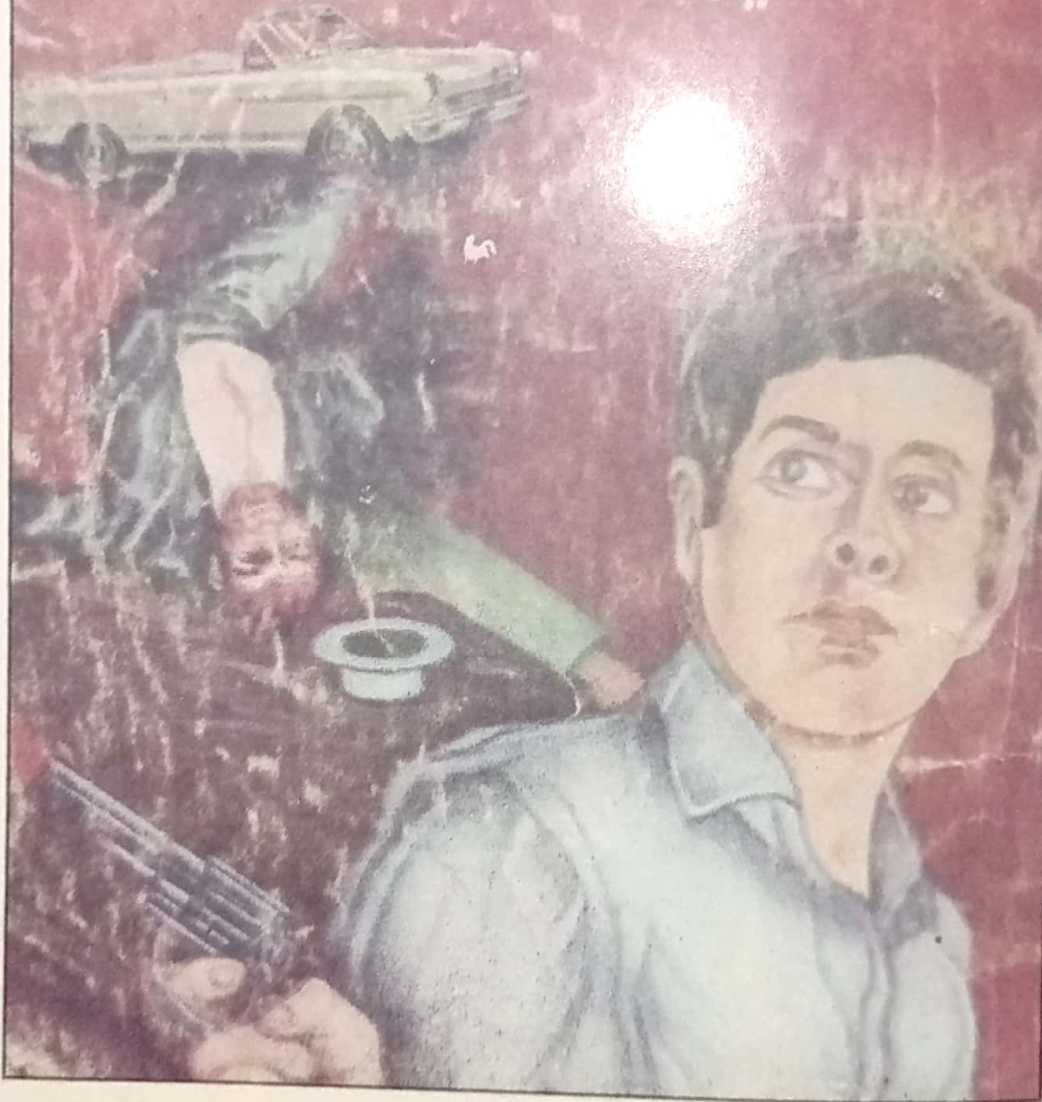
مکتبہ اشتیاق سے شائع ہونے والا اشتیاق احمد کا یہ پہلا ناول تھا۔
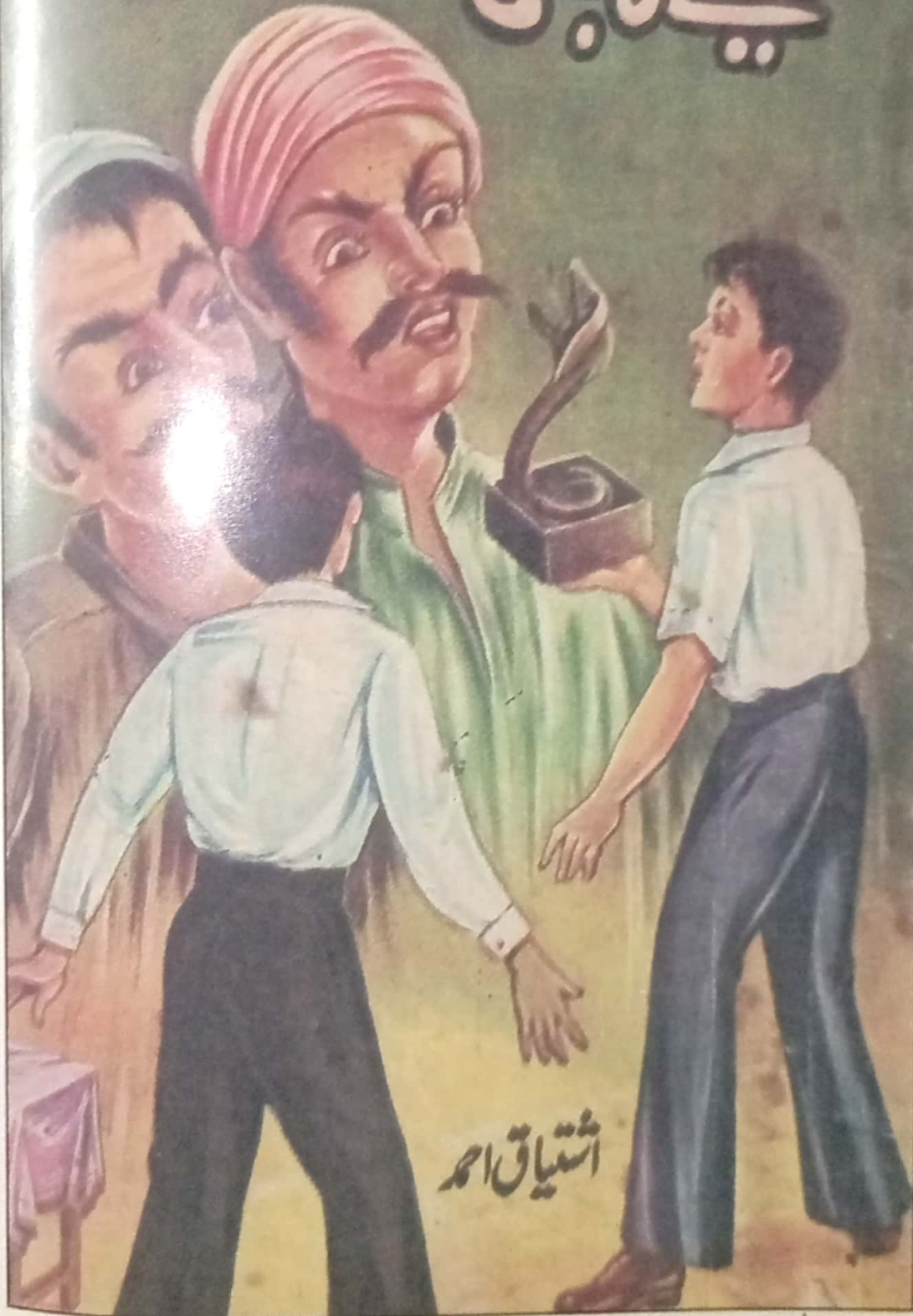
شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے اشتیاق احمد کا یہ ناول سب سے پہلے شائع کیا۔
اشتیاق احمد کا یہ تیسرا ناول تھا۔

غار کا سمندر
خاص نمبر
اشتیاق احمد
دو ہزار صفحات پر مشتمل اشتیاق احمد کا ضخیم ترین ناول
بچوں کے ادب میں آج تک اس سے زیادہ طویل ناول شائع نہیں ہوا۔
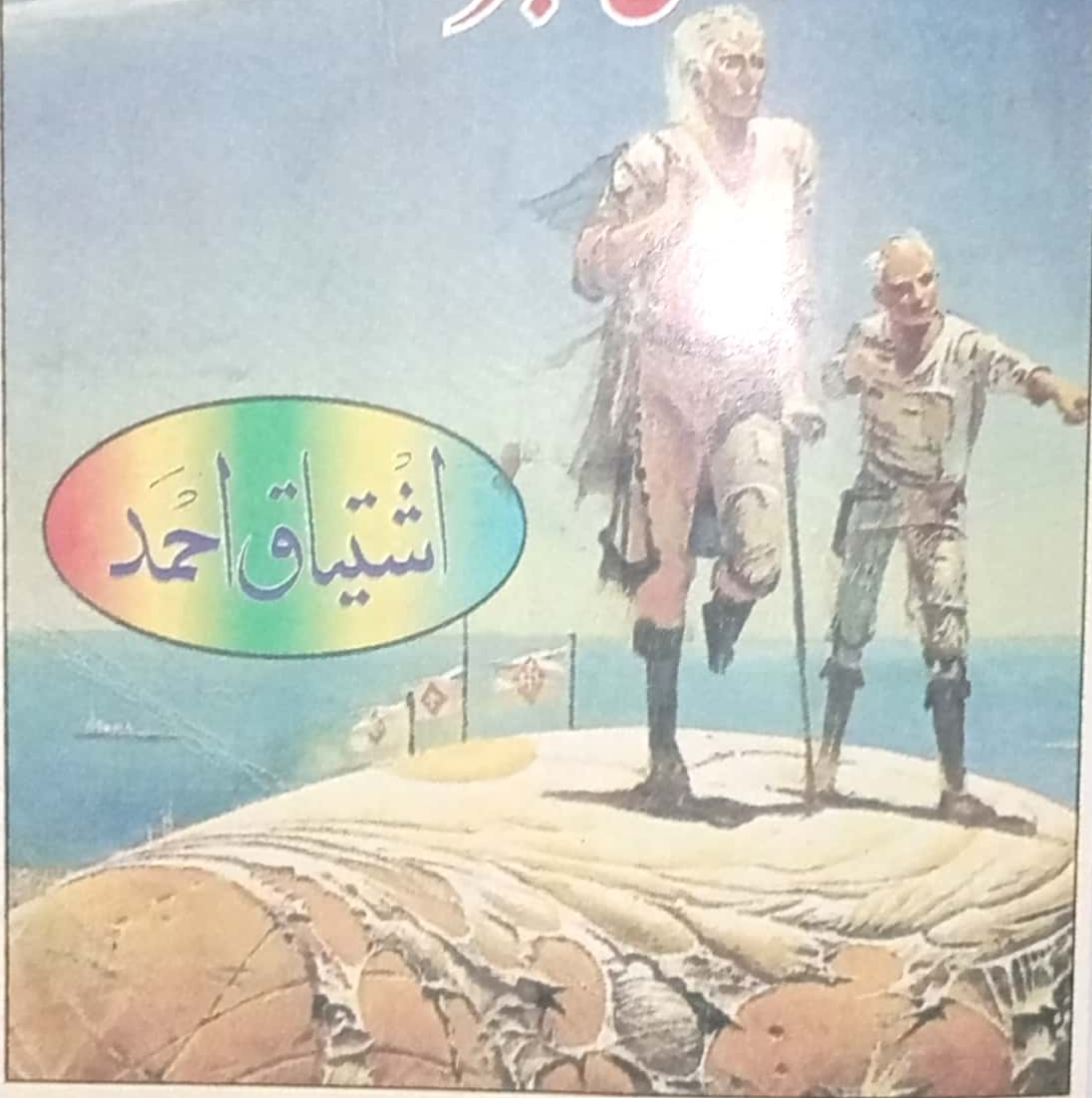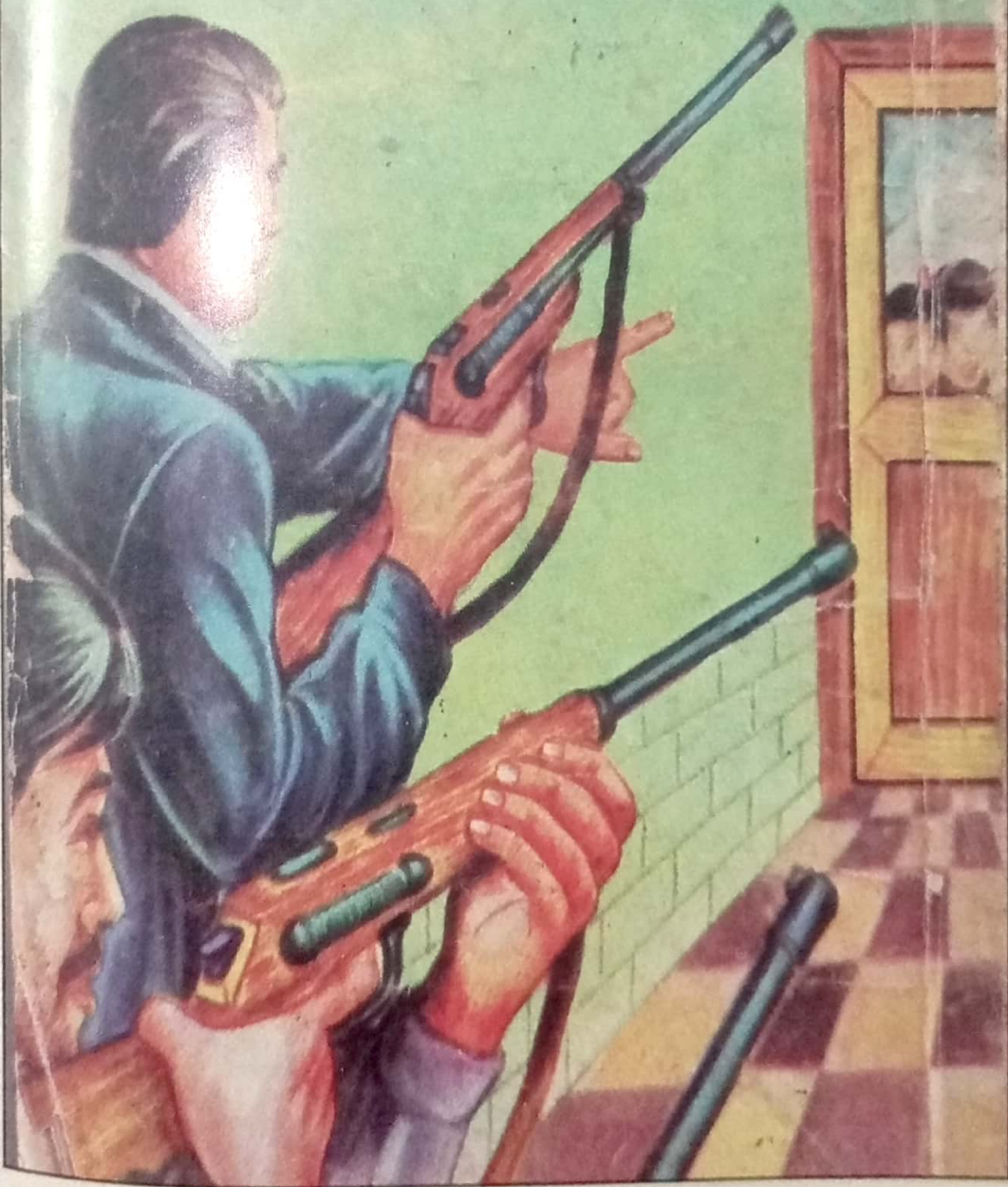
مکتبہ اقراء سے شائع ہونے والا پہلا ناول۔

''کیا کہا ... سو روپے کا نوٹ ۔'' وہ چلا اٹھا۔

''جی ... جی ہاں!'' میں گھبرا گیا ۔

''بس تو پھر... وہ اب نہ آیا ۔'' اس نے فوراً کہا ۔

''جی ... کیا مطلب ؟''

''بابو جی... یہ سارے چپل پچاس روپے کے بھی نہیں ہوں گے... اب اسے مل گئے ان کے سو روپے ... وہ بھلا کیوں آنے لگا ۔''

یہ سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ... آج تنخواہ ملی تھی اور میرے پاس وہی سو روپے تھے ... اب اگر وہ نہیں آتا تو میرے پاس تو گزر بسر کے لیے کچھ نہیں بچا تھا ... زمین و آسمان گھومتے محسوس ہوئے ... ہوش اڑ گئے ... ہاتھ پیر کانپنے لگے... کتنے ہی لمحے اس حالت میں گزر گئے اور پھر اچانک میں پرسکون ہو گیا... کیونکہ وہ مجھے آتا نظر آ گیا تھا ... میری جان میں جان آ گئی ... اوسان بحال ہو گئے ... اس نے نزدیک آ کر مجھے 97روپے واپس کیے ، میں نے گن کر احتیاط سے جیب میں رکھ لیے :

''مجھے تو ساتھ والے بھائی نے ڈرا ہی دیا تھا ... یہ کہہ رہے تھے... اب آپ نہیں آئیں گے۔ یہ تمام چپل پچاس ساٹھ روپے سے زیادہ نہیں ہیں ۔''

''کیا بات کرتے ہیں بابو جی... یہ سارے چپل کئی سو روپے کے ہیں ۔''

''اچھا شکریہ ۔'' میں نے فوراً کہا ۔

اور پھر میں چپل لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔

اس وقت تک زندگی میں کئی تبدیلیاں آ چکی تھیں ...میرے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا ... وہ چھ ماہ کی عمر میں فوت ہو گیا ... 71ء میں میری والدہ فوت ہو گئیں ... 71ہی میں میرے ہاں پہلی بچی پیدا ہوئی ... اور 72 ء میں مکتبہ عالیہ نے پیکٹ کا راز شائع کیا۔

اس وقت تک ڈاکٹر عبدالحکیم کھوکھر صاحب کی بھی ٹرانسفر ہو چکی تھی ... وہ

ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر لگ گئے تھے... گویا میونسپل کارپوریشن سے رخصت ہو گئے تھے ... ان کے بچے اب چونکہ بڑی کلاسز میں جا چکے تھے ... اس لیے وہاں پڑھانے کا کام ختم ہو گیا تھا ۔ البتہ میں ان سے ملاقات کے لیے کبھی کبھار چلا جاتا تھا۔

ماموں جان کی وفات کے بعد والد صاحب دکان پر اکیلے رہ گئے تھے... اس لیے انہوں نے چھوٹے بھائی اخلاق احمد کو اپنے ساتھ دکان پر بٹھانا شروع کر دیا ۔ اس سے بڑا بھائی اشفاق احمد اور اخلاق احمد سے چھوٹا بھائی آفتاب احمد ابھی اسکولوں میں تھے ... اور میں میونسپل کارپوریشن کی ملازمت سے تنگ آیا ہوا تھا ...

تو ان حالات میں اب میں ایمپریس روڈ پر واقع فیروز سنز کی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

سیڑھیاں ختم ہوتے ہی ایک بڑا سا کمرہ نظر آیا... اس میں کمرے کے درمیان میں ایک صاحب ہی بیٹھے نظر آئے۔ وہ کچھ لکھنے میں حد درجے مصروف تھے۔ میں نے خیال کر لیا ... یہی سعید لخت صاحب ہیں... میرے نزدیک پہنچنے پر بھی انہوں نے سر اوپر نہ اٹھایا ...آخر میں نے کھنکار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ... اب انہوں نے سر اٹھایا تو میں نے فوراً کہا :

’’ السلام علیکم ۔‘‘

’’ وع... وع... وعلیکم ... السلام ... فف... فف... فرمایئے ۔‘‘ انہوں نے بڑی طرح ہکلا کر کہا ۔

انہیں ہکلاتے دیکھ کر میں بے حد خوش ہوا ...خوش اس بات پر ہوا کہ وہ پہلے شخص تھے جو مجھ سے ہکلا کر بات کر رہے تھے ... گویا وہ مجھے دیکھ کر بوکھلا گئے تھے... اس پر میرا خون سیروں بڑھ گیا ... حوصلے نے سر ابھارا ... چنانچہ میں نے شیر ہو کر کہا :

’’مجھے سعید لخت صاحب سے ملنا ہے ۔‘‘

’’ فف ... فف... فرمائیے... مم... مجھ سے کیا کام ہے ... مم ... میں ہی سعید لخت ہوں۔‘‘ انہوں نے اور زیادہ ہکلا کر کہا ۔

’’ اوہو ... تو آپ ہی سعید لخت صاحب ہیں۔ بہت بہت شکریہ !‘‘ میں نے خوش ہو کر کہا ۔

’’کک... کس بب... بات کا شکریہ ؟‘‘ انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

ادھر میں حیران تھا کہ آخر سعید لخت صاحب مجھ سے اس قدر ہکلا کر بات کیوں کر رہے ہیں ... میرے چہرے میں انہیں ایسا کیا نظر آ گیا ہے ... کہ میرا رعب ان پر چھا گیا ہے یا پھر کیا میرا چہرہ اتنا خوفناک ہے ...لیکن اچانک میرا چہرہ اتنا خوفناک کیسے ہوگیا ... پہلے تو بالکل بھی خوفناک نہیں تھا ...ابھی میں یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے کہا :

’’ آپ نن نے بتایا نہیں۔‘‘

’’جی ... اس بات کا شکریہ کہ آپ نے مجھے سعید لخت صاحب سے ملوا دیا ہے ۔‘‘

میرا جملہ سن کر انہوں نے مجھے بہت تیز نظروں سے گھورا... شاید وہ سوچ رہے تھے کہ کس پاگل سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ آخر انہوں نے کہا:

’’ فف ... فرمائیے... آپ کو کیا کام ہے ۔‘‘

اس وقت تک مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ یہ صاحب ہکلے ہیں... یہ بات نہیں کہ مجھ سے ڈر کر ہکلا رہے ہیں ۔

’’ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر صاحب نے آپ کو فون کیا تھا ... میرا نام اشتیاق احمد ہے... ‘‘

’’ اچھ... چھا... تت... تو آپ مسودہ لے کر آئے ہیں ۔‘‘ ان کے لہجے میں غضب کی سختی آ گئی ... وہ مجھے سرد مہر لگے ...آنکھوں میں ناراضی کے

تاثرات جھلک اٹھے تھے ... جیسا کہ مسودہ ان کے پاس لا کر میں نے کوئی بہت بڑا جرم کر ڈالا ہو ... آخر انہوں نے سخت جھلائے ہوئے انداز میں کہا :

'' یہ ... یہ الماری دیکھی ہے ۔'' انہوں نے اپنے دائیں طرف کھڑی لوہے کی الماری کی طرف اشارہ کیا۔

'' جی ... جی ہاں ! ابھی ابھی آپ کے اشارہ کرنے کے بعد دیکھی ہے۔'' میں نے گھبرا کر کہا ۔

میرا جملہ سن کر ان کے چہرے پر اور زیادہ غصہ ابھر آیا ... موٹے شیشوں والی عینک میں سے مجھے گھورا ، پھر عینک کو دوبارہ ناک پر اچھی طرح جمایا، حالانکہ وہ پہلے ہی جمی ہوئی تھی ... پھر کہنے لگے:

''اس میں بڑے بڑے مصنفوں کے مسودے بھرے پڑے ہیں ...ابھی تو ان کی باری نہیں آئی ... اوپر سے آپ مسودہ اٹھا کر لے آئے ... پہلے بھی کبھی کچھ لکھا ہے ؟'' ان کے لہجے سے شدید نفرت ، غصہ اور جھلاہٹ ٹپک پڑی۔

ان حالات میں مجھے بھی غصہ آ گیا ... اس سے پہلے کہ میں بھی غصے سے بات کرتا ... کوئی سخت جواب انہیں دیتا... مجھے اچانک یاد آ گیا... غصہ حرام ہے، فوراً غصے کو پی گیا ... اور لہجے میں انتہائی نرمی لاتے ہوئے گویا ہوا :

'' جناب عالی میری بہت سی کہانیاں قندیل میں ، سیارہ ڈائجسٹ ، شمع کراچی، مجلس ، بیسویں صدی ، افسانہ ڈائجسٹ ، حور ، ادبی دنیا اور فنون وغیرہ میں چھپ چکی ہیں، بچوں کا ایک ناول 'پیکٹ کا راز' مکتبہ عالیہ نے ابھی چند ماہ پہلے شائع کیا ہے ... یہ کہتے ہوئے میں نے ناول ان کے سامنے رکھ دیا۔

انہوں نے ناول کو ایک نظر دیکھا ... لیکن ہاتھ نہ لگایا ... تاہم پہلے کی نسبت اب وہ نرم پڑ چکے تھے ... انہوں نے نرم انداز میں کہا :

'' اچھی بات ہے ... آپ مسودہ دے جائیں ... پندرہ دن بعد آ کر معلوم کر لیجیے گا ... میں اسے پڑھ کر دیکھ لوں ... اچھا لگا تو ہم ضرور شائع کریں

گے ، ورنہ آپ سے معذرت کرلیں گے۔''

'' جی بہتر !''

اب چونکہ انہوں نے معقول بات کہی تھی ... اس لیے میں بھی مطمئن ہو گیا... میں نے اٹھتے ہوئے ان سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے نکل آیا۔

واپسی پر یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اس جگہ کامیابی کی امیدایک فیصد بھی نہیں... یہاں تو بڑی الماری میں بڑے بڑے مصنفوں کے مسودے بھرے پڑے ہیں ...مجھ جیسے نئے لکھنے والے کی کیا دال گلے گی... میں بے چارہ ہوں کس کھیت کی مولی ... میرا تو کوئی نام بھی نہیں جانتا ... نہ میری کسی سے کوئی واقفیت ہے ... یہ سوچ کر دل برداشتہ ہوکر بیٹھ گیا اور سوچ لیا کہ پندرہ دن بعد چکر لگا لوں گا ... پھر وہ چاہے مسودہ واپس ہی کیوں نہ کر دیں۔''

پندرہ دن بعد پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا ، میں نے نہایت ادب سے کہا: '' السلام علیکم ۔''

'' انہوں نے عینک کے شیشوں میں سے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کوئی عجوبہ چیز نظر آئی ہو۔

'' جج... جی... فف... فرمائیے۔''

ان کی آنکھوں میں شنا سائی کی کوئی جھلک دور دور تک نظر نہیں آئی تھی ...اس کے باوجود میں نے کہا:

'' وہ میں پندرہ دن پہلے حاضر ہوا تھا ... ایک مسودہ دے گیا تھا ... میرا نام اشتیاق احمد ہے ...آپ نے فرمایا تھا ... پندرہ دن بعد آکر معلوم کر لیں ...سو میں پندرہ دن بعد حاضر ہوا ہوں۔'' میں نے انہیں یاد کرایا ۔

اب ان کی آنکھوں میں شناسائی نظر آئی۔ معذرت کے انداز میں بولے:

'' اوہ ہاں ! مجھے یاد آگیا ...بھئی بات دراصل یہ ہے کہ مجھے وقت ہی نہیں ملا مسودہ دیکھنے کا ...آپ ایسا کریں کہ پندرہ دن بعد آکر معلوم کر لیں ، اس

بار میں ضرور پڑھ لوں گا۔''

'' جی ... جی بہتر !'' میرے منہ سے مردہ سی آواز نکلی۔

ان کی بات سن کر سخت مایوسی ہوئی تھی اور ان پر غصہ بھی بہت آیا تھا ... لیکن میں اپنے غصے کا اظہار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا ... بس صبر سے گھونٹ بھر کر رہ گیا ... رنج اور غم نے میرا بڑا حال کر دیا تھا ... اب مجھے پندرہ دن تک انتظار کی سولی پر لٹکنا تھا ... پندرہ دن بعد بھی مجھے ذرا سی بھی امید نہیں تھی ۔ پندرہ دن بعد بھی اگر امید کی کوئی کرن جگمگا رہی ہوتی تو پندرہ دن کا مزید انتظار مشکل کام نہیں تھا۔

کام آسان تھا یا مشکل ... ایک ایک کر کے آخر پندرہ دن بھی گزر ہی گئے ... اور میں ایک بار پھر سعید لخت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا ... میں نے السلام علیکم کہا تو انہوں نے مجھے نظر بھر کر دیکھا... اس بار کم از کم انہوں نے یہ نہیں کہا :

'' آپ کون ہیں اور کس سلسلے میں آئے ہیں ۔''

بلکہ انہوں نے کہا : '' اوہ بھئی ! معاف کرنا ... میں ابھی تک آپ کا مسودہ نہیں پڑھ سکا ۔''

'' جی ... '' ان کے الفاظ نے گویا میری جان نکال دی۔

انہی دنوں چراغ علی انجم نے اپنے ایک دوست جلال کے ساتھ مجھ سے ملاقات کی تھی ... آپ کو یاد ہوگا چراغ علی انجم جھنگ کے رہنے والے میرے بچپن کے پڑوسی تھے۔ ہمارا تیسرا دوست نذیر تھا ... ہم نے مل کر ڈاکٹر یسٰین صاحب کو اپریل فول بنایا تھا ... یہ وہی چراغ علی تھے۔

'' ہم چند دوست ایک ماہنامہ پرچہ نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں ... آپ اگر ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں ... تو بہت ہی اچھا ہوگا ۔'' چراغ علی انجم نے کہا ۔

"جی اچھا ... مجھ سے جو ہو سکا ... تعاون کروں گا۔"

اس وقت تو وہ چلے گئے ... لیکن دو دن بعد انہوں نے پھر ملاقات کی ... اور دعوت دی کہ سیارہ سے فارغ ہو کر کہیں بات کر لیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا:

"ٹھیک ہے ... کوئی حرج نہیں۔"

اس طرح میری اور ان کی ملاقات ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی... اب انہوں نے کہا:

"آپ لوہاری میں رہتے ہیں جب کہ ہم نے سمن آباد میں ایک کوٹھی کرائے پر لی ہے ... ہم سب مل کر اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں ... لیکن اگر آپ ہمارے ساتھ رہ لیں تو ہم آپ سے کوئی کرایہ نہیں لیں گے ... بس آپ پرچے کے سلسلے میں ہماری مدد کریں ... ہمارا کام چل نکلا تو سب کی تنخواہ مقرر کر دی جائے گی۔"

میں نے سوچا ... ان کے ساتھ شامل ہونے میں کوئی نقصان نہیں... یہ کچھ مانگ تو رہے نہیں ... الٹا اچھے صاف ستھرے علاقے میں مفت رہائش دے رہے ہیں ... جب کہ لوہاری والی جگہ بہت تنگ اور گندی گلیوں میں ہے۔

یہ باتیں سوچ کر میں نے ان کی بات مان لی ... اور چند دن بعد میں سمن آباد میں واقع ان کی رہائش پر منتقل ہو گیا... یہ کل چار افراد تھے... پانچواں ان کے ساتھ میں شامل ہو گیا تھا... یہ واقعی ایک ماہنامہ رسالے کی تیاریاں کر رہے تھے ... اور اس سلسلے میں لکھنے والوں سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ اب یہ مجھے بھی ساتھ لے کر جانے لگے۔

مجھے یاد ہے... ان کے ساتھ میں نے مشہور شاعر احسان دانش صاحب سے بھی ملاقات کی تھی۔ احسان دانش بہت ہی بااخلاق انسان تھے ... انہوں نے اپنی غزل بھی رسالے کے لیے دے دی تھی ... بہرحال ان لوگوں کے ساتھ وقت

کچھ اچھا گزرتا محسوس ہونے لگا... جلد ہی ہم دوست بن گئے۔

ہمارے ایک ساتھی جلال کو فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا ... اور اسے چند فلموں میں چھوٹے چھوٹے دو رول ملے بھی تھے ... ایک پشتو فلم میں تو اسے ہیرو لے لیا گیا تھا ... لیکن وہ فلم درمیان میں ہی رہ گئی تھی...اس بات کا جلال کو بے حد رنج تھا... اس کا خیال تھا ... اگر اس کی وہ فلم مکمل ہو جاتی اور ریلیز ہو جاتی تو وہ ضرور جانا پہچانا ہیرو بن جاتا ... لیکن ایسا نہ ہو سکا ... رنگیلا نے بھی اپنی ایک فلم میں اسے ایک چھوٹا سا رول دیا تھا۔

غرض جن مشکلات سے ان دنوں میں گزر رہا تھا ... اسی قسم کی مشکلات نے انہیں گھیرے میں لے رکھا تھا ... اور سب کسی نہ کسی مشکل حالات کی کشتی کو کھے رہے تھے۔

پندرہ دن بعد میں پھر سعید لخت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اس مرتبہ صرف اتنا ہوا کہ انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور دیکھتے ہی کہہ اٹھے :

''بھئی معاف کرنا ... میں ابھی تک آپ کا مسودہ نہیں پڑھ سکا۔''

''جی ! '' ان الفاظ نے گویا میری جان نکل دی ...

ادھر انہوں نے کہا : '' آپ ایسا کریں کہ پندرہ دن بعد آئیں...اس بار میں ضرور پڑھ لوں گا۔''

ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی... یوں لگا جیسے سیڑھیاں نہیں اتر سکوں گا ... لیکن مرتا کیا نہ کرتا ... سی نہ کسی طرح گھر پہنچ گیا۔

رہ رہ کر سعید لخت صاحب پر غصہ آرہا تھا ... آخر میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اگر اب بھی انہوں نے یہی الفاظ کہے تو میں اپنا مسودہ واپس لے آؤں گا... کیونکہ اب اس چکر کو تقریباً چھ ماہ ہو چکے تھے ...

آخر پندرہ دن بعد پھر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا ... لیکن اس بار بہت حیرت انگیز بات ہو گئی ... سعید لخت مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے ...

نہایت گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا ... کہنے لگے:

'' بھئی واہ ! میں نے آپ کا مسودہ پڑھا... اور ایک ہی نشست میں پڑھا... آپ تو بہت اچھا لکھ لیتے ہیں ... ہم آپ کا یہ ناول 'آستین کا سانپ' شائع کریں گے... آپ ایسا کریں کہ اس کا بل بنا دیں۔ آپ کو اس کی ادائیگی کر دی جائے گی ۔''

'' جی !!!'' میرے منہ سے بہت لمبا 'جی' نکل گیا۔

مارے حیرت اور خوشی کے کچھ اور کہا بھی نہ گیا۔ کہاں تو وہ مسودہ پڑھ کر نہیں دے رہے تھے ، کہاں مسودے کا بل بنانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا :

'' کیا فرمایا آپ نے ... بل ... میں نے تو کبھی بل نہیں بنایا۔ میں کیا جانوں، بل کیسے بناتے ہیں۔''

یہ سن کر انہوں نے کہا :

'' اچھا خیر ... بل میں خود بنا لوں گا... ہم مسودہ کتابت کے لیے دے دیتے ہیں ... بل اس کے بعد بنتا رہے گا ...''

میرے دل پھر سے منوں بوجھ اترتا محسوس ہوا۔ اس سے پہلے سعید لخت صاحب کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا تھا ... اب وہ مجھے فرشتہ نظر آئے۔ یہ کس قدر انصاف کی بات تھی کہ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ میرا لکھا ہوا ناول آستین کا سانپ اس قابل ہے کہ اسے شائع کر دیا جائے...تو فوراً ہی اس بات کا اظہار کر دیا۔ اس سے پہلے چونکہ انہوں نے پڑھ کر دیکھا نہیں تھا ، اس لیے وہ مجھے پندرہ دن کی تاریخ دیتے رہے تھے۔ میں نے اٹھتے ہوئے ان سے پوچھا :

'' تو اب میں کب آؤں ۔''

'' آپ ایک ماہ بعد آجائیں ۔''

'' جی بہت بہت شکریہ !''

انہوں نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں وہاں سے چلا آیا ...

ایک ماہ بعد میں وہاں گیا تو سعید لخت صاحب وہاں نہیں تھے ... ان کی میز کرسی اور مسودوں والی سیف بھی غائب تھی ... میں بہت حیران ہوا ... ساتھ والے کمرے میں موجود حضرات سے پوچھا :

''یہ سعید لخت صاحب کہاں چلے گئے ہیں ۔''

'' مال روڈ والے شو روم میں منتقل ہو گئے ہیں ... وہیں ملیں گے۔''

'' اوہ شکریہ ۔''

میں شوروم پہنچا ... جس جگہ ڈاکٹر عبدالوحید صاحب سے ملاقات ہوئی ... اس کے بالکل برابر والا کمرہ اب سعید لخت صاحب کا تھا ... میں اس کمرے میں داخل ہوا تو وہ وہاں موجود تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی مسکرائے :

'' السلام علیکم ۔''

'' وعلیکم السلام ... آیئے آیئے ۔''

'' میں پہلے ایمپریس روڈ گیا ... اب ادھر آنا پڑا۔

'' ہاں! بس ان لوگوں کا اچانک ہی پروگرام بنا ... آپ کے مسودے کی کتابت ہو گئی ہے ... پورے ایک سو صفحات ہوئے ہیں ... تین روپے فی صفحے کے حساب سے آپ کا بل بنا ہے ... تین سو روپے ... یہ میں چٹ لکھ کر آپ کو دے دیتا ہوں... صدر دروازے کے ساتھ ہی الطاف صاحب بیٹھتے ہیں ... وہ ہمارے سیل منیجر ہیں... وہ آپ کو یہ تین سو روپے ادا کریں گے۔''

میں تین سو روپے کی بات سن کر دھک سے رہ گیا ... حیرت انگیز خوشی محسوس ہوئی... کیونکہ مکتبہ عالیہ نے تو صرف 50روپے دیے تھے... یہ معاوضہ ان سے چھ گنا تھا ... میرے نزدیک یہ بہت بڑی رقم تھی ... میں تو گویا ہواؤں میں اڑ رہا تھا ...

صدر دروازے کے پاس ایک صاحب بیٹھے نظر آئے... لیکن ان کے گرد

کئی لوگ کھڑے تھے اور وہ جلدی جلدی لوگوں کو فارغ کر رہے تھے ... آخر میری باری بھی آئی...میں نے چٹ انہیں دے دی ... انہوں نے چٹ پڑھ کر مجھے تین سو روپے دے دیے... بات کوئی نہیں کی... یہ ان سے میری پہلی ملاقات یعنی خاموش ملاقات تھی۔

تین سو روپے لے کر گھر آیا ...خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا ...گھر میں کہاں چین ملتا ... میں تو یہ خبر جلد از جلد دوسروں کو سنانا چاہتا تھا ... اب خبر سنانے کے لیے بھی لاہور میں ایک ہی گھر تھا ... موبائل ٹیلیفون کا دور تو تھا نہیں ...ان دنوں تو عام فون بھی بہت ہی کم نظر آتے تھے... دوسرے دن پہنچ گیا ... پھر خورشید کے گھر... وہ اپنے گھر آئی ہوئی تھی ... جاتے ہی بول اٹھا :

'' پتا ہے ... فیروز سنز نے میرے ناول کے کتنے پیسے دیئے ہیں۔''

'' پچاس روپے ہی دیئے ہوں گے ... نئے لکھنے والوں کو یہاں کون گھاس ڈالتا ہے ۔'' خورشید نے بُرا سا منہ بنایا ... روبی ہنس دی... ہنستے ہوئے وہ اور بھی خوبصورت نظر آتی تھی ۔

'' بے چارے کو بتانے بھی نہیں دیا اور اپنا خیال داغ دیا۔'' ماسٹر نذیر احمد آثم مسکرائے ۔

'' تین سو روپے ۔'' میں نے یک دم کہا۔

''کیا۔'' وہ سب ایک ساتھ چلا اٹھے ... ان کے چہروں پر خوشی اور حیرت دوڑ گئی ۔

'' میرے خیال میں اشتیاق یہ تمہاری پہلی بڑی کامیابی ہے ۔''

'آستین کا سانپ' چھپا تو میری خوشی کی حد نہ رہی ... سب سے پہلے ناول کھوکھر صاحب نے دیکھا ... وہ بہت خوش ہوئے۔ دوسرے دن خورشید اور ماموں کو دکھایا ... انہوں نے بھی ناول پڑھنے کے لیے رکھ لیا ۔

ادھر میں سوچ رہا تھا ... اب کیا کروں ... میں تو اس دوران ایک اور

ناول لکھ چکا تھا ... اس کا نام تھا ... شیشے کا بکس۔

یہ ناول انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کا تھا۔

ابھی میں یہ سوچ نہیں پایا تھا کہ اس ناول کا کیا کروں ... کہ خیال آیا ... پہلے سعید لخت صاحب سے ایک بار پھر بات کرتا ہوں...اگر چہ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اس قدر جلد ہم دوسرا ناول نہیں لے سکتے ... لیکن میں پھر بھی ان کے پاس چلا گیا ... وہ گرم جوشی سے ملے ... تب میں نے شیشے کا بکس کا مسودہ ان کے سامنے رکھ دیا:

''ایک اور ناول لکھا ہے... مہربانی فرما کر اسے بھی دیکھ لیں۔''

''اوہ! آپ اتنی جلدی ایک اور ناول لکھ لائے ... کمال ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر کہنے لگے:

''ہمارے ہاں ناول اتنی جلدی جلدی شائع نہیں ہوتے ... ابھی ابھی تو آپ کا پہلا ناول شائع ہوا ہے ... آپ اس مسودے کو اپنے پاس رکھیں ... چند ماہ گزر جانے دیں، پھر لائیے گا ... میں پڑھ کر دیکھ لوں گا۔''

میں ان کی بات سن کر مایوس سا ہو گیا ... دل پر بھاری بوجھ لیے وہاں سے لوٹ آیا ... چند ماہ کا انتظار میرے لیے مشکل ترین کام تھا ...

☆☆☆☆☆

O

دوسرے دن میں روزنامہ مشرق پڑھ رہا تھا ... ان دنوں پنجاب پبلک لائبریری چلا جاتا تھا ... وہاں اخبارات اوررسائل پر نظر ڈال لیتا تھا ... روزنامہ مشرق میں ایک جگہ لکھا ہوا نظر آیا: '' تبصرہ کتب ۔''

میں نے دیکھا ... بچوں کے تین ناولوں پر تبصرہ کیا گیا تھا ... ناول شائع کرنے والے ادارے کا نام شیخ غلام علی اینڈ سنز ... اس تبصرے کی سرخی یہ تھی:

'' شیخ غلام علی اینڈ سنز کے بچوں کے تین نئے ناول ۔''

میں بہت حیران ہوا۔ سوچنے لگا ... انہوں نے ایک دم تین ناول شائع کیے ہیں ... ہوسکتا ہے ... انہیں مزید ناولوں کی ضرورت ہو ...تو کیوں نہ چل کر شیشے کا بکس انہیں دکھایا جائے۔ دل نے اس خیال کو فوراً قبول کیا۔

اسی وقت مسودہ نکالا ... سائیکل پر بیٹھا اور پہنچ گیا بیرون لوہاری گیٹ ... اخبار میں یہی پتا درج تھا ... نعمت کدہ ہوٹل کے سامنے پولیس اسٹیشن تھا اور اس کے ساتھ شیخ غلام علی سنز کی اونچی سی عمارت تھی ... میں اس عمارت کے سامنے فاصلہ رکھ کر سڑک کے درمیان میں بنے فٹ پاتھ پر جا کھڑا ہوا ... میرے ایک ہاتھ میں مسودہ تھا ... مسودے کے ساتھ ہی میں پیکٹ کار از اور آستین کا سانپ بھی لے آیا تھا ... میں نے سوچا تھا ... ان لوگوں کو بتاؤں گا کہ میرے دو ناول شائع ہو چکے ہیں ... اس طرح ہوسکتا ہے ، وہ متاثر ہوجائیں اور میرا ناول پڑھنے کا ارادہ کر لیں۔

میں وہاں کھڑا یہ باتیں سوچتا رہا ... پھر خود سے کہنے لگا :

'' آخر میں کب تک یہاں کھڑا رہوں گا ... یہاں کھڑے رہنے سے حاصل کیا ہوگا ... مجھے دور سے شیشے کا دروازہ نظر آرہا تھا ... اس کے بعد کاؤنٹر پر دو حضرات بیٹھے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک بالکل گورے رنگ کے تھے، دوسرے بالکل کالے رنگ کے ...

میں نے اپنے طور پر یہ اندازہ لگایا کہ گورے رنگ والے ضرور مینیجر ہیں ... اب میں جی کڑا کر کے آگے بڑھا ... میں نے سائیکل دروازے کے باہر کھڑی کی ... وہاں اور بھی سائیکلیں کھڑی تھیں ... سائیکل کو تالا لگا کر میں دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا ...

کاؤنٹر پر اس وقت کچھ گاہک بھی کھڑے تھے ... میں ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ گورے صاحب موٹے تازے تھے جب کہ کالے صاحب دبلے پتلے ... البتہ کالے صاحب کا چہرہ ہنس مکھ سا تھا اور گورے صاحب حد درجے سنجیدہ تھے۔

چند منٹ بعد دونوں فارغ ہوگئے ... اس وقت تک میں یہ دیکھ چکا تھا کہ ان میں سے کالے صاحب کتابوں کے بل بنا رہے تھے ... دوسرے یعنی گورے رنگ والے رقم وصول کر رہے تھے ... اب میں آگے بڑھا۔ میں نے کہا:

'' السلام علیکم۔''

'' وعلیکم السلام۔'' دونوں ایک ساتھ بولے ... لیکن انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے کسی توجہ کے لائق نہ سمجھتے ہوں ... میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا :

'' یہ میرے پاس ایک مسودہ ہے ... بچوں کا ناول ہے جاسوسی ناول۔''

یہاں تک کہہ کر میں رک گیا ... اب وہ گورے رنگ کے صاحب گویا ہوئے :

'' مسودے تو جی ہمارے مینیجر صاحب دیکھتے ہیں ... وہ اس وقت کہیں گئے ہوئے ہیں ... آپ پھر کسی وقت آجائیے گا۔''

ان کا لہجہ روکھا پھیکا تھا ... وہ مجھے لفٹ کرانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے سوچا ... یوں کام نہیں چلے گا، چنانچہ میں نے لفافے میں سے دونوں ناول نکالے اور ان کے سامنے رکھ دیے:

''میرے یہ دو ناول چھپ چکے ہیں۔''

دونوں ناولوں پر نظر پڑتے ہی گورے رنگ والے نے ان کو اٹھا کر دیکھا...الٹا پلٹا... آستین کا سانپ پر فیروز سنز کا نام دیکھ کر ان کے چہرے کی سختی نرمی میں بدل گئی۔ اب انہوں نے کہا:

''ہمارے منیجر رب نواز ملک صاحب تھوڑی دیر تک آنے والے ہیں۔ آپ اندر چلے جائیں ... شیشے والا کمرہ ان کا ہے ... آپ وہاں تشریف رکھیں۔''

میں حیرت زدہ رہ گیا ... دل میں خوش بھی ہوا کہ چلو یہ صاحب تو متاثر ہوئے ... آخر میں نے کہا:

''بہت بہت شکریہ۔''

میں نے دونوں ناول اٹھائے اور اندر کی طرف چلا ...دکان کے بالکل آخر میں شیشے کی دیواروں والا کمرہ تھا ... اس میں داخل ہوا تو وہاں دو صاحبان پہلے سے بیٹھے نظر آئے ...منیجر کی کرسی خالی تھی ... ان دونوں کے ساتھ تیسری کرسی خالی تھی... میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا:

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ مجھ پر ایک نظر ڈالی اور پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے ...بعد میں پتا چلا ... ان میں سے ایک اے حمید اور دوسرے آغا اشرف تھے۔ اے حمید صاف ستھرے رنگ اور آغا اشرف سانولے رنگ کے تھے ... اور لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے تھے۔ وہ باتیں کرتے رہے ... میں اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا رہا... آخر تقریباً آدھ گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ایک صاحب اندر داخل ہوئے ...ان کے کندھے آگے جھکے ہوئے تھے... قد

درمیانہ تھا۔ رنگ سانولا ...ناک کافی لمبی اور آنکھیں بھورے رنگ کی تھیں... انہوں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا :

"السلام علیکم۔"

اے حمید اور آغا اشرف فوراً کرسیوں سے اٹھ گئے ... میں بھی اٹھ کھڑا ہوا ... منیجر صاحب نے ان دونوں سے نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا ... مجھ پر ایک نظر ڈالی، ہاتھ ملایا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے...

انہوں نے مجھ سے سرسری انداز میں ہاتھ ملایا تھا ...پھر وہ ان دونوں کا حال احوال پوچھنے لگے۔ ان سے دوسری باتیں کرنے لگے... میری توجہ ان کی باتوں کی طرف نہیں تھی ... میں تو اس انتظار میں تھا، کہ کب وہ مجھ سے پوچھیں ...ہاں آپ فرمائیں۔

اور یہ ... ہاں آپ فرمائیں ...کافی دیر بعد سننے کو ملا تھا :

"جی... فرمایئے۔"

"جناب! یہ میرے دو ناول شائع ہو چکے ہیں ... میرے پاس میرے تیسرے ناول کا مسودہ ہے... اگر آپ اسے دیکھنا پسند کریں۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے دونوں ناول ان کے آگے رکھ دیے ... انہوں نے پہلے پیکٹ کاراز پر نظر ڈالی ...پھر آستین کا سانپ دیکھا ... اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر قدرے حیرت ابھری ... کیونکہ فیروز سنز پبلشنگ کا بہت نامور ادارہ تھا ... انہوں نے پلکیں جھپکائیں ، پھر کہنے لگے :

"ناول کا مسودہ آپ ساتھ لائے ہیں۔"

"جی ہاں! یہ رہا۔" میں نے لفافے میں سے مسودہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ اب انہوں نے مسودے کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا ... ایک دو منٹ تک کہیں کہیں سے پڑھتے بھی رہے۔

آخر سر اوپر اٹھا کر میری طرف متوجہ ہوئے : "ہمارے ادارے کے

مالک ارشد نیاز ہیں ... میرا مطلب ہے، مالک کے بیٹے ہیں۔ ناولوں یا دوسری کتابوں کے مسودے وہ دیکھتے ہیں ... میں آج شام آپ کا مسودہ انہیں دے دوں گا ... آپ کے ان دو ناولوں کا ذکر بھی کروں گا ... وہ یہ دو ناول دیکھنا پسند کریں گے تو یہ بھی دکھادوں گا ... آپ مسودے کے ساتھ یہ دو ناول بھی چھوڑ جائیں۔"

جی بہت بہتر ! تو پھر اب میں کب آؤں ۔"

"دو تین دن بعد آجایئے گا ...امید ہے، ارشد نیاز صاحب اس وقت تک مسودہ پڑھ لیں گے ۔"

جب انہوں نے دو دن بعد کا کہا تو مجھے بہت حیرت ہوئی ... گمان گزرا کہ انہوں نے دو ماہ بعد کہا ہے ... کیونکہ سعید لخت صاحب تو پندرہ دن بعد آنے کے لیے کہتے رہے تھے اور یہ دو دن کا کہہ رہے تھے ، اس لیے میں نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا :

"جی... دو دن بعد ؟"

"ہاں! دو دن تو لگ ہی جائیں گے ۔"

"جی بہت بہتر ... میں دو دن بعد حاضر ہو جاؤں گا ۔"

یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا... ان سے ہاتھ ملایا... اور باہر نکل آیا... اس دوران آغا اشرف صاحب اور اے حمید صاحب نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ... ظاہر ہے، وہ اس وقت جانے پہچانے لکھنے والے تھے ... اور میں بالکل نوارد تھا ۔

دو دن بعد دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دونوں حضرات سے مصافحہ کیا ...اور اندر چلا گیا۔ رب نواز ملک صاحب آج بھی اپنے کمرے میں موجود نہیں تھے... اندر آغا اشرف اور ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

ایسے میں میں اندر داخل ہوا۔

میں نے السلام علیکم کہا تو آغا اشرف نے ایک اچٹتی نظر ڈالی اور وعلیکم السلام کہہ کر پھر ان خاتون سے باتیں کرنے لگے۔

میں تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

آخر خدا خدا کر کے ملک صاحب تشریف لائے۔ جونہی وہ اپنی کرسی پر بیٹھے، آغا اشرف نے اس خاتون کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔

معلوم ہوا، وہ خاتون ناول نگار تھی... اور اسی سلسلے میں آغا صاحب انہیں لے کر آئے تھے... ملک صاحب سنتے رہے اور سر ہلاتے رہے ... ابھی تک انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا... آخر ان کی نظریں مجھ پر پڑ ہی گئیں... انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا ... پھر کہنے لگے :

"آپ کا مسودہ ارشد نیاز صاحب نے پڑھ لیا ہے ... ناول انہیں بہت پسند آیا ہے ... چنانچہ مسودہ فوری طور پر کتابت کے لیے دے دیا گیا ہے ... امید ہے پندرہ دن تک اس کی کتابت ہو جائے گی ... آپ پندرہ دن بعد آجائیے گا... کتابت کے جتنے صفحات بنیں گے ،آپ کو ان کے حساب سے معاوضہ دے دیا جائے گا۔"

میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی ...

پندرہ دن بعد پھر وہاں پہنچ گیا۔ آج ملک رب نواز صاحب دفتر میں موجود تھے اور کوئی اور صاحب وہاں نہیں تھے... میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے السلام علیکم کہا۔

انہوں نے نظریں اٹھائیں ، پھر مجھ سے ہاتھ ملایا :

"آئیے... آپ کا مسودہ کتابت ہوگیا ... لیکن مسودہ یہاں نہیں ہے... لہٰذا مجھے معلوم نہیں کہ کتابت کے کتنے صفحات بنے ہیں ... میں شام کے وقت علمی پرنٹنگ پریس میں ہوتا ہوں ... یہ پریس ہسپتال روڈ پر واقع ہے اخبار مارکیٹ

کے ساتھ ہی ...آپ شام چار بجے وہاں آجائیں...ارشد نیاز صاحب دراصل وہیں بیٹھتے ہیں ... کتابت کے صفحات دیکھ کر آپ کو ادائیگی کر دی جائے گی۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا...

شام کو چار بجے پہنچ گیا علمی پرنٹنگ پریس۔ ملک صاحب اپنے دفتر میں موجود تھے ... ان کا دفتر علمی پرنٹنگ پریس کے اوپر والی منزل پر تھا۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان کی میز تھی ... وہ دبلے پتلے اور صاف ستھری رنگ والے نوجوان تھے... ملک صاحب نے پہلے تو مجھ سے ہاتھ ملایا...

پھر اس نوجوان سے کہنے لگے :

'' شاہ حسین! شیشے کا بکس کا مسودہ اور کتابت نکال دیں ۔''

'' جی اچھا۔'' انہوں نے فوراً کہا اور دونوں چیزیں میز کی دراز سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ انہوں نے کتابت کا آخری صفحہ دیکھا:

'' آپ کے ناول کے ایک سو باون صفحات بنے ہیں ...شاہ حسین ... دو روپے فی صفحے کے حساب سے بل بنا دو ان کا ۔'' انہوں نے کہا ۔

'' جی... دو روپے فی صفحہ ... فیروز سنز تو تین روپے فی صفحہ کے حساب سے دیتے ہیں ۔'' میں نے کہہ دیا ۔

'' ہاں! ان کا یہی ریٹ ہے ... لیکن ہم دو روپے فی صفحہ ہی دیتے ہیں... یہ نہیں کہ آپ کو دے رہے ہیں... سبھی کے لیے ہمارا ریٹ یہی ہے ۔''

'' جی اچھا ۔''

اتنی دیر میں شاہ حسین بل بنا چکے تھے ... ملک رب نواز صاحب نے اس پر دستخط کر دیے ۔

''یہ بل آپ شو روم سے لے لیں ... دلاوری صاحب سے ... وہی جو باہر کاؤنٹر پر بیٹھے ہوتے ہیں ۔''

'' جی اچھا! بہت بہت شکریہ ... کک... کیا ...'' میں کہتے کہتے رک

گیا... قدرے گھبرا گیا تھا۔

''ہاں ہاں! کہیے ...'' انہوں نے فوراً کہا۔

''آئندہ کے لیے کیا حکم ہے ... کیا میں کوئی اور مسودہ لے آؤں۔''

یہ کہتے ہوئے میں ڈرا اس لیے تھا کہ کہیں یہ بھی سعید لخت صاحب کی طرح یہ نہ کہہ دیں کہ ابھی نہیں ... ابھی تو آپ کا پہلا ناول شائع ہوگا ... پھر دیکھیں گے، لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔انہوں نے کہا:

''ہاں ہاں! ضرور لے آیئے۔''

میں بہت خوش ہوا۔ اب میں نے شو روم کا رخ کیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے بل گورے صاحب کو دیا۔ ان کا نام دلاوری صاحب تھا ... وہ کیشیئر تھے اور کالے رنگ والے غلام محمد صاحب تھے۔ وہ بل بناتے تھے۔

بل دیکھ کر دلاوری صاحب نے میری طرف حیران ہو کر دیکھا:

''بہت جلد آپ نے ادارے میں جگہ بنالی۔'' انہوں نے کہا۔

''جی بس! یہ سب اللہ کی مہربانی ہے۔''

اب چونکہ ملک رب نواز صاحب نے مجھے اور ناول لے آنے کے لیے کہا تھا اور میرے پاس کوئی ناول تیار نہیں تھا ...اس لیے گھر آکر چوتھے ناول پر کام شروع کر دیا اوراس قدر تیزی سے کام کیا کہ ناول صرف تین دن میں تیار ہو گیا۔ چوتھے ناول کا نام تھا ... تہ خانے کا راز۔

مسودہ لے کر ملک رب نواز صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے وہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''پہلے سے لکھ رکھا تھا۔'' انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

''جی نہیں... جس روز آپ سے شیشے کا بکس کے پیسے لے گیا تھا... اسی روز اس پر کام شروع کیا تھا...''

''حیرت ہے ... آپ صرف تین دن میں ناول مکمل کر کے لے آئے۔''

'' جی ہاں! اس پر مجھے بھی حیرت ہے۔''

'' خیر... میں یہ مسودہ بھی ارشد نیاز صاحب کو دے دیتا ہوں ... پہلے وہ پڑھ لیں... پھر بتاؤں گا۔''

'' جی اچھا!'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

تہ خانے کا راز مکمل کرنے کے چکر میں مجھے ماموں نذیر احمد صاحب کے گھر گئے ہوئے چار دن گزر گئے تھے۔ اب جو وہاں پہنچا تو خورشید گھر میں موجود نظر آئی ، لیکن روبی کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں تو خورشید نے مسکرا کر کہا :

'' کیا دیکھ رہے ہو بدھو میاں۔''

'' وہ ... روبی۔''

'' وہ تو چلی گئی۔''

'' کیا کہا ... چلی گئی ... کہاں چلی گئی۔''

'' اس کے والد صاحب آئے تھے ...وہ ساتھ لے گئے... دو دن یہاں رہے ،تم آئے ہی نہیں۔ ان کا اچانک بیرون ملک جانے کا پروگرام بن گیا ہے ... اب وہ بیرونی ملک ہی رہا کریں گے ... یعنی سب لوگ۔''

'' نن نہیں ... '' مارے پریشانی کے میرے منہ سے نکلا۔

'' کیوں ... اس میں پریشانی کس بات کی... کیا تمہاری ان کے پاس کوئی چیز تھی۔'' خورشید نے طنزیہ انداز میں کہا۔

میں نے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا ...اس وقت میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو تیز ہوتے محسوس کیا ...

سچ یہی ہے کہ وہ بہت اچھی لگی اس وقت مجھے۔

'' نہیں ... وہ تو یہاں کچھ نہیں بھول گئی۔'' میں نے جوابی وار کیا۔

'' اتنے اونچے نہ اڑو ... زمین پر آجاؤ۔'' وہ ہنسی۔

’’ لو آ گیا ... اور سنو ... شیخ غلام علی اینڈ سنز نے میرا ایک ناول لے لیا ہے ... بلکہ انہوں نے اس کا بل بھی دے دیا ہے۔‘‘

’’ سچ! ‘‘ خورشید کے منہ سے خوشی کے انداز میں نکلا۔

’’ یہ دیکھو ... تین سو چار روپے۔‘‘

’’ کمال ہے ... بہت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہو۔‘‘

’’ بس! یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں ہیں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

اس روز میں بہت اداس تھا ... روبی صاحبہ یوں اچانک چلی جائیں گی اور وہ بھی ملے بغیر ... یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ... اسے تو اس گھر میں چار سال رہنا تھا ... مجھے یوں لگا جیسے گھر میں آنے والا بہار کا جھونکا آ کر چلا بھی گیا ... کئی روز میں اداس رہا ... خورشید مجھے چھیڑتی رہی ... اس کے چھیڑنے پر میں مسکرا دیتا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

دو دن کے انتظار کے بعد میں پھر ملک صاحب سے ملا ... انہوں نے چھوٹتے ہی کہا :

تہ خانے کا راز بھی کتابت کے لیے دے دیا گیا ہے ... پندرہ دن تک اس کی کتابت ہو جائے گی۔‘‘

پندرہ دن بعد ملک صاحب کے پاس پہنچا ... انہوں نے دیکھتے ہی کہا :

’’ تہ خانے کا راز کی کتابت ہو چکی ہے ... آپ شام کو آ کر اس کا بل بھی لے لیں۔‘‘

’’ جی اچھا ... کک ... کوئی اور ... ‘‘ میں کہتے کہتے رک گیا ... ڈر سا لگ رہا تھا۔

’’ کہیے۔‘‘ انہوں نے میری طرف دیکھا۔

’’ کوئی اور ناول لے آؤں لکھ کر؟‘‘

’’ لکھتے جائیے ... اور دیتے جائیے ... ‘‘ انہوں نے گویا مجھے کھلی چھٹی

دے دی۔

میں پھول کر کپا ہو گیا...اس طرح میرا وہاں روز کا آنا جانا ہو گیا... ملک صاحب کے دفتر میں اکثر آغا اشرف اور اے حمید سے ملاقات ہو جاتی...

یہ حضرات بھی اپنے مسودوں کے سلسلے میں آتے جاتے تھے... مطلب یہ کہ یہ بھی بچوں کے لیے لکھ رہے تھے... لیکن یہ بہت پرانے لوگ تھے۔ ایک مدت سے ملک رب نواز صاحب سے منسلک تھے... اس لیے ان کی خوب عزت تھی... جب کہ میں بالکل نیا تھا... تاہم اب ملک صاحب مجھ سے بھی بہت گرمجوشی سے ملنے لگے... بلکہ اب تو چائے وغیرہ پلائے بغیر آنے ہی نہیں دیتے تھے... ایک روز میں نے ملک صاحب سے پوچھا:

''شیشے کا بکس کس اسٹیج پر ہے۔''

''بہت جلد چھپ جائے گا... بے فکر رہیں۔'' انہوں نے کہا۔

یہ بات میں نے اس لیے پوچھی تھی کہ انہیں اب تک میں چار ناول لکھ کر دے چکا تھا... لیکن شائع ابھی کوئی بھی نہیں ہوا تھا... اور مجھے انتظار تھا... کہ وہاں سے بھی ناولوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

اب جو ملک صاحب نے مجھے کھلی چھٹی دی... تو میں ہر چار دن بعد ایک ناول لکھ کر انہیں دینے لگا... جونہی کوئی ناول کتابت ہو جاتا... مجھے اس کے پیسے مل جاتے... گویا اب مالی حالت روز بروز بہتر سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔

دوسری طرف میونسپل کارپوریشن سے ڈاکٹر عبدالحکیم کھوکھر صاحب کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ ان کی جگہ نئے ہیلتھ آفیسر آ گئے تھے...اور میں ایک بار پھر پریشانیوں میں گھر گیا تھا... کیونکہ وہاں انہی لوگوں کی زندگی آسانی سے گزرتی تھی جن کے کسی بڑے آفیسر سے تعلقات ہوتے تھے... شیخ غلام علی اینڈ سنز سے ناولوں کا لیا جانا اگر میرے لیے خوشی کا اور اطمینان کا سبب تھا تو میونسپل کارپوریشن میں تبدیلیوں کی بنا پر الجھنیں بھی تھیں... رشوت والا مسئلہ الگ تکلیف دہ تھا... میں

چاہتا تھا ... کسی طرح کار پوریشن کی ملازمت چھوڑ دوں ... انہی دنوں میری ترقی ہو گئی اور میں سینٹری انسپکٹر بن گیا۔

لیکن انسپکٹر بن کر بھی مجھے سکون نہ ملا ... تنخواہ اب چھ سو روپے ہو گئی تھی ... 66روپے سے شروع ہونے والی تنخواہ چھ سو روپے تک پہنچ چکی تھی ... لیکن سکون نہیں تھا۔ اس وقت تک میرے ہاں تین بچے ہو چکے تھے ... بیوی بچوں کو میں نے جھنگ میں ہی رکھا ہوا تھا۔ اور ایسا والدہ کی وجہ سے تھا۔

والدہ کا خیال تھا ، اگر میں نے بیوی بچوں کو لاہور لے جا کر رکھ لیا تو پھر میں ان سے کٹ جاؤں گا ... میں نے ان کی زندگی تک انہیں کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا ... بیوی بچوں کو ان کے پاس ہی رکھا ... اب میں ہر پندرہ دن بعد جھنگ کا چکر لگا لیتا تھا۔

گھر والوں کو اب چونکہ میں ایک معقول رقم دینے لگا تھا، اس لیے سب خوش تھے ... جب جھنگ جاتا تو سب کے لیے بہت سے پھل اور کھلونے لے جاتا ...سب بہت خوش ہوتے ... جب لاہور کے لیے روانہ ہوتا تو بچے گلی کے موڑ تک چھوڑنے آتے اور دیر تک ہاتھ ہلاتے رہتے ... ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ... حالانکہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ میں دس پندرہ دن بعد پھر آجاؤں گا ... پھر بھی وہ اداس ضرور ہوتے ... زندگی اسی ڈگر پر چل رہی تھی ... اور آخر میونسپل کار پوریشن کی ملازمت چھوڑنے کے حالات بن گئے۔

ہوا یوں کہ ...ایک روز ملک رب نواز کہنے لگے :

" اس وقت تک آپ بارہ ناول لکھ کر دے چکے ہیں ...چند روز میں آپ کا ناول شیشے کا بکس چھپ جائے گا ... اس کے بعد آپ کے اکٹھے چار پانچ ناول آجائیں گے ... پھر باقی ناول بھی ایک دو ماہ تک آجائیں گے ... ارشد نیاز صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں ۔آپ شام کو علمی پرنٹنگ پریس آئیں... آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے گی ... وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں ۔"

"جی ... وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں ..." میں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! شام کو آجائیے گا۔"

اس وقت میں نے ایک خیال قائم کیا ... میں نے سوچا، میں انہیں دس بارہ ناول لکھ کر دے چکا ہوں ... اور ان لوگوں کو یہ سلسلہ رکتا نظر نہیں آرہا... اس لیے شاید یہ گھبرا گئے ہیں ... اور مجھے روکنا چاہتے ہیں... یہ خیال میرے لیے پریشان کن تھا، لیکن میں بھلا کیا کر سکتا تھا۔

شام کو چار بجے علمی پرنٹنگ پریس پہنچ گیا ... رب نواز ملک موجود تھے ... گرم جوشی سے ملے ... پھر کہنے لگے ... "میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر وہ اندرونی کمرے میں چلے گئے... ارشد نیاز ان کے پیچھے والے کمرے میں بیٹھتے تھے ... جلد ہی ان کی واپسی ہوئی ...انہوں نے کہا:

"آیئے ... ارشد نیاز صاحب سے ملواتا ہوں آپ کو۔"

میں ان کے ساتھ اندرونی کمرے میں داخل ہوا ... اس وقت میں نے پہلی بار ارشد نیاز کو دیکھا ... وہ بالکل نوجوان تھے ... آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک تھی ۔ شیخ نیاز احمد اس ادارے کے مالک تھے... علمی پرنٹنگ پریس بھی ان کا اپنا تھا۔ اس طرح یہ ایک بہت بڑا اشاعتی ادارہ تھا اور اس کا ایک نام تھا ... لیکن بہرحال فیروز سنز کے مقابلے کا نہیں تھا۔

ارشد نیاز نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور گرم جوشی سے بولے:

"آیئے!"

انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا ... میں اور ملک صاحب ان کے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے ... میں نے دیکھا ... ارشد نیاز بہت قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے... ان کا کمرہ بھی بہت شاندار تھا ... اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے سجا ہوا تھا ... اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد ملک صاحب نے کہا:

"یہ اشتیاق احمد ہیں۔"

'' اشتیاق احمد صاحب ! بہت خوش ہوئی آپ سے مل کر ... آپ بہت دلچسپ ناول لکھتے ہیں ... لیکن ہم چاہتے ہیں ...اب آپ کچھ عرصے کے لیے ناول روک کر ہمارے لیے چھوٹے بچوں والی کہانیاں لکھیں ... ہم ایک روپے اور آٹھ آنے والی کتابیں بھی شائع کرتے ہیں ... یہ دیکھیے ۔''

انھوں نے میز کی دراز سے بہت سی کتابیں نکال کر میرے سامنے پھیلا دیں۔ یہ کتب میں پہلے ہی نیچے دیکھ چکا تھا ... لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھے ناول لکھنے سے روک دیں گے اور یہ کام میرے ذمے لگائیں گے ... میں ناول لکھنے میں خوش تھا ... اس طرح یہ ملاقات میرے لیے خوشی کے بجائے، پریشانی لے کر آئی... میں نے گھبرا کر کہا :

'' تو کیا آپ ناولوں کا سلسلہ بند کر رہے ہیں۔''

'' یہ بات نہیں ... آپ سے تقریباً بارہ ناول لکھوا چکے ہیں ... اسی طرح اے حمید اور آغا اشرف بھی ناول لکھ کر دے چکے ہیں ، اس لیے اب ہم چاہتے ہیں... پہلے یہ ناول شائع ہو جائیں ... پھر آپ سے مزید ناول لکھوائے جائیں ... فی الحال آپ یہ چھوٹی کہانیاں لکھنا شروع کریں ۔''

'' جی اچھا ؟'' میں نے مرے مرے لہجے میں کہا ۔

اسی وقت چپراسی چائے اور بسکٹ کی ٹرے لے آیا تھا ... ہم چائے پینے لگے ... ارشد نیاز میری طرف بسکٹ بڑھاتے ہوئے بولے :

'' لیجیے !''

'' شکریہ ! یہ بتا دیں ... کتنی کہانیاں لکھ لاؤں ۔''

'' جتنی جی چاہے لکھ لائیں۔''

'' اچھی بات ہے ۔''

میری خوشی دھری کی دھری رہ گئی تھی ... میں چھوٹی کہانیاں لکھنے کے موڈ میں نہیں تھا ... ناول کیا شروع ہوئے تھے ، اب میں چاہتا تھا ... ناول ہی لکھتا

رہوں... لیکن کیا کر سکتا تھا ... مجبوری تھی۔ گھر آ کر کہانیاں شروع کر دیں ... ملک صاحب نے سائز اور صفحات کے بارے میں وضاحت کر دی تھی ... لہٰذا اس کے مطابق 25 کے قریب کہانیاں لکھ دیں ... وہ کہانیاں ملک صاحب کے حوالے کیں... انہوں نے ایک روپے والی کہانیاں چالیس روپے فی کہانی اور آٹھ آنے والی کہانیاں 20روپے فی کہانی کے حساب سے بل دلوا دیا ... لیکن میری خوشی اب بھی کافور تھی... ایسے میں ایک خیال آیا... سائیکل پر بیٹھا اور فیروز سنز پہنچ گیا۔ سعید لخت صاحب سے علیک سلیک ہوئی ... اس کے بعد میں نے کہا :

'' شیخ غلام اینڈ سنز اس وقت تک مجھ سے بارہ ناول لکھوا چکے ہیں ۔''

انہوں نے خوش ہو کر کہا :

'' اچھی خبر ہے بھئی... اور کیا چاہیے ۔''

'' لیکن اب انہوں نے مزید ناول لکھنے سے روک دیا ہے ۔''

'' وہ کیوں ؟''

'' اب وہ چھوٹی کہانیاں لکھوانا چاہتے ہیں...خیر ... وہ تو میں انہیں لکھ کر دے رہا ہوں ... آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ نے تو آستین کا سانپ کے بعد کوئی ناول لیا ہی نہیں... آپ بھی تو کوئی مسودہ لے لیں نا... اب تو کافی دیر ہو گئی ہے آستین کا سانپ کو چھپے ہوئے ۔''

'' ہوں! کوئی لکھا ہے ۔''

'' جی ہاں! ایک ناول تیار ہے ۔''

'' ٹھیک ہے ... وہ لے آیئے گا ۔''

'' لے آیئے گا کیا ... ساتھ لایا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

'' اچھی بات ہے ، دے دیں... میں پڑھ کر دیکھ لیتا ہوں ۔''

اس وقت انہیں جو ناول دیا ، اس کا نام چھپا رستم تھا... یہ انسپکٹر جمشید سیریز کا تھا ۔ انہوں نے مسودہ میز کی دراز میں رکھتے ہوئے کہا :

’’ آپ کے لیے ایک تجویز ہے ۔‘‘

’’ جی فرمائیے ؟‘‘

’’آپ ہمارے رسالے ماہنامہ تعلیم وتربیت کے لیے بھی تو کچھ لکھیے نا... بے شک اپنے ان کرداروں پر ہی جاسوسی کہانیاں لکھ لائیے ۔‘‘

تو کیا ... ان کہانیوں کا بھی معاوضہ دیں گے ۔‘‘ میں نے پوچھا ۔

’’ ہاں! کیوں نہیں ۔‘‘

’’ اچھی بات ہے ... لکھ دیتا ہوں ۔‘‘

گھر آ کر میں نے تعلیم وتربیت کے لیے ’ان کے کارنامے‘ کے عنوان سے ’پہلا کارنامہ‘ لکھا اور انہیں دے آیا ... انہوں نے فوراً ہی شائع کر دیا ... سعید لخت صاحب کے پاس گیا ... تو انہوں نے کہا :

’’ ایسے پانچ چھ کار نامے اور لکھ دیں۔‘‘

میں نے انہیں پانچ کہانیاں اور لکھ دیں ... یہ ان کے کار نامے کے نام سے شائع ہوئیں۔

ادھر سعید لخت صاحب چھپا رستم پڑھ چکے تھے... اور وہ انہیں پسند بھی آ گیا تھا لہٰذا اس کا معاوضہ بھی مل گیا ... ان کے کار نامے والی چھ کہانیوں کا معاوضہ بھی انہوں نے دے دیا ... لیکن مزید کوئی مسودہ فی الحال وہ بھی لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز کو 25 کہانیاں دینے کے بعد میں نے سلسلہ جاری رکھا... کیونکہ ارشد نیاز صاحب نے کہا تھا کہ جتنی جی چاہیں لکھ لائیں ... لیکن وہ اپنے اس قول کو نبھانہ سکے ... کیونکہ میں نے ایک ماہ میں انہیں سو کے قریب کہانیاں لکھ کر دے دیں ... اتنی کہانیاں دیکھ کر وہ گھبرا گئے ... اور کہنے لگے :

’’ اشتیاق صاحب! ذرا ہاتھ روک لیں ... ہمارے پاس بہت کہانیاں جمع ہو گئی ہیں ۔‘‘

’’جی ... جی اچھا۔‘‘

کام یک دم بند ہوگیا ... آمدنی کی جو نئی صورت پیدا ہوئی تھی ... وہ ایک دم رک گئی ... میونسپل کارپوریشن کی تنخواہ میرے اور میرے گھر والوں کے لیے اب ناکافی تھی ... اب میرا اپنا الگ خرچ تھا ... گھر کا کرایہ، بجلی کا بل اور کھانے پینے کے اخراجات ... اب میں پرانی انارکلی کے عبدالرحمٰن ہوٹل سے کھانا کھاتا تھا ... ان کا کھانا بہت اچھا تھا ... نان حلیم اور نان چنے مسلسل کھائے تھے... اب آسانی نصیب ہوئی تو وہاں کھانے لگا تھا ... گھر والوں کو بھی زیادہ پیسے دینے لگا تھا ... لیکن جب اچانک سلسلہ بند ہوا تو پریشان ہوگیا کہ اب کیا کیا جائے... جب سے اوپر تلے ناول لکھنے کا کام شروع ہوا تھا تو سیارہ ڈائجسٹ کی سو روپے کی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی ۔

ایک روز پریشانی کے عالم میں رب نواز ملک صاحب کے پاس گیا ...وہ موجود تھے اور تھے بھی تنہا ... میں نے بیٹھنے کے بعد کہا :

’’ملک صاحب! ناولوں اور کہانیوں کا کام تو آج کل بند ہو گیا ہے ... تو آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے کوئی اور دفتری کام دے دیں ... مجھے پروف ریڈنگ کا کام بھی آتا ہے ... آپ کے ادارے میں تو پروف ریڈنگ کا کام بہت ہوتا ہے...‘‘

ملک صاحب نے میری طرف دیکھا ... کچھ دیر سوچتے رہے... آخر انہوں نے کہا :

’’پروف ریڈنگ کی بات بعد میں کریں گے...ایک کام آپ کو دیتا ہوں... اگر آپ وہ کام کرسکیں تو کیا ہی بات ہے ... پھر آپ کو ہم بہت سا کام دے سکیں گے۔‘‘

’’فرمائیے... وہ کیا کام ہے ۔‘‘

’’ارشد نیاز صاحب کی کوئی ملنے والی خاتون ہیں ... انہوں نے ایک

رومانی ناول لکھا ہے ... ادارہ اس ناول کو چھاپنا چاہتا ہے ... لیکن وہ اس قدر طویل ہے کہ ہم اتنا ضخیم ناول شائع نہیں کر سکتے ... کیا خیال ہے ... کیا آپ اس ناول کو مختصر کر سکیں گے ... ویسے اس کے نصف حصے کی کتابت بھی ہو چکی ہے ... بقیہ نصف کو آپ کو پچاس ساٹھ صفحات میں ختم کرنا ہے ... ہم آپ کو اس کام کا معاوضہ بھی دیں گے۔"

"اس کے لیے پہلے مجھے سارا مسودہ پڑھ کر دیکھنا ہوگا ... پھر آپ کو کچھ بتا سکوں گا۔"

"چلئے ٹھیک ہے ... آپ ایک ہفتے تک اسے پڑھ لیں ... پھر مجھے آ کر بتائیے گا۔"

"جی بہتر۔"

میں نے مسودہ لیا اور گھر چلا آیا... اب میں نے اس ناول کو پڑھنا شروع کیا ... چار پانچ روز لگا کر پورا ناول پڑھ ڈالا ... وہ ایک خالص رومانی ناول تھا ... جیسا کہ اس دور میں رضیہ بٹ وغیرہ کے ناول چھپ رہے تھے ... میں نے اس کے پلاٹ پر غور کیا اور پہنچ گیا ملک صاحب کے پاس ... اتفاق سے وہ اس روز بھی اکیلے بیٹھے تھے ... مجھے دیکھتے ہی بولے :

"ہاں اشتیاق صاحب... کیا بنا اس ناول کا۔"

"جی میں نے وہ پورا پڑھ لیا ہے ... اور میں اسے مختصر کر سکتا ہوں۔"

"بس تو پھر ... دیر کا ہے کی ... کر ڈالیے ... ہم تو اس کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔" انہوں نے خوش ہو کر کہا۔

اور پھر میں نے اس ناول کو مختصر کر دیا۔

ملک صاحب کو دیا تو انہوں نے کہا :

"ارشد نیاز صاحب اسے چیک کر لیں ... پھر آپ کو معاوضہ دے دیا جائے گا، کیونکہ ہو سکتا ہے، وہ اس میں کوئی اور کمی بیشی کرانا چاہیں۔"

’’ جی کوئی بات نہیں ۔‘‘

اتنے میں چائے آ گئی ... ملک صاحب کے اخلاق میں یہ بات شامل تھی کہ جب بھی جاتا تھا ... چائے کے بغیر آنے نہیں دیتے تھے ... وہ خود بھی چائے پیتے تھے اور دوسروں کو بھی پلاتے تھے ... اس طرح انہیں دن میں نہ جانے کتنی بار چائے پینی پڑتی تھی۔

تین دن بعد ارشد نیاز نے میری کوشش کو کامیاب قرار دیا اور اس کام کا بھی انہوں نے معاوضہ دے دیا ... اب میں نے پھر کہا :

’’ پروف ریڈنگ والے کام کے بارے میں کیا خیال ہے ۔‘‘

’’شام کو علمی پرنٹنگ پریس آجائیں... میں دو چار مسودے آپ کو دلوادوں گا ۔‘‘

’’ جی بہت بہت شکریہ !‘‘ میں خوش ہو گیا۔

شام کو ان سے ملا ... تو انہوں نے شاہ حسین سے کہا :

’’ پروف ریڈنگ آج سے آپ نہیں کریں گے ... یہ کریں گے ... اس وقت جتنے مسودے موجود ہیں ... وہ انہیں دے دیں ... اس طرح آپ کا بوجھ کم ہو جائے گا۔‘‘

’’بہت بہتر !‘‘ شاہ حسین خوش ہو گئے ... ان کے ذمے پہلے ہی کئی کام تھے... وہ ادارے کے باقاعدہ ملازم تھے ... ان سے مسودے لے کر میں گھر آ گیا اور توجہ سے پروف ریڈنگ کرنا شروع کر دی ... دو دن میں کام مکمل ہو گیا ... تو شوروم پہنچ گیا اور مسودے ملک صاحب کو دے دیے۔ تب انہوں نے کہا :

’’ آپ نے ان سب کی پروف ریڈنگ کر لی ؟‘‘

’’ جی بالکل کر لی ۔‘‘

’’ ٹھیک ہے ... میں چیک کر لوں ... پھر آپ کو اس کا م کا معاوضہ ملے گا۔‘‘

’’کوئی بات نہیں … کوئی اور مسودہ ہوتو وہ دے دیں۔‘‘ میں نے کہا۔
’’نہیں … پہلے ان کو چیک کیا جائے گا۔‘‘
’’اچھی بات ہے۔‘‘
میں چلا آیا … پروف ریڈنگ کے دوران میں نے ایک کام یہ بھی کیا تھا کہ مصنفوں سے جو گرائمر کی غلطیاں ہوئی تھیں … انہیں بھی درست کر دیا تھا اور ان کی نشان دہی بھی کر دی تھی تاکہ ملک صاحب اس کام کو نوٹ کر لیں اور واقعی…اس کا بہت فائدہ ہوا…

ملک صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے خود بھی صفحات نکال نکال کر انہیں وہ جگہیں دکھائیں … کافی حد تک وہ خود بھی چیک کر چکے تھے۔ کہنے لگے:
’’اس میں شک نہیں کہ آپ نے بہت اچھی پروف ریڈنگ کی ہے … لہٰذا اب تمام مسودوں کی پروف ریڈنگ آپ ہی کیا کریں۔‘‘
’’بہت بہت شکریہ!‘‘ میں خوش ہو گیا۔
اب مجھے پروف ریڈنگ کا کام خوب ملنے لگا … اس کام سے اتنے پیسے تو نہیں ملتے تھے جتنے ناولوں سے ملتے تھے… لیکن کیا کر سکتا تھا … اسی کو غنیمت جانا اور کام کرتا رہا۔
ادارے نے ایک ماہنامہ رسالہ شروع کیا تھا۔
اس کا نام انہوں نے رکھا … جگنو …
جب میں ناول دینے جایا کرتا تھا …ملک صاحب نے مجھ سے خاص طور پر کہا تھا: ’’آپ جگنو کے لیے بھی کہانیاں لکھیں۔‘‘
’’جی اچھا … ضرور لکھوں گا۔‘‘
لہٰذا جگنو میں بھی کہانیاں چھپنے لگی تھیں … ادھر فیروز سنز کے رسالے تعلیم وتربیت میں بھی کہانیاں چھپ رہی تھیں … بس ناولوں کا سلسلہ فی الحال بند تھا … پروف ریڈنگ کا کام ملنے کی وجہ سے مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

ماہنامہ جگنو ... شیخ غلام علی اینڈ سنز نے ان دنوں ہی شروع کیا تھا جب میں پہلا ناول شیشے کا بکس لے کے گیا تھا ... انہی دنوں سے میں نے اس کے لیے بھی کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں ...اس طرح ایک سال گزر گیا ... یعنی پروف ریڈنگ کرتے ہوئے اور دونوں رسالوں کے لیے کہانیاں لکھتے ہوئے۔

تعلیم وتربیت میں ان کے کارنامے چھ عدد شائع ہو گئے تھے۔ سعید لخت صاحب نے ایک دن کہا:

''کیا خیال ہے... آپ کے یہ جو چھ کارنامے چھپے ہیں، انہیں کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔''

''ضرور کر دیں۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''لیکن آپ کو اس کا معاوضہ نہیں دیں گے ... کیونکہ کہانیوں کا معاوضہ آپ کو دے چکے ہیں۔''

یہ سن کر مجھے افسوس سا ہوا ... کیونکہ میرے خیال مین کتابی صورت میں شائع کرنے کا معاوضہ انہیں الگ سے دینا چاہیے تھا ... لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا ... حالات ہی ایسے تھے ... خاموش رہ گیا۔

اور انہوں نے 'ان کے کارنامے' کے نام سے چھ کہانیوں پر مشتمل یہ کتاب شائع کر دی۔ یہ 1974 کی بات ہے۔

☆☆☆☆☆

O

جگنو کے ایڈیٹر ایس ایم ناز صاحب تھے ... کہانی دینے جاتا تو ان سے علیک سلیک ہوتی رہتی تھی ... وہ بھی میری کہانیوں کو پسند کرتے تھے ... اور کہتے رہتے تھے ... کوئی اور کہانی لکھ دیں۔ اس طرح جگنو کی اشاعت کا ایک سال پورا ہوگیا ... ایک روز مجھے ملک رب نواز صاحب کا پیغام ملا ... پیغام انہوں نے چپراسی کے ذریعے بھیجا تھا ... میں نے رہائش ایک بار پھر تبدیل کرلی تھی ... اور اس کی وجہ یہ بنی تھی کہ آصف محمود کے بڑے بھائی محمد محسن صاحب لاہور آگئے تھے۔ ان کی والدہ بھی ان کے ساتھ لاہور آگئی تھیں اور انہوں نے کرشن نگر (اسلام پور) میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔

یہ مکان عمر روڈ پر شیخ اسٹریٹ میں واقع تھا۔ اس مکان میں ایک چھوٹی سی گیلری تھی ... آصف محمود کی والدہ نے کہا کہ اشتیاق کرائے کے مکان کے سلسلے میں پریشان رہتا ہے ... اسے یہ گیلری دے دیں ... وہ کچھ تھوڑا بہت کرایہ بھی آپ کو دے دیا کرے گا ... انہوں نے فوراً رضا مندی ظاہر کر دی تھی ... اور میں اس گیلری میں آگیا تھا۔

اس میں ایک چارپائی بچھانے کے بعد بس اتنی سی جگہ بچی تھی کہ میں مٹی کے تیل کے چولہے پر اپنا ناشتا تیار کر لیتا تھا... دوسری چارپائی کی بھی جگہ نہیں تھی۔ دن میں یہ چارپائی اٹھا کر زینے میں کھڑی کر دیتا اور گیلری میں دری بچھا کر اپنا کام کرتا رہتا ... اس گیلری سے بہت ہی زبردست یادیں وابستہ ہیں...

ابھی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

میں بات کر رہا تھا ... جگنو کے ایک سال پورے ہونے کے بعد کی... اسی گیلری میں ملک صاحب کا پیغام ملا تھا ... میں دوسرے دن صبح سویرے ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔

ملک صاحب موجود تھے اور ان کے چہرے پر غصے کے آثار تھے... میں ڈر گیا کہ پتا نہیں کیا بات ہے ... کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔

ملک صاحب مجھے دیکھتے ہی بولے: ''آپ سے ایک کام ہے۔''

''جی فرمایئے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''یہاں نہیں... آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے ... ارشد نیاز صاحب کے پاس، وہ بتائیں گے کام۔''

یہ سن کر مجھے حیرت سی ہوئی ... میں نے کہا:

''چلیے پھر۔''

وہ مجھے علمی پرنٹنگ پریس لے آئے... ارشد نیاز صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے... مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا:

''آیئے اشتیاق صاحب۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تھوڑے سے اوپر کو اٹھے... پھر مجھ سے ہاتھ ملایا ... میں نے محسوس کیا ... ان کے ہاتھ میں کافی گرمجوشی ہے۔

اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد ارشد نیاز نے کہا:

''اشتیاق صاحب! آپ کو پتا ہے ... ہم نے جگنو ایک سال پہلے شروع کیا تھا۔''

''جی ہاں! اچھی طرح معلوم ہے۔''

''اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کے ایڈیٹر ایس ایم ناز صاحب ہیں۔''

''جی ہاں! معلوم ہے ...''

'' لیکن اب ... ہماری ان سے کسی بات پر ان بن ہو گئی ہے ... انہوں نے جگنو کی ایڈیٹری سے استعفیٰ دے دیا ہے ، لہٰذا اب ہم چاہتے ہیں ، جگنو کی ایڈیٹری آپ قبول کر لیں۔''

'' کیا !!!'' میرے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

مارے حیرت کے میرا بڑا حال ہو گیا ... چھوٹی سی ایک کہانی ''بڑا قد'' سے ابتدا کرنے والا ایک معمولی سا انسان آج یہ سن رہا تھا :

'' ہم آپ کو جگنو کا ایڈیٹر رکھنا چاہتے ہیں ۔''

میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے کسی رسالے کی ایڈیٹری پیش کی جائے گی ... تقدیر عجیب کھیل کھیل رہی تھی ... مجھے تو ایڈیٹری کی الف ب بھی نہیں آتی تھی ... چنانچہ میں پریشانی کے عالم میں بولا :

'' معاف کیجیے گا جناب! میں ایڈیٹری ویڈری نہیں جانتا ... قطعاً معلوم نہیں کہ شمارہ کیسے ترتیب دیتے ہیں... اس کے لیے کیا کچھ کیا جاتا ہے ... میرا مطلب ہے ... یہ میرا کام نہیں ہے نہ میں کر سکوں گا۔''

ملک صاحب میری بات سن کر مسکرا دیے ... پھر انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا :

'' آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے ایس ایم ناز صاحب سے بات کر لی ہے ... وہ ابھی ایک ماہ یہاں رہیں گے ... آپ کو کام سکھاتے رہیں گے ۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے منظور ہے۔'' میں نے جواب دیا ۔

'' اگلا شمارہ ہے بھی سالنامہ ، لہٰذا ایس ایم ناز کے بغیر کام چلے گا بھی نہیں۔'' ارشد نیاز نے کہا ۔

'' جی ٹھیک ہے ... لیکن میں میونسپل کارپوریشن میں ملازم ہوں... میرے پاس دوپہر کے بعد کا وقت ہوتا ہے ۔''

'' کوئی حرج نہیں ... آپ دوپہر کے بعد آجایا کریں ... ناز صاحب بھی دوپہر کے بعد ہی آتے رہیں گے۔'' ملک صاحب نے فوراً کہا۔

'' جی اچھا!''

'' اب بات ہوجائے تنخواہ کی ...'' ارشد نیاز نے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔

'' جی ہاں... وہ تو ہے ... اشتیاق صاحب ... ہم آپ کو دو سو روپے ماہوار دیں گے۔''

''اچھی بات ہے ... مجھے منظور ہے۔''

'' ٹھیک ہے ... اب آپ جا سکتے ہیں... کل سے آپ ڈیوٹی پر آجائیں۔''

'' شکریہ جناب!'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے دن وہاں پہنچا ... ملک رب نواز صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے ... انہوں نے علیک سلیک کے بعد یہ پریشان کن خبر سنائی :

'' ایس ایم ناز صاحب نے ایک ماہ تک ٹھہرنے سے انکار کردیا اور وہ اپنا حساب لے کر چلے گئے۔''

'' کیا !!!'' مارے پریشانی کے میرے منہ سے نکلا۔

'' جی ہاں! یہی ہوا ہے۔''

'' لل ... لیکن ... اب کیا ہوگا ... مم مجھے تو اس کام کا بالکل پتا نہیں، شمارہ کس طرح ترتیب دوں گا ...ہے بھی سالنامہ ...یعنی دوگنا شمارہ۔''

مجھے حد درجے فکر مند دیکھ کر ملک صاحب نے کہا :

'' آپ گھبرائیں نہیں ... میں آپ کو سب سمجھا دوں گا ... سب سے پہلے تو آپ کو جگنو کے عملے سے ملوا دوں ... آیئے۔''

یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھے...

میں جگنو کے لیے جو کہانی لکھتا تھا ، وہ ملک صاحب کو دے آتا تھا اور وہ اسے ایس ایم ناز صاحب تک پہنچا دیتے تھے ...ایس ایم ناز صاحب سے بھی ملک صاحب کے کمرے میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔

اوپر جگنو کے دفتر میں چار پانچ میزیں الگ الگ موجود تھیں۔ ان پر چار آدمی کام کر رہے تھے ... پانچویں میز ... یعنی ایس ایم ناز صاحب کی میز خالی تھی۔ سیڑھیوں کے ساتھ ہی پہلی میز تھی ... اس پر ایک بالکل کالے بھجنگ آدمی بیٹھے تھے ... وہ موٹے جسم اور چھوٹے قد کے تھے۔ ان کے ہاتھ میں برش تھا اور وہ اس کی مدد سے کوئی تصویر بنا نے میں مگن تھے ... تاہم ملک صاحب پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم اٹھے اور انھوں نے ان سے ہاتھ ملایا :

''سلیم اختر صاحب ... یہ اشتیاق احمد ہیں ... جگنو کے نئے ایڈیٹر۔''

''جی ... جگنو کے ایڈیٹر۔'' سلیم اختر کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا ... ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ... ادھر ملک صاحب نے کہا :

''جی ہاں! اور اشتیاق صاحب ! یہ سلیم اختر ہیں... جگنو کے آرٹسٹ اور ہمارے ہاں سے شائع ہونے والے ناولوں اور دوسری کتب کے ٹائٹل تیار کرتے ہیں... آپ نے اب تک جتنے ناول لکھ کر دیے ہیں ... ان کے ٹائٹل بھی یہی بنا رہے ہیں۔''

''اوہ اچھا ...'' یہ کہہ کر میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کر دیا ... میں نے ان سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا ... لیکن ان کی طرف سے بہت ڈھیلا ڈھالا ہاتھ آگے آیا تھا اور انھوں نے بالکل بھی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا ... یہ بات محسوس کرکے مجھے حیرت ہوئی :

''آیئے ...''

اب وہ مجھے اگلی میز کی طرف لے چلے ...اس میز پر صاف رنگ کے دبلے پتلے سے آدمی بیٹھے تھے... ملک صاحب نے کہا :

"یہ جگنو کے آرٹ ایڈیٹر ہیں ... مطلب یہ کہ جگنو کی پینٹنگ کرتے ہیں ... اشفاق احمد ... آپ سن ہی چکے ہیں ... یہ جگنو کے نئے ایڈیٹر اشتیاق احمد ہیں۔"

اشفاق احمد نے ہاتھ آگے کر دیا ... میں نے ان سے مصافحہ کیا ... تو ان کے ہاتھ میں بھی گرمجوشی نہیں تھی ... بلکہ سلیم اختر سے بھی زیادہ سرد مہری تھی۔ رب نواز ملک صاحب تیسرے صاحب کی طرف بڑھے ... یہ صاحب سرخ و سفید رنگت کے تھے ... آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی سی تھیں، پیشانی خوب کشادہ تھی ... آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی ... ملک صاحب نے کہا:

"یہ نذیر ہاشمی صاحب ہیں ... جگنو کی کتابت ان کے ذمے ہے۔"

میں نے ان سے بھی ہاتھ ملایا، ان کے ہاتھ میں تو گویا جان ہی نہیں تھی ... ادھر ملک صاحب کہہ رہے تھے:

"اور آپ کو تو معلوم ہی ہے ... یہ اشتیاق احمد ہیں... میں آپ سے پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں۔ اب آپ سب لوگ مل کر سالنامے کی تیاری کریں ... اور اشتیاق صاحب... جو بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے، وہ بے دھڑک مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔"

"جی اچھا!" میں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

میرے لیے پریشانی والی بات یہ تھی کہ میں بالکل ناتجربہ کار تھا ... اس وقت صورتحال کچھ یوں تھی ... سالنامے کی تیاری، میری ناتجربہ کاری...اور تین حضرات کی سرد مہری ... یہ تینوں چیزیں گویا ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں، لہٰذا چکرا جانا ضروری تھا... یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ یہ حضرات ایس ایم ناز صاحب کے چلے جانے کی وجہ سے ناراض تھے ... انہیں ان کا جانا شاق گزرا تھا۔

آخر ایک سال سے ان کے ساتھ کام کر رہے تھے ... ایک سال تک کام کرنے کے دوران ان کے تعلقات دوستانہ ہو چکے تھے ... لہٰذا ان کا اس طرح

اچانک چلے جانا انہیں کیوں ناگوار نہ گزرتا ... لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا جبکہ اس وقت ان کی نظروں میں میں چبھ رہا تھا۔

اب یہ تینوں حضرات مجھ سے کسی قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں تھے ... میری مخالفت میں نذیر ہاشمی پیش پیش تھے ... انہیں ایس ایم ناز سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا۔ ایک دن تو انہوں نے جلے کٹے انداز میں یہاں تک کہہ دیا:

''ان پڑھ ایڈیٹر سے واسطہ پڑ گیا ہے۔''

اس وقت مجھے ان کا آن پڑھ ایڈیٹر کہنا بہت کھلا ... لیکن بعد میں جب حالات معمول پر آئے تو ان لوگوں سے دوستی ہوگئی تو میں خود بھی اپنے آپ کو ان پڑھ ایڈیٹر کہنے لگا تھا۔

آخر میں نے کمرِ ہمت باندھ لی ...

کام تو کرنا تھا ... ورنہ رب نواز ملک اور ارشد نیاز کہتے ... یہ کام اس کے بس کا نہیں... ہم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے ،لہٰذا میں نے ان سے بہت پیار اور محبت کا رویہ شروع کر دیا ... ان کی تعریف بھی کر دیتا ... اس طرح آخر چند ہی دنوں میں جمود کی کیفیت ختم ہوگئی ... اور دوستی کی فضا بحال ہوگئی۔

سالنامے کا کام خوب زور شور سے جاری ہوگیا۔

آخر سالنامہ شائع ہوگیا اور خوب دھوم دھام سے شائع ہوا ... سابقہ بارہ شماروں سے بہت بہتر ثابت ہوا۔ سالنامہ دیکھ کر اور پڑھ کر رب نواز صاحب نے مجھے بلایا ... کہنے لگے:

'' ہم آپ کے کام سے مطمئن ہیں... آپ کام جاری رکھیے۔''

'' جی شکریہ۔''

ارشد نیاز صاحب نے بھی بلایا ... انہوں نے کہا:

'' ہماری امیدوں سے بڑھ کر آپ نے شمارہ تیار کیا ... اب آپ جگنو کے ایڈیٹر پکے۔''

میں نے ان کی بات کے جواب میں اتنا ہی کہہ سکا: ''شکریہ جناب!''

اس دوران شیشے کا بکس، تہہ خانے کا راز وغیرہ شائع ہونے شروع ہو گئے ... میں نے شائع شدہ ناول دیکھے تو بے تحاشہ خوش ہوا، شاید مجھ میں بچپنا بہت تھا ... بچوں کی طرح خوشی محسوس کرتا تھا اور بچوں ہی کی طرح دکھ محسوس کرتا تھا۔ ساتھ ہی چھوٹی کہانیاں بھی شائع ہونے لگیں۔

اب ایک طرف میں جگنو تیار کرتا تھا ... دوسری طرف ان کی طرف سے ملنے والے مسودوں کی پروف ریڈنگ کرتا تھا ... ایسے میں ایک دن میری نظر ایک میز پر پڑی... اس میز پر بیٹھنے والے صاحب کئی روز سے نہیں آ رہے تھے... میں نے ان کے بارے میں ملک صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا:

''وہ ملازمت چھوڑ گئے ہیں۔''

''تب آپ اس میز والا کام بھی مجھے دے دیں۔''

انہوں نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا... اور کہنے لگے:

''اتنا کام کر لیں گے۔''

''اللہ نے چاہا تو ... آپ بتا دیں، اس میز پر کیا کام ہے۔''

''مسودوں کا اندراج ... یعنی جب کوئی مصنف کوئی مسودہ لائے تو آپ رجسٹر میں اسے درج کریں گے ... کتابت کے لیے آپ کاتب کو دیں گے تو رجسٹر میں درج کریں گے کہ کس کاتب کو دیا ہے ... کتابت کے بعد مسودہ واپس آئے گا تو آپ درج کریں گے کہ مسودہ کتابت ہو چکا ہے ... پروف ریڈنگ کے لیے جب مسودہ دیا جائے تو اس کا بھی اندارج کریں گے ... اگرچہ اب آپ خود پروف ریڈنگ کرتے ہیں... لیکن درج تو کرنا ہوا کرے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں... میں یہ سب کام کر لوں گا۔''

''اچھی بات ہے ... اس میز کے ہم آپ کو تین سو روپے دیا کریں گے۔''

''چلیے ٹھیک ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

اب اس کا مطلب یہ تھا کہ تین سو روپے اس میز کے ... دو سو روپے جگنو کی ادارت کے ... باقی پروف ریڈنگ کے ... یہ کل مل کر آٹھ سو روپے بن جاتے تھے... اور میرے لیے یہ انتہائی معقول آمدنی کی شکل تھی۔

میونسپل کارپوریشن کی ملازمت اب بری طرح چبھنے لگی تھی ... آخر ایک دن میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ بس... اب میونسپل کارپوریشن کی ملازمت چھوڑ دینی چاہیے ... اور میں نے اس پر عمل کر ڈالا... بس اچانک ہی وہاں جانا بند کر دیا ... نہ استعفیٰ دیا ... نہ اپنی ملازمت کے بقایاجات کا مطالبہ کیا ... وہاں جانا چھوڑ دیا۔

ادھر سے ایک دو بار نوٹس ملا کہ آپ ملازمت پر حاضر ہو جائیں... ورنہ آپ کو ملازمت سے فارغ کر دیا جائے گا ... جب میں نہ گیا تو انہوں نے آخری بار اخبار کے ذریعے بھی نوٹس دیا ... لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا اور اس طرح میں نے سینٹری انسپکٹر کی حیثیت میں یہ ملازمت چھوڑ دی۔

اب میں تمام دن شیخ علی اینڈ سنز کے دفتر میں کام کرنے لگا ... ان کی تین میزوں پر کام کر رہا تھا ... اور میرا خیال تھا، اب رب نواز ملک اور ارشد نیاز میرے کام سے بہت خوش اور مطمئن ہوں گے ... اس میں شک نہیں کہ وہ واقعی بہت خوش تھے ... اس بات کا اظہار انہوں نے کئی مرتبہ دبے لفظوں میں کیا تھا۔

لیکن پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا ... ایک روز رب نواز ملک صاحب نے مجھے بلایا... میں سیڑھیاں اتر کر ان کے کمرے میں داخل ہوا تو ان کا چہرہ غصے سے سرخ تھا ... میں پریشان ہو گیا کہ نہ جانے کیا ہوگیا ہے ... ڈرے ڈرے انداز میں کرسی پر جا بیٹھا ... وہ اس وقت کوئی خط لکھ رہے تھے ... خط مکمل کر کے انہوں نے نظریں اٹھائیں اور کہنے لگے :

''اشتیاق صاحب... آپ جگنو کی ایڈیٹنگ ٹھیک نہیں کر رہے۔''

میں دھک سے رہ گیا ... ان کی طرف سے یہ بات سننے کو ملے گی، یہ تو

میں نے کبھی ایک پل کو بھی نہیں سوچا تھا۔

''میں سمجھا نہیں ۔''

''آپ کو ایڈیٹری آتی ہی نہیں ۔'' انہوں نے فوراً کہا۔

مارے غصے کے میرا بُرا حال ہوگیا ... میں نے ان سے کہا :

''ایک سال پہلے جب آپ نے جگنو کی ایڈیٹری میرے حوالے کی تھی ... تو میں نے تو اس وقت صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے یہ کام نہیں آتا ... آپ ہی نے کہہ دیا تھا ... کوئی بات نہیں ... ہم لوگ سکھا دیں گے ... تو اب ایک سال بعد اچانک کیا ہوگیا ۔''

''بس کچھ نہیں ہوا... آپ اسی وقت اپنا حساب کاؤنٹر سے لے لیں اور چلے جائیں ... اوپر اگر آپ کا کوئی سامان ہے تو وہ لے سکتے ہیں۔''

میری حالت اس وقت عجیب تھی ... زندگی میں اس قدر دکھ بھرے اور عجیب ترین لمحات بہت کم آئے ہوں گے ... حیران بھی بہت تھا کہ یکا یک انہیں ہو کیا گیا ... یہ تو ہر بار کہتے تھے ... پرچہ سیٹ جا رہا ہے ... پروف ریڈنگ کے کام میں بھی کوئی خامی نہیں نظر آ ئی تھی ... مسودوں والی میز کا کام بھی بالکل درست تھا ... غرض میری کوئی غلطی دور دور تک نہیں تھی ۔

اب مجھے بے تحاشہ غصے نے آلیا... میں خود پر قابو نہ پا سکا ... ایک جھٹکے سے اٹھا اور شوروم سے باہر نکل آیا... یعنی اپنا حساب بھی نہ لیا ... سائیکل اٹھائی اور گھر آگیا ... میرا دماغ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

میں میونسپل کارپوریشن کی ملازمت پہلے ہی چھوڑ چکا تھا اور اب شیخ غلام علی اینڈ سنز والا سارا کام چھوٹ گیا تھا... یعنی یکدم چودہ پندرہ سو روپے کی آمدنی رک گئی تھی ... میں پریشان نہ ہوتا تو کیا کرتا...

☆☆☆☆☆

O

رنج اور غم سے کہیں زیادہ مجھے حیرت تھی کہ آخر ان لوگوں کو یکا یک یہ ہو کیا گیا ہے ... لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس راز سے ملک رب نواز پردہ اٹھا سکتے تھے لیکن وہ بھلا ایسا کیوں کرتے۔

پریشان تو میں ضرور تھا لیکن بہت زیادہ پریشانی اس لیے نہیں تھی کہ جیب میں اس وقت کئی سو روپے تھے۔

ان حالات میں مجھے سعید لخت صاحب یاد آ گئے ... جونہی انکا خیال آیا میں نے سائیکل اٹھائی اور فیروز سنز کے شوروم پہنچ گیا ... سعید لخت صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے :

'' السلام علیکم لخت صاحب ۔'' میں نے کوشش کر کے کہا ۔

'' وع ... وعلیکم السلام ! ارے آپ ہیں ،آیئے آیئے۔'' انہوں نے گرمجوشی سے کہا ۔

'' لخت صاحب مجھے شیخ غلام علی اینڈ سنز سے جواب مل گیا ہے اور میونسپل کارپوریشن کی ملازمت میں نے حال ہی میں خود چھوڑی ہے ... اس طرح اب میں بالکل بیکار ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر مجھ سے کوئی مسودہ لکھوا لیں۔''

سعید لخت صاحب نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا ... پھر سوچ میں ڈوب گئے۔ آخر کافی دیر بعد انہوں نے کہا:

'' ان دنوں ہم کوئی مسودہ نہیں لے رہے ... ہاں ایک کام ہے ... اگر

آپ کر سکیں۔''

''جی فرمائیے، میرے بس کا ہوا تو ضرور کروں گا۔'' میں نے فوراً کہا۔

انہوں نے کوئی جواب دیئے بغیر میز کی دراز میں سے ایک کتاب نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے دیکھا ... وہ کوئی انگریزی کتاب تھی ... میں نے پڑھا، اس پر لکھا تھا:

''ایمیزن ایڈونچر!''

وہ کوئی انگریزی ناول تھا ... اب سعید لخت صاحب نے کہا:

''یہ بچوں کا انگریزی ناول ہے ... آپ اس کا ترجمہ کر لائیں ... ناول کے ریٹ کے مطابق آپ کو اس کی ادائیگی کر دی جائے گی۔''

''ترجمہ!'' میرے منہ سے مارے حیرت اور خوف کے نکلا ... کیونکہ میں نے تو زندگی میں کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا تھا ... نہ کبھی ایسی بات سوچی تھی ... زندگی میں یہ خیال بھی کبھی نہیں آیا تھا کہ مجھے ترجمہ کرنے کے لیے کہا جائے گا۔''

''ہاں! ترجمہ کر کے لے آئیں ... لیکن لفظی ترجمہ نہ ہو ... بامحاورہ ترجمہ ہو۔''

میں سوچ میں ڈوب گیا ... جیب بالکل خالی ہونے والی تھی ... اور پیسوں کی انتہائی ضرورت تھی۔ آخر میں نے کہا:

''جی ٹھیک ہے ... ترجمہ کر لاتا ہوں۔''

''ہاں! یہ ہوئی نا بات۔''

میں ناول گھر لے آیا ... میں نے اسے پڑھنے کی کوشش کی... جلد ہی میں نے محسوس کرلیا کہ ناول مکمل طور پر سمجھ میں نہیں آئے گا ... اب تو میں بہت چکرایا ... اب کیا کروں ... ناول واپس کرتا ہوں تو سعید لخت صاحب کیا سوچیں گے ... ترجمہ کروں تو کیسے ... سوچ سوچ کر میں ایک دوست کے پاس گیا... وہ

بی اے تھا ... میں نے اس سے کہا : '' دوست ! میری تھوڑی سی مدد کر دو ۔''

'' وہ کیا ۔'' اس نے پوچھا۔

میں نے ناول اس کے سامنے رکھ دیا :

'' اس کا ترجمہ کرنا ہے ... فیروز سنز مجھے معاوضہ دیں گے ... اس میں سے نصف تمھیں دوں گا ... نصف اس لیے درست اردو میں تو میں ہی ڈھالوں گا... تم تو بس لفظی ترجمہ کر دو ۔''

'' اوہ ... لیکن میں نے تو یہ کام کبھی نہیں کیا ۔''

'' تو کیا ہوا ... آخر بی اے ہو ... تمہارے لیے یہ کیا مشکل ہے ۔''

''خیر تم ناول چھوڑ جاؤ ، میں کوشش کرتا ہوں ...کل آنا ...معلوم ہو جائے گا کہ یہ کام میں کر سکوں گا یا نہیں ... ظاہر ہے ، پہلے اسے پڑھ کر دیکھنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے ۔''

میں وہاں سے چلا آیا ... دوسرے دن گیا تو اس نے پہلے صفحے کا نصف ترجمہ کیا تھا اور میرے خیال میں بہت اوٹ پٹانگ کیا تھا ... اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا : ''نہیں بھئی... یہ کام میرے لیے بہت مشکل ہے۔''

مجھے اس پر غصہ تو آیا، لیکن کیا کہتا ... ناول لے کر گھر آیا ... میں نے سوچا... جیسے بھی ہو ... اس کا ترجمہ تو کرنا ہی پڑے گا ... اس کے بعد ترجمے والا کام نہیں لوں گا۔

اب میں ناول لے کر بیٹھ گیا ... اردو انگریزی لغت پاس رکھ لی ... جو لفظ سمجھ میں نہ آتا ... اس کا معنی دیکھ لیتا ... اس طرح آخرکار میں ترجمہ کرتا چلا گیا ... اور ایک ہفتے کی سخت مشقت کے بعد ترجمہ مکمل کر کے سعید لخت کے پاس جا پہنچا ...وہ چھوٹتے ہی بولے: '' کر لیا ترجمہ ۔''

'' جی ... جی ہاں ! کر لیا۔''

'' بس ٹھیک ہے ... یہ مجھے دے دیں ... میں پڑھ کر دیکھ لوں ... اس

کا دوسرا حصہ لیتے جائیں ... اب اس پر کام شروع کر دیں ۔''

''جی... دوسرا حصہ؟'' میں نے بوکھلا کر کہا ... کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کتاب کا کوئی دوسرا حصہ بھی ہے... کہانی تو اس حصے میں ختم ہو گئی تھی...اب انہوں نے بتایا:

'' کہانی اس حصے میں بے شک ختم ہو گئی ہے... لیکن اس قسم کی مہمات کے پانچ حصے اور ہیں اور ہمیں وہ سب ترجمہ کروانے ہیں ۔''

میری سٹی گم ہو گئی ... میں نے کہا:

'' نہیں جناب! یہ کام میرے بس کا نہیں ... مجھے کافی دقت پیش آئی ہے... باقی پانچ آپ کسی اور صاحب سے کروا لیں ۔''

'' اچھا خیر... آپ کو اس کا معاوضہ مل جائے گا ... دو تین دن بعد آجائیں، میں اس وقت تک پڑھ لوں گا۔''

'' جی ٹھیک ہے ۔''

دو تین دن بعد میں گیا تو انہوں نے معاوضہ کی چٹ بنا دی ... اور کہنے لگے: '' الطاف صاحب سے لے لیں ۔''

'' شکریہ... مہربانی فرما کر میرے لیے اور کام نکالیں... دو چار ناول مجھ سے لکھوالیں ۔''

'' ہمیں ان دنوں مسودوں کی ضرورت تو نہیں ، کیونکہ پہلے ہی بہت سے قابل اشاعت مسودے موجود ہیں ، یعنی ابھی تو ان کی باری نہیں آئی ... اور لے کر کیا کریں گے ... لیکن آپ کے حالات کے پیش نظر آپ سے کچھ لکھوا لیتے ہیں... آپ ایسا کریں کہ پانچ حصوں پر مشتمل ایک سیریز لکھ لائیں ... ہر حصہ 144 صفحات سے زیادہ کا نہ ہو۔''

ان کی بات سن کر میں بے حد خوش ہوا ... میں نے فوراً کہا:

'' بہت بہت شکریہ !آپ کا یہ احسان میں یاد رکھوں گا۔''

'' نن ... نہیں ... کک... کوئی بات نہیں ۔'' انہوں نے جلدی سے کہا۔

اور میں خوش کیوں نہ ہوتا ،سعید لخت صاحب نے اچانک سولہ سترہ سو روپے کا کام دے دیا تھا ... اور یہ میرے لیے ان حالات میں بہت کچھ تھا ... اللہ کا شکر ادا کیا ، گھر آیا اور ناول پر کام شروع کر دیا ... پہلا حصہ مکمل ہوا ... اس کا نام 'یشوما اور سرخ تیر' رکھا ... اور پہنچ گیا سعید لخت صاحب کے پاس ... مسودہ انہیں دکھاتے ہوئے میں نے کہا :

'' اس سیریز کا پہلا حصہ مکمل ہو گیا ... یہ آپ رکھ لیں اور پڑھ کر بھی دیکھ لیں...میں باقی حصے بھی مکمل کر کے لے آتا ہوں... فی الحال اگر آپ اس مسودے کی ادائیگی کروا دیں تو بہت اچھی بات ہے ۔''

وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئے ... آخر انہوں نے کہا:

'' آپ ایسا کریں... کہ پانچ کی بجائے چار حصے میں اسے مکمل کر لیں اور میرے پاس لے آئیں... آپ کو ان کی اکٹھی ادائیگی ہوگی ... یہ حصہ بھی آپ فی الحال اپنے پاس ہی رکھیں ۔''

''جی اچھا۔'' میں نے قدرے پریشان ہو کر کہا ...کیونکہ ان دنوں پیسوں کی شدید ضرورت تھی ... اور اسی ضرورت کے تحت میں پہلا حصہ ان کے پاس لے آیا تھا ، لیکن اب کیا کر سکتا تھا۔

گھر واپس گیا اور دوسرے حصے پر کام شروع کر دیا... دوسرا حصہ سات آٹھ دن میں تیار ہو گیا تو تیسرے حصے پر کام شروع کیا ... اور اس طرح چوتھا بھی مکمل ہو گیا ... ان حصوں کے نام یہ تھے ... یشوما اور سرخ تیر ، سرخ تیر کا شکار ، سرخ تیر کے قیدی اور سرخ تیر کی وادی ہیں۔

چار حصے لے کر پھر سعید لخت کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ انہوں نے مسودے تو لے لیے... لیکن کہنے لگے :

'' ڈاکٹر صاحب ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کے آنے پر ہی

آپ کو بل ملے گا۔"

ایک بار پھر مجھے ایک زبردست دھچکا لگا ... مایوسی مجھ پر پھر حملہ آور ہوئی اور کاری ضرب لگا گئی۔ مجھے تو امید تھی ... دو چار دن میں ہی سعید لخت صاحب بل دلوا دیں گے ... کیونکہ حالات کا رونا میں پہلے ہی ان کے سامنے رو چکا تھا لیکن وہ بھی کیا کر سکتے تھے۔ ضابطے کے خلاف مجھے ادائیگی تو نہیں دلوا سکتے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب کب تک آجائیں گے۔"

"پندرہ بیس دن لگ جائیں گے۔"

یہ سن کر میں اور بھی فکرمند ہو گیا ... گویا اب پندرہ بیس دن کا انتظار کرنا تھا ... مرتا کیا نہ کرتا ، ان کا شکریہ ادا کر کے نکل آیا ... بہرحال انہوں نے مجھ پر مہربانی کی تھی ... ورنہ وہ تو کہہ سکتے تھے کہ مسودوں کی ضرورت ہی نہیں ہے ... تو کیسے لکھوائیں آپ سے۔"

پندرہ دن کا انتظار بہت جان لیوا ثابت ہوا ... ایک ایک دن گن گن کر گزارا ... آخر بیس روز بعد فیروز سنز کے شو روم میں پہنچ گیا۔ اب سعید لخت صاحب نے نئی سنائی :

" ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں ... میں نے ان کے سامنے یہ چاروں مسودے رکھے تھے اور درخواست کی تھی کہ ان کی ادائیگی کر دی جائے ... لیکن ۔"

یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گئے ۔

" لیکن کیا ۔" میرا دل زور سے دھڑکا۔

انہوں نے مجھے نظر بھر دیکھا ... میں پہلے ہی ان کی طرف دیکھ رہا تھا ... ان کی آنکھوں میں میرے لیے غم تھا ... ہمدردی تھی ... آخر ان کے ہونٹ ہلے:

" انہوں نے کہا ہے ..." وہ کہتے کہتے رک گئے ... شاید وہ بھی اپنے اندر کہنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے ۔

" بتایئے نا ... انہوں نے کیا کہا ہے ... آپ رک کیوں گئے۔"

"انہوں نے کہا ہے ... فی الحال ہم بچوں کا کوئی مسودہ نہیں خریدیں گے ... اس لیے آپ اپنی یہ سیریز واپس لے جائیں ... جب بھی ضرورت ہوئی میں آپ کو خط لکھ کر اطلاع کر دوں گا۔"

مجھ پر بجلی سی گری ... 20 دن کا انتظار پہلے ہی جان لیوا ثابت ہوا تھا ... لیکن بیس دن بعد یہ خبر سنی تو حالت بالکل ہی غیر ہو گئی ... کیونکہ اب تو آئندہ کوئی تاریخ بھی نہیں ملی تھی۔ انتظار کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا تھا۔

پہلے تو امید تھی کہ چلو ڈاکٹر صاحب آ جائیں گے تو پیسے مل جائیں گے ... لیکن ڈاکٹر صاحب نے آ کر ساری امید خاک میں ملا دی تھی ... میں کر ہی کیا سکتا تھا ... سعید لخت صاحب بھی مجبور تھے، انہوں نے اپنی طرف سے میری مدد کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

ان حالات میں وہ دن کیسے گزرے ... یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

لیکن اسی روز سلیم اختر صاحب نے مجھ سے ملاقات کی اور انہوں نے کہا:

"ملک صاحب نے کہا ہے کہ آپ اپنی تنخواہ تو لے جائیں۔"

ان حالات میں یہ خبر بھی بہت غنیمت محسوس ہوئی ...یوں لگا... جیسے صحرا میں بارش ہو گئی ہو ... فوراً شیخ غلام علی اینڈ سنز کے شوروم پہنچا... ملک صاحب موجود تھے ... انہوں نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ہاتھ ملایا اور تنخواہ کی چٹ بنا کر مجھے دے دی ... گویا وہ مجھ سے کوئی بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

دل برداشتہ سا کاؤنٹر پر آیا اور چٹ دلاوری صاحب کو دے دی ... انہوں نے بھی کوئی بات نہیں کی ... حالانکہ پہلے غلام محمد صاحب اور دلاوری صاحب ہنسی مذاق کی بات کر لیتے تھے ... اس روز ان کی زبان سے بھی کوئی لفظ نہ نکلا ... میں بھی خاموشی سے اپنے پیسے لے کر گھر چلا آیا۔

☆☆☆☆☆

O

اب میں پھر حلیم سے یا چنوں سے روٹی کھانے لگا تھا ... ان دنوں میں سوچا کرتا تھا ... کیا میں ساری زندگی حلیم اور چنے ہی کھاتا رہوں گا ... کبھی خیال آتا ... میری مشکلات کا دور کب ختم ہو گا ... کبھی ہوگا بھی یا نہیں۔

اب رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ میں نے بُرا کیا جو میونسپل کارپوریشن کی ملازمت چھوڑ دی ... مجھے چاہیے تھا کہ رشوت سے سختی سے کنارہ کر لیتا اور اس کے صلے میں جو سختیاں آتیں ان کو برداشت کرتا۔

ہوا دراصل یہ تھا کہ میں سینٹری انسپکٹر بن چکا تھا ... لیکن تنخواہ میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا ... سینٹری انسپکٹر کو اس وقت صرف چھ سو روپے تنخواہ ملتی تھی ... اب جو لوگ رشوت کے پیسے وصول کرتے تھے ... انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ تنخواہ کتنی ہے ... لیکن رشوت نہ لینے والوں کے لیے چھ سو روپے کچھ بھی نہیں تھے ... انہیں گزارے کے لالے پڑے رہتے تھے۔

یہ وجہ تھی کہ مجھے یہ ملازمت ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی ... صفائی کے عملے سے دماغ کھپانا پڑتا تھا ... عملہ اور اوپر والے لوگ مجھ سے سخت ناراض تھے ... وہ کہتے تھے ... یہ شخص نیا آیا ہے ... سب کا کام خراب کرنے ... اس لیے مجھے طرح طرح سے تنگ کیا جاتا تھا ... کبھی کہیں لگا دیتے تھے تو کبھی کہیں۔

پھر تو حد ہی ہوگئی ... میرے خلاف تحریری شکایات دی جانے لگیں ... مجھے بار بار افسران بالا کے سامنے پیش کیا جانے لگا ... میں اپنی صفائی میں بہت

کچھ کہتا، لیکن میری ایک نہ سنی جاتی۔

کچھ لوگوں کی نظروں میں اس لیے بھی کھٹکتا تھا کہ پہلے ڈاکٹر عبدالحکیم کھوکھر صاحب کی وجہ سے وہ لوگ مجھے کچھ بھی نہیں کہہ پاتے تھے ... گویا اب وہ ان دنوں کا انتقام مجھ سے لے رہے تھے۔

یہ وہ حالات تھے جب مجھے شیخ غلام علی اینڈ سنز میں پہلے جگنو کی ملازمت ملی ... پھر پروف ریڈنگ کا کام ملا اور اس کے بعد ایک اور میز پر بھی کام مل گیا ...تب میں نے سوچا کہ بس اب اس ملازمت کو خیرباد کہہ دینا چاہیے اور میں یہ کر گزرا تھا۔

لہٰذا اب نہ میونسپل کارپوریشن کی ملازمت تھی اور نہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کی ... نہ وہ ناول لے رہے تھے نہ کہانیاں ... اور فیروز سنز سے بھی ٹکا سا جواب مل گیا تھا ... یہ تھے وہ گمبھیر حالات جنھوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

ایک روز تمام دن پریشان ہونے کے بعد گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ سیکرٹریٹ گیٹ کے پاس گزر کر کرشن نگر کی طرف مڑا ... پیپلز ہاؤس کے پاس ایک خربوزے والا نظر آیا ... وہ ٹوکرے میں خربوزے لیے فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔

خربوزے میری بہت بڑی کمزوری ہیں ... بہت شوقین ہوں ان کا ... جی چاہا خربوزہ کھالیا جائے ... پھر یاد آیا کہ آج جیب میں صرف چار آنے بچے ہیں ... انھی چار آنے سے شام کا کھانا کھانا ہے ...

میں سائیکل سے اتر آیا... پیدل چلنے لگا ... خربوزہ کھانے کو جی بے تحاشہ چاہ رہا تھا ... ساتھ ہی یہ خیال آرہا تھا ... اگر خربوزہ کھایا تو شام کا کھانا نہیں کھا سکوں گا ... ایسے میں خربوزے والے نے آواز لگائی:

''چار آنے سیر ... خربوزہ، چار آنے سیر۔''

چار آنے کا ایک سیر خربوزہ میں لے سکتا تھا ... جیب میں پڑی چونی گویا اچھلنے لگی ... جیب سے باہر آنے کو بے چین ہوگئی ... اور پھر میں شام کے کھانے

کا خیال بھلا بیٹھا ... خربوزے والے کے پاس رک گیا ... سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور اس سے گویا ہوا :

''ایک سیر کا کوئی خربوزہ دے دو۔''

اس نے ہاتھ والا ترازو اٹھایا... اس میں ایک پلڑے میں ایک سیر کا باٹ رکھا اور ایک خربوزہ اس میں رکھا ... وہ سیر کا نہیں تھا ... دوسرا خربوزہ رکھا تو وہ پورا ایک سیر تھا ... وہ اس نے مجھے تھما دیا ... میں نے جیب سے چونی نکال کر اسے دے دی ۔

''چھری دیں۔''

اس نے مجھے چھری دے دی ... میں نے خربوزے کو کاٹا تو وہ اندر سے بے حد نرم تھا ... پانی پانی ہو رہا تھا ... اب میں خربوزے والے کو کیا کہتا ... خربوزہ کٹ چکا ہے ... اور اسے واپس کرنے کی صورت میں اسے نقصان ہوتا ... میں نے پورا خربوزہ وہیں بیٹھے بیٹھے کھایا اور پھر رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا ... خربوزہ جیسا بھی تھا ... تھا خربوزہ ہی... پیٹ بھر گیا تھا ... میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے خربوزے کی خواہش پوری کر دی تھی ... سائیکل پر بیٹھا اور گھر آیا۔

اس دن میں نے شام کا کھانا نہیں کھایا ... وہ خربوزہ ہی میرا شام کا کھانا بن گیا تھا ... لیکن یہ معمول کی بات تھی ... ان دنوں تو ایسے معاملات عام طور پر پیش آتے ہی رہتے تھے۔

ایک روز پرانی انارکلی کے عبدالرحمٰن ہوٹل میں کھانا کھانے گیا... نابھہ روڈ والے موڑ سے انارکلی کی طرف مڑنے لگا تو موڑ پر ہی ایک سری پائے والا بیٹھا نظر آیا... خیال آیا، کیوں نہ آج کھانا یہاں سے کھا لیا جائے... اس کے پاس کافی رش تھا ... اور رش اس بات کی علامت تھا کہ اس کی چیز اچھی ہے ... میں نے سائیکل کھڑی کی اور اسے ہاف پلیٹ سری پائے دینے کیلئے کہا ... پہلے سے

موجود گاہکوں کو دینے کے بعد اس نے مجھے بھی پلیٹ میں سالن ڈال دیا ... اور پوچھنے لگا :

'' روٹی یا نان ۔''

'' روٹی ۔'' میں نے فوراً کہا۔

لکڑی کی چوکیوں پر سب لوگ کھا رہے تھے ... میں بھی ایک پر بیٹھ کر کھانے لگا ... جب کھا چکا تھا تو اسے پیسے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دھک سے رہ گیا ... جیب بالکل خالی تھی ... صبح گھر سے چلتے وقت جیب میں پیسے ڈالنا بھول گیا تھا ... میری سٹی گم ہوگئی ... دکاندار گاہکوں کی طرف متوجہ تھا ... آخر میں نے اس سے کہا :

'' میری سائیکل کھڑی ہے ... میں ابھی آیا ... ''

اس نے سر ہلا دیا ... کیونکہ کھانا تو صرف ڈیڑھ دو روپے کا تھا... جب کہ سائیکل سو روپے سے کم کی نہیں تھی... میں تیز تیز چلتا ہوا عبدالرحمٰن ہوٹل آیا... ہوٹل والے مجھے اچھی طرح جانتے تھے ... میں روزانہ کھانا وہیں سے کھاتا تھا... ان کا تعلق جھنگ سے بھی تھا ... اس لیے اور بھی زیادہ مجھے جانتے تھے ... میں نے اس وقت کاؤنٹر پر جو بھائی بیٹھے تھے... ان سے کہا:

'' جامی صاحب... میں پیسے گھر بھول آیا ہوں اور ایک فٹ پاتھ والے سے کھانا کھا بیٹھا ہوں ... آپ مہربانی فرما کر دو روپے ادھار دے دیں ... میں ان شاء اللہ کل لوٹا دوں گا۔''

انہوں نے فوراً سر ہلا دیا اور مجھے دو روپے دے دیئے... میری جان میں جان آئی... سیدھا اپنی سائیکل کے پاس پہنچا... کھانے کے پیسے دکاندار کو دیئے اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے گھر کا رخ کیا ... کہنے کا مطلب یہ کہ ایسے حالات کا نہ جانے کب تک شکار رہا ۔

آج بھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار لبوں سے ایک سرد آہ

نکل جاتی ہے ... آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

ان حالات میں چھ ماہ گزر گئے ...ایک روز تھکا ہارا اپنی چھوٹی سی گیلری میں داخل ہوا ... اس وقت بے ساختہ یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے:

''یااللہ! مجھے تو کسی طرف سے بھی آمدنی کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا ... تو پھر کیا یہ بات غلط ہے کہ جو شخص حرام روزی یعنی رشوت وغیرہ کو چھوڑ دیتا ہے تو اسے جائز راستے سے اس سے زیادہ پیسے عطا کرتا ہے۔''

ادھر یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے ... ادھر میری نظر کمرے کے فرش پر پڑے ایک تہہ کیے ہوئے کاغذ پر پڑی ... دعا سے پہلے مجھے وہ کاغذ نظر نہیں آیا تھا ... اسے دیکھ کر خیال آیا ... یہ کیسا کاغذ ہے۔

کاغذ اٹھا کر دیکھا تو شیخ غلام علی اینڈ سنز کے منیجر رب نواز ملک کا رقعہ تھا ... اس رقعے میں انہوں نے لکھا تھا:

''آپ سے ایک ضروری کام ہے ...فوراً ملیے ... میں آپ کا انتظار کروں گا۔''

رقعہ پڑھتے ہی دل دھک دھک کرنے لگا ... دل میں کہنے لگا:

''یا اللہ! اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ان لوگوں کو میری کیا ضرورت پیش آگئی۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور شام کے وقت ملک صاحب علمی پرنٹنگ پریس چلے جاتے تھے۔ اس لیے میں نے صبح جانے کا پروگرام بنایا۔

دوسرے دن نہا دھو کر اللہ کا نام لے سائیکل پر بیٹھا اور لوہاری کی طرف روانہ ہوا ... ملک صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے ... انہوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا ... میں حیران رہ گیا کہ ایسی کیا بات ہوگئی ... ادھر انہوں نے کہا:

''کیا حال ہے اشتیاق صاحب۔''

''جی ! اللہ کا شکر ہے۔'' میں نے مشکل سے کہا۔

انہوں نے میرے چہرے پر ایک نظر ڈالی ... پھر کہنے لگے:

’’وہ آپ کی جمشید سیریز ہے ۔‘‘

’’جی ...‘‘ میں نے فوراً کہا ...دل بہت زور سے دھڑکا ... ایک بار پھر جمشید سیریز کا ذکر کیا جا رہا تھا۔

’’ہم چاہتے ہیں ... اس سیریز کا ہر ماہ ایک ناول شائع کیا جائے۔‘‘

’’کیا فرمایا آپ نے ... ہر ماہ ایک ناول۔‘‘ میں نے حیران ہو کر کہا۔

’’ہاں! ہر ماہ ایک ناول ، اب اگر آپ یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں تو فی الحال بارہ ناول لکھ لائیں اس کے بعد ہر ماہ ایک ناول لکھ کر دیتے رہیں ۔‘‘

’’جی ... کتنے ؟‘‘ میں نے مارے حیرت کے کہا۔

’’بارہ ناول یک مشت اور پھر ہر ماہ ایک۔‘‘

’’بہت بہتر جناب ! میں یہ کام ضرور کروں گا ، لیکن معاوضہ کیا ہوگا۔‘‘

’’معاوضہ وہی دو روپے فی صفحہ یا پھر ہر مسودے کے سوا دو سو روپے لے لیا کریں۔ ہر مسودہ ایک سو بارہ صفحات کا لکھ کر لایا کریں ۔‘‘

’’جی بہت بہتر ۔‘‘

اس وقت مجھے اپنے سر سے بہت بھاری بوجھ اترتا محسوس ہوا ... اس وقت مجھے یہ یقین ہو چکا تھا :

’’جو شخص حرام روزی چھوڑ دیتا ہے ... اسے اللہ تعالیٰ حلال روزی اس سے کہیں زیادہ عطا فرماتے ہیں اور اللہ کا وعدہ ہرگز جھوٹا نہیں... آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرمان کا ایک ایک لفظ قیامت تک کے لیے درست ہے ۔‘‘

اس وقت میرے پاس تین مسودے تھے۔

جیل سے فرار، جراب کا ہنگامہ اور تجوری کا چور بالکل تیار تھے۔

بیکاری کے دنوں میں لکھنے کا کام نہیں روکا تھا ... کچھ صفحات روزانہ لکھتا رہا تھا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ادھر ملک صاحب نے 12 مسودوں کی بات کی ... ادھر میں انہیں تین مسودے دینے کے قابل تھا ،لیکن میں فوری طور پر وہ تین

مسودے لے کر وہاں نہیں گیا ، بلکہ میں نے چوتھے مسودے پر کام شروع کر دیا۔ آخر چار دن میں ناول مکمل کر لیا...

یہ ناول 'انگوٹھی کا راز' تھا۔

اس طرح میں تقریباً ایک ہفتے بعد ملک صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسودے ان کے سامنے رکھ دیے۔ ابھی میں چوتھا ناول ساتھ نہیں لے گیا تھا ... انہوں نے ان تینوں کے پونے سات سو روپے بھی اسی وقت دے دیئے۔

یعنی اب انہوں نے مسودے پڑھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی... انہوں نے کہا: '' باقی مسودے بھی تیار کر لائیں ۔''

''جی اچھا ۔''

میں گھر آیا اور پانچویں ناول پر کام شروع کردیا ... یہ سیاہ بھیڑیا تھا ... سیاہ بھیڑیا کے بعد جو ناول لکھا گیا ... وہ 'بے تاج بادشاہ' تھا۔

لیکن بے تاج بادشاہ اپنے مقرر صفحات میں مکمل نہ ہو سکا ، اسے دوسرے حصے 'سیاہ گولی' تک لے جانا پڑا۔ ابھی میں یہ ناول پورے کرنے کے چکر میں تھا کہ سعید لخت صاحب کا پیغام ملا :

'' اپنی یشو ما اور سرخ تیر والی سیریز لے آئیں۔''

میں بہت حیران ہوا ... کہاں تو کسی طرف سے کوئی روز گار ملنے میں نہیں آرہا تھا ... کہاں اوپر تلے دروازے کھلنے لگے تھے ... لیکن اس وقت مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے ... حیرت کے بے شمار دروازے مجھ پر کھلنے کے لیے بے تاب تھے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

اور میں ان سب سے بالکل بے خبر اپنی دھن میں مصروف تھا۔

سعید لخت صاحب مجھے ترجمے والی کتاب کابل تو پہلے ہی دے چکے تھے ... باقی پانچ ناول انہوں نے مقبول جہانگیر وغیرہ سے ترجمہ کرائے تھے ... بعد میں تبصرہ کرنے والوں نے کہا :

''سب سے اچھا ترجمہ آپ کا تھا...''

یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی... کیونکہ وہ لوگ ترجمہ کرنے کے ماہر تھے، جب کہ میں بالکل اناڑی تھا۔

بہرحال اب ترقی کے دروازے کھلنے شروع ہو گئے تھے...

اور میں اپنی دھن میں مگن تھا۔

بارہ ناولوں میں سے چار اور ناول سیاہ بھیڑیا بے تاج بادشاہ چوتھا ناول اور سیاہ گولی، یہ چاروں مسودے لے کر ملک صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے مسودے رکھ لیے ... ان کی ادائیگی کے لیے چٹ بھی لکھ دی۔

میں نے چٹ اٹھائی ... ان کا شکریہ ادا کیا اور لگا اٹھنے۔

ایسے میں انہوں نے کہا: ''بیٹھیں! آپ سے ایک بات کرنی ہے۔''

میں حیرت زدہ سا بیٹھ گیا ... وہ کسی کو خط لکھ رہے تھے ... گویا مجھے اشارہ کیا تھا کہ'' خط لکھ لوں، پھر بات کرتا ہوں...''

آخر انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا۔

پھر بولے: ''آپ سے ارشد صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں ... آئیے ... ذرا علمی پرنٹنگ پریس تک چلیے۔''

مجھے اور زیادہ حیرت ہوئی... کہ وہ کون سی بات تھی جو ملک صاحب نہیں کہہ سکتے تھے اور ارشدنیاز صاحب کہہ سکتے تھے۔ راستے بھر میں حیرت زدہ ہی رہا ... علمی پرنٹنگ پریس جانے کے لیے انارکلی سے نکل کر ہسپتال روڈ پر جانا پڑتا تھا اور یہ کوئی زیادہ فاصلہ نہیں تھا ... ہم عام طور پر پیدل ہی چلے جاتے تھے...

دونوں ارشدنیاز صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا... اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد ارشد صاحب نے کہا:

'' اشتیاق صاحب ... جگنو کا کام ٹھیک نہیں چل رہا ... ہم چاہتے ہیں... آپ ہی اسے سنبھالیں۔''

میں حیرت زدہ رہ گیا... اب ساری بات یک لخت میری سمجھ میں آئی تھی... بارہ ناولوں کے لیے مجھے پیغام دے کر جو بلایا گیا تھا تو دراصل انھیں جگنو پھر سے میرے حوالے کرنا تھا... یعنی انہیں اصل پریشانی جگنو کی تھی۔

میرا جی چاہا، میں کہہ دوں:

"لیکن جناب! میں ادارت کیا جانوں... جگنو کا کام میں ٹھیک طرح سے نہیں کر سکوں گا ... پہلے بھی یہ تجربہ ہو چکا ہے۔"

لیکن حالات کے شکنجے میں اس قدر کسا ہوا تھا کہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کہا بھی صرف اتنا: "جی اچھا! جو آپ فرمائیں۔"

اس طرح ایک سال بعد ایک بار پھر مجھے جگنو کی ادارت مل گئی... بعد میں معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے میری جگہ جس آدمی کو رکھا تھا... وہ بہت پڑھا لکھا تھا اور اسی بل بوتے پر وہ اس ادارے میں آیا تھا... اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں جب ان حضرات کو بتایا تھا تو انہوں نے فوری طور پر میری جگہ اسے رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا... یہی وجہ تھی کہ ایک سال بعد انہوں نے مجھ سے بے دھڑک کہہ دیا تھا:

"آپ جگنو کا کام اچھی طرح نہیں چلا رہے۔"

اب ان صاحب سے ارشد نیاز کے مزاج کے مطابق ادارت نہ ہو سکی... ایک سال تک تو اسے روتے روتے برداشت کیا ... لیکن آخر اسے فارغ کر دیا اور پھر سے مجھے جگنو کا کام سونپ دیا۔

دفتر میں پھر سلیم اختر اور نذیر ہاشمی صاحبان سے ملاقات ہوئی...اس دفعہ وہ سب بہت خوش ہوئے... بلکہ خوب گرمجوشی سے ملے... اشفاق احمد اس وقت تک ملازمت چھوڑ کر اپنا کام شروع کر چکے تھے... ان کی جگہ اب منیر انیس آرٹ ایڈیٹر تھے۔

جگنو ایک بار پھر میری ادارت میں نکلنے لگا... ہم پھر سے مل جل کر کام

کرنے لگے اور کافی خوشگوار ماحول میسر آیا... جلد ہی میں نے ان کے بارہ میں ناول پورے کر دیئے... گویا اب مجھے ہر ماہ ایک ناول ان کے لیے لکھنا تھا... لیکن انہوں نے بارہ ناول پورے ہونے پر مجھ سے کہا:

''پہلے یہ ناول شائع ہوجائیں ... پھر شروع کیجیے گا۔''

''جی اچھا۔''

کچھ دن بعد میں نے ملک صاحب سے کہا:

'' آپ پروف ریڈنگ والا کام بھی پھر سے مجھے دے دیں اور وہ مسودوں والا بھی۔''

''ٹھیک ہے...یہ دونوں کام بھی آپ کر لیا کریں۔''

اب میں صبح شیخ غلام علی اینڈ سنز جاتا اور شام کو واپس آتا ... جگنو کی تنخواہ اب ساڑھے تین سو روپے تھی ... تین سو روپے وہ دوسری میز کے دے دیتے تھے اور تین چار سو کی پروف ریڈنگ سارے مہینے میں ہوجاتی تھی ... اس طرح میں ایک ہزار روپے ماہوار کمانے کے قابل ہوا ... اور یہ اس وقت بہت کافی آمدنی تھی...

اب میں بھی خوش تھا، گھر والے بھی خوش تھے... گزر بسر نہایت آسانی سے ہونے لگی۔

☆☆☆☆☆

O

انہی دنوں شیخ غلام اینڈ سنز نے روشن کتابیں کے نام سے کتابیں شائع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا... دنیا بھر میں شائع ہونے والی مشہور و معروف کتابوں کو سستے ترین ایڈیشن میں شائع کرنے کا پروگرام یوں ترتیب دیا گیا کہ باریک کتابت اور بڑے سائز میں کتب شروع کی گئیں ... اصل کتاب اپنے اصل سائز اور کتابت میں اگراس زمانے میں پچاس روپے تھی تو روشن کتاب کے سائز اور کتابت میں اس کی قیمت صرف دس روپے رکھی جاتی تھی... یوں کم آمدنی رکھنے والے لوگ بھی بڑی بڑی اور قیمتی کتابیں پڑھ سکتے تھے۔

اور دراصل یہ سلسلہ شروع کیا تھا ... قاسم محمود نے... انہوں نے اپنے سلسلے کا نام شاہکار کتابیں رکھا تھا ... ان کا یہ سلسلہ بہت چل نکلا تو ان کی دیکھا دیکھی شیخ غلام علی اینڈ سنز نے روشن کتابیں کا سلسلہ شروع کر ڈالا...

یہاں قاسم محمود صاحب کی بھی ایک بات یاد آ گئی ۔

جس زمانے میں ان کا شاہکار سلسلہ زوروں پر تھا اور دھڑا دھڑ ان کی کتابیں فروخت ہو رہی تھیں اور شائع بھی اسی رفتار سے ہو رہی تھیں ... میں ان دنوں بے کاری کے دھکے کھا رہا تھا ... یعنی ملازمت چھوڑ چکا تھا اور شیخ غلام علی اینڈ سنز سے بھی جواب مل چکا تھا ... فیروز سنز نے بھی ناول لینے سے انکار کر دیا تھا تو اس وقت میں نے سوچا، کیوں نہ سید قاسم محمود صاحب سے ملا جائے... اور ان سے کہا جائے کہ وہ مجھے کوئی کام دے دیں... چاہے پروف ریڈنگ کا ہی کام

دے دیں۔

شاہکار کتابیں کا ان کا دفتر سمن آباد میں کہیں تھا... میں پوچھتا پچھاتا وہاں پہنچا... سید قاسم محمود موجود تو تھے... لیکن ان کی کتابوں کے کوئی بڑے ڈیلر آئے ہوئے تھے... اس لیے جب تک وہ فارغ نہ ہوجاتے، اس وقت تک میں ملاقات کے لیے نہیں جاسکتا تھا...

آخر خدا خدا کر کے ڈیلر صاحب باہر آئے اور چپراسی نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا... سید قاسم محمود اس وقت مجھے نہیں جانتے تھے... میں نے اپنا نام بتایا اور یہ بھی کہ کتنی کہانیاں اور کتنے افسانے لکھ چکا ہوں... لیکن آج کل بالکل بے کار ہوں ... لہٰذا مجھے کوئی کام دے دیں... ملازمت نہیں دے سکتے تو پروف ریڈنگ کا کوئی کام دے دیں۔

سید قاسم محمود نے میری بات سن کر کہا:

''پروف ریڈنگ کا کام تو ہمارے پاس بہت ہے... میں آپ کو ایک مسودہ دیتا ہوں... آپ اسے پڑھ کر لے آئیں... آپ کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا... اور مزید مسودہ بھی دے دیا جائے گا... لیکن مسودہ ذرا جلدی پروف ریڈنگ کرکے لے آیئے گا۔''

''جی اچھا۔'' میں نے جواب دیا اور مسودہ گھر لے آیا۔ میں نے سوچا چلو... کچھ تو پیسے ملیں گے... بیکاری میں یہ بھی بہت ہے...

صرف دو دن بعد مسودہ پروف ریڈنگ کرکے ان کے پاس چلا گیا... انہوں نے مسودہ دیکھا... پروف ریڈنگ سے مطمئن ہوئے اور کہنے لگے:

''آپ کو چٹ لکھ دیتا ہوں... اس کا بل آپ کو میرے سرکلر روڈ والے دفتر سے ملے گا... یہ لے کر وہاں چلے جائیں... مزید مسودہ بھی آپ کو وہیں سے مل جائے گا.. . میں رقعہ لکھ دیتا ہوں۔''

''جی اچھا!'' میں نے خوش ہو کر کہا کیونکہ میں لوہاری میں رہتا تھا اور

سرکلر روڈ پر بیرون بھاٹی گیٹ ان کا دفتر بہت نزدیک تھا۔

گویا اب مجھے سمن آباد نہیں جانا پڑے گا... میں وہ چٹ لے کر ان کے دفتر پہنچا... دفتر اوپر والی منزل پر تھا... وہاں جو صاحب ملے... میں اب ان کا نام بھول گیا ہوں... بہرحال وہ بہت اچھی طرح ملے تھے ... چٹ دیکھ کر کہنے لگے... یہ بل آپ کو ایک دو دن بعد مل جائے گا... فی الحال آپ ایک اور مسودہ پروف ریڈنگ کر لائیں۔"

ان کی بات سن کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی... کیونکہ وہ کوئی لمبا چوڑا بل نہیں تھا... شاید دو سو روپے کا تھا...

خیر... میں مسودہ لے کر چلا آیا... اور اس کی بھی دو دن میں پروف ریڈنگ کر دی... وہ بھی ان صاحب کو دے دیا... اب بل تقریباً چار سو روپے کا بن گیا... اب پھر انہوں نے کہا:

"دونوں بل آپ کو چند دن بعد مل جائیں گے ... ابھی پروف ریڈنگ کا مزید کام بھی نہیں ہے ... جونہی کوئی مسودہ کتابت ہو کر آیا، آپ کو دے دیا جائے گا۔"

ایک بار پھر مجھے الجھن ہوئی... لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا... دو دن بعد گیا تو انہوں نے پھر یہی کہا:

"ابھی چند دن ٹھہر کر دیں گے۔"

اب مجھ سے رہا نہ گیا...

"جناب! مجھے ضرورت ہے اور یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ... دو دن بعد آجائیں... آپ کو بل ضرور مل جائے گا۔"

مجھے رونا آگیا... خاموشی سے واپس چلا آیا... میں سوچنے لگا:

"یہ کیسے لوگ ہیں... کتابیں شائع کرتے ہیں... کتابیں اخلاق سکھاتی

ہیں، آداب سکھاتی ہیں ... معاشرت سکھاتی ہیں... دوسروں کے حق ادا کرنا سکھاتی ہیں... لیکن یہاں تو ایسی کوئی بات بھی نظر نہیں آتی۔"

آخر میں نے سوچا... اگر اس بار بھی انہوں نے چار سو روپے نہ دیے تو میں سید قاسم محمود صاحب سے ملوں گا اور انھیں ساری بات بتاؤں گا...

چار دن بعد میں پھر ان کے پاس گیا... انہوں نے پھر مجھ سے کہا:

"ابھی بل نہیں مل سکتا۔"

اب تو مجھے غصہ آگیا... ان کے دفتر سمن آباد پہنچ گیا... ان سے ملاقات کی اور ساری بات بتائی... اس پر انہوں نے کہا... میں ان سے کہہ دوں گا... آپ چند دن بعد جا کر لے لیں...

اس وقت مجھے بہت حیرت ہوئی... وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ چند دن بعد لے لیں... یہ نہیں کہا کہ ابھی جا کر لے لیں... میں جلتا بھنتا واپس آگیا اور چند دن بعد گیا تو چار سو روپے مل گئے ... میں نے ان سے مزید کام کا ذکر تک نہیں کیا... اور واپس چلا آیا۔

واپس آرہا تھا کہ دیواروں پر ہفت روزہ صحافت کے اشتہار جگہ جگہ لگے دیکھے... ان اشتہارات پر ایڈیٹر کا نام ضیاء شاہد لکھا تھا...

ضیاء شاہد کا نام میں اردو ڈائجسٹ میں پڑھتا رہا تھا... یہ پہلے اردو ڈائجسٹ میں ملازم تھے... اس کے بعد غالبًا انہوں نے اپنا شمارہ صحافت شروع کیا تھا... میں نے سوچا... لگے ہاتھوں ان سے بھی مل لوں... نیا کام ہے... ہوسکتا ہے... عملہ پورا نہ ہو اور یہ مجھے رکھ لیں... اس خیال کے تحت دوسرے دن میں صحافت کے دفتر پہنچ گیا... ان کا دفتر ملتان روڈ پر تھا... آسانی سے مل گیا... ضیاء شاہد صاحب سے ملاقات ہوئی... میں نے انھیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا... وہ سنتے رہے ... آخر کہنے لگے:

"ٹھیک ہے... ہم آپ کو چھ سو روپے ماہوار دیا کریں گے... آپ کو

شام چار بجے سے آٹھ بجے تک آنا ہوگا... پورے پرچے کی پروف ریڈنگ آپ کیا کریں گے۔''

میں بہت خوش ہوا ... شدید بے کاری کے دنوں میں چھ سو روپے کی ملازمت بہت غنیمت تھی ... یہ ملازمت صرف چند ماہ چلی ...

اس دوران میرے ناول شیخ غلام علی اینڈ سنز میں دوبارہ شروع ہو گئے تھے اور پھر جب انہوں نے جگنو کی ادارت کے لیے کہا تھا تو میں نے صحافت کی ملازمت چھوڑ دی تھی... صحافت ایک سیاسی رسالہ تھا اور پیپلز پارٹی کے دور میں نکالا گیا تھا...

اب میں پھر واپس پلٹتا ہوں... یہ چند باتیں رہ گئی تھیں ... اس لیے ان کا ذکر کر دیا... اور یہ ذکر یاد آیا تھا روشن کتابیں پر...

روشن کتابوں کے لیے انہوں نے ایک بہت زیادہ پڑھے لکھے شخص کو ملازم رکھا تھا... وہ پہلے کئی اخبارات میں کام کر چکا تھا... افسوس! میں ان کا نام بھی بھول گیا... بہرحال وہ روشن کتابوں کا اداریہ لکھتے تھے... اگلے پچھلے صفحات تیار کرتے اور آئندہ آنے والی کتابوں کے اشتہارات ترتیب دیا کرتے تھے... میں اپنا جگنو کرتا تھا... اس طرح ان سے صرف علیک سلیک ہوتی تھی...

وہ بھی ملک صاحب اور ارشد صاحب کے ساتھ زیادہ دیر نہ چل سکے اور استعفیٰ دے کر چلے گئے... اب پھر ملک صاحب نے مجھے بلایا ... کہنے لگے:

''روشن کتابیں بھی آپ ہی سنبھالیں... ان کا اداریہ لکھ دیا کریں، اگلے پچھلے صفحات ترتیب دے دیا کریں... اور اشتہارات بنا دیا کریں... ہم روشن کتابیں کے بھی آپ کو وہ سو روپے دے دیا کریں گے۔''

میں ان کی باتیں سن کر حیرت کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا... کہاں تو وہ مجھے کوئی بھی کام دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور یہ تک کہہ دیا تھا کہ آپ جگنو کا کام ٹھیک نہیں کر رہے اور کہاں وہ پھر سب کچھ دینے کے لیے تیار تھے۔

میں نے بھی کسی کام سے انکار نہ کیا... اور ان کے سبھی کام کرنے لگا...
ایک دن ارشد نیاز صاحب سے شوروم میں ملاقات ہوئی... وہ ملک صاحب کے کمرے میں موجود تھے... میں کسی کام سے ملک صاحب کے پاس گیا تھا...
ارشد صاحب مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے: ''اب آپ ہمارے ادارے میں سب سے زیادہ تنخواہ لینے والے شخص بن گئے ہیں۔''
''لیکن جناب! یہ بھی تو دیکھیں ... کام کتنے کر رَہا ہوں۔''
''ہاں! اس میں تو خیر شک نہیں۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔
اب مجھ پر بے فکری کے دن آئے... لیکن یہ ہے کہ فرصت کے دن بالکل ختم ہوگئے... اب تو بس میں تھا اور کام ہی کام تھا۔

☆☆☆☆☆

O

ایک روز نذیر ہاشمی صاحب نے مجھ سے کہا:

''اشتیاق احمد ... آپ نے اتنے افسانے لکھ مارے ... جو شائع بھی ہو چکے ہیں ... کیا کبھی پاک ٹی ہاؤس بھی گئے ہیں۔''

''پاک ٹی ہاؤس! یہ کون سی جگہ ہے ... چائے کی دکان ہے کوئی؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''ارے نہیں... ایک خوبصورت صاف ستھرا ریسٹورنٹ ہے ... اس میں صرف شاعر اور ادیب لوگ آکر بیٹھتے ہیں... گپ شپ لگاتے ہیں... ادب سے متعلق باتیں کرتے ہیں... اپنے افسانے اور غزلیں ایک دوسرے کو سناتے ہیں... میں آج شام وہاں جارہا ہوں... مجھے اسرار زیدی صاحب سے کچھ کام ہے... آپ بھی چلیے۔''

''مم ... میں تو کسی ایسی جگہ کبھی نہیں گیا... جہاں بہت سے ادیب اور شاعر ہوں۔''

''آج چلیں نا پھر میرے ساتھ۔''

''اچھی بات ہے... آپ کہتے ہیں تو چلا چلوں گا۔''

اس طرح اس شام میں نذیر ہاشمی صاحب کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس گیا ... وہاں اسرار زیدی موجود تھے... نذیر ہاشمی مجھے ساتھ لیے سیدھے ان کی میز کی طرف چلے گئے ... ان سے مصافحہ ہوا... ہاشمی صاحب نے میرا ان سے تعارف

کرایا... انہوں نے دلچسپی بھرے انداز میں میری طرف دیکھا... پھر کہنے لگے:

''یہ جان کر خوشی ہوئی... کہ آپ کے بہت سے رسائل میں افسانے شائع ہو چکے ہیں... کچھ افسانوں اور رسائل کے نام بتائیں۔''

''جی... جی اچھا۔'' میں گھبرا سا گیا... پھر میں نے افسانوں کے نام اور رسائل کے نام گنوانے شروع کیے... سیارہ ڈائجسٹ میں میرے افسانے مجبور بھائی، غیور بہن، وہی دن، چھپ چکے ہیں، اردو ڈائجسٹ میں، تخلیق میں ادبی دنیا، فنون، افسانہ ڈائجسٹ، اور حور میں یہ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔''

اسرار زیدی کے چہرے پر حیرت ظاہر ہوئی... کہنے لگے:

''پھر تو آپ کو ہماری بزمِ ادب میں آنا چاہیے... اور وہاں اپنا کوئی افسانہ سنانا چاہیے۔''

''جی... بزمِ ادب؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں! دیال سنگھ لائبریری نسبت روڈ پر واقع ہے... وہاں ہر جمعرات کو شاعر اور ادیب جمع ہوتے ہیں... اپنی اپنی غزل یا اپنا اپنا افسانہ پڑھ کر سناتے ہیں... جب وہ سنا چکتے ہیں تو تمام شاعر اور ادیب تبصرہ کرتے ہیں... آپ بھی اپنا افسانہ سنائیں... اس طرح آپ کو پتا چلے گا کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔''

''لل... لیکن! میں نے تو کبھی کسی محفل میں اپنا کوئی افسانہ نہیں سنایا۔''

''تو کیا ہوا... آپ سنائیں... کیا خیال ہے آپ کا نام لکھوا دوں۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔''

''نذیر ہاشمی صاحب... آپ انھیں جمعرات کی شام سات بجے لے آیئے گا... اکیلے آتے تو یہ گھبرائیں گے۔''

''آپ فکر نہ کریں... یہاں بھی تو انھیں میں ہی لایا ہوں۔'' نذیر ہاشمی نے فوراً کہا۔

پاک ٹی ہاؤس سے گھر آیا تو فکر مند تھا... بار بار یہ خیال آرہا تھا...

افسانہ کیسے سناؤں گا ... مجھے تو کوئی تجربہ نہیں ... اور اس وقت تو کوئی افسانہ میرے پاس لکھا ہوا ہے بھی نہیں... کافی دیر پریشان رہا... آخر افسانہ لکھنے بیٹھ گیا اور اس روز جو افسانہ لکھا گیا... اس کا نام جنت میں قبر تھا ...

جمعرات کے روز نذیر ہاشمی صاحب میرے پاس پہنچ گئے ... میں ان کے ساتھ روانہ ہوا اور انار کلی پہنچا ... انارکلی میں نیلا گنبد کے پاس اسرار زیدی صاحب کا گھر تھا... اور وہ گھر دوسری منزل پر تھا ... ہم نے وہاں ان سے ملاقات کی... وہ دیکھ کر خوش ہوئے... کہنے لگے:

''اچھا کیا آپ یہاں آگئے ... یہیں سے ساتھ چلیں گے۔''

آخر ہم وہاں لائبریری کے اس ہال میں پہنچ گئے... جس میں یہ پروگرام ہوتا تھا... وہاں کافی شاعر اور ادیب جمع تھے... ان میں خالد احمد بھی تھے... ہم تینوں السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے ... اسرار زیدی صاحب سے تو چند شاعروں اور ادیبوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملائے ... میری اور نذیر ہاشمی کی طرف کسی نے خاص توجہ نہ دی ... ہم تو بالکل نئے تھے...

آخر پروگرام شروع ہوا ... شاعر حضرات اور ادیب حضرات نے اپنا اپنا کلام سنایا اور افسانہ سنانا شروع کیا ... سب لوگ غور سے سنتے رہے اور غزل مکمل ہونے یا افسانہ ختم ہونے پر تنقید یا تعریف کا دور چلتا... سنانے کے دوران میں واہ واہ کی آوازیں بھی سنائی دے جاتیں... آخر میرا نام پکارا گیا...

''اب آپ کو اشتیاق احمد اپنا افسانہ سنائیں گے۔''

میں نے اپنے کاغذ سنبھالے ہی تھے کہ اسرار زیدی اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے:

''اشتیاق احمد آج ہماری بزم میں پہلی بار آئے ہیں ... لیکن لکھنے کے میدان میں یہ نئے نہیں ہیں... اس وقت تک ان کی بہت سی کہانیاں اور افسانے شائع ہوچکی ہیں... ادارہ فیروز سنز اور شیخ غلام علی اینڈ سنز نے ان کے پچاس کے

قریب ناول شائع کیے ہیں۔''

اب کچھ حضرات کی آنکھوں میں دلچسپی نظر آئی ... اسرار زیدی بیٹھے ہوئے میری طرف مڑے :

'' شروع کریں افسانہ۔''

میں اپنا افسانہ ''جنت میں قبر'' پڑھنے لگا۔ سب لوگ توجہ سے سن رہے تھے۔ یہ ان میں بہت اچھی بات تھی۔ ہر ایک کی چیز غور سے سنتے تھے اور پھر غیر جانبداری سے تبصرہ کرتے تھے۔

میری آواز میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی ... لرزش تھی... اس لیے کہ میں پہلی بار افسانہ پڑھ کر سنا رہا تھا ... آخر افسانہ مکمل ہوا... اب ان سب کی باری تھی... چند لمحے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے کہ پہلے کون تبصرہ شروع کرے... آخر ان حضرات میں سے ایک نے بات شروع کی...

غرض اللہ کی مہربانی سے جتنے حضرات نے بحث میں حصہ لیا ... ان سبھی نے جنت میں قبر کو بہت سراہا۔

اس سے مجھے بہت حوصلہ ہوا ... دوسرے دن ہی میں سیارہ ڈائجسٹ کے دفتر چلا گیا ... اب ان کا دفتر نوائے وقت بلڈنگ سے منتقل ہو چکا تھا... اب میں اس سڑک کا نام بھول گیا ... بہرحال وہاں پہنچا۔

سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر اب مقبول جہانگیر کے بجائے ستار طاہر صاحب تھے ... میں ان سے ملا ... اپنا تعارف کرایا... اور افسانہ جنت میں قبر ان کے سامنے رکھ دیا... ساتھ ہی میں نے کہا:

'' میں نے کل ہی یہ افسانہ بزمِ ادب میں سنایا ہے... اور اس نے بہت داد وصول کی ہے۔''

'' اچھی بات ہے ... میں پڑھ کر دیکھ لیتا ہوں... قابلِ اشاعت ہوا تو انشاء اللہ ضرور شائع ہوگا۔''

میں ان سے ہاتھ ملا کر چلا آیا... ایک ماہ بعد افسانہ سیارہ میں شائع ہوگیا... گویا انہوں نے فوراً ہی لگا دیا تھا... میں اپنا اعزازی پرچہ لینے کیلئے گیا تو ستار طاہر گرمجوشی سے ملے ... کہنے لگے:

''جنت میں قبر واقعی بہت غضب کا افسانہ ہے... بہت مزہ آیا۔''

''شکریہ! جناب!''

''ہمارے لیے لکھتے رہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''جی اچھا۔''

میں اعزازی پرچہ لے کر چلا آیا... انھی دنوں تخلیق میں میرا افسانہ ''ٹیم'' چھپا... میں ان سے ملنے گیا تو جھوٹتے ہی کہنے لگے:

''ٹیم بہت پسند کیا گیا ہے... مستنصر حسین تارڑ صاحب نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔''

ان کی بات سن کر مجھے خوشی ہوئی... حوصلہ بھی بہت بڑھا... اور میں نے سوچا، ناولوں کے اور کہانیوں کے ساتھ ساتھ مجھے افسانوں پر بھی کام کرتے رہنا چاہیے... تاکہ ادبی دنیا سے بھی کچھ تعلق رہے...

اظہر جاوید صاحب نے بھی کہا:

''افسانے کبھی کبھی ملتے ہیں آپ کے... دو تین ماہ میں ایک افسانہ تو لکھ ہی دیا کریں...''

میں مسکرا دیا... ان سے صرف اتنا کہہ سکا:

''کوشش کروں گا۔''

میں نے افسانے لکھنے کا کام بھی جاری رکھا۔

☆☆☆☆☆

O

ایک روز چپراسی نے آ کر بتایا: ''ملک صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''
میرا دل دھڑکا... وہ عام طور پر مجھے نہیں بلاتے تھے... کوئی کام ہوتا تو اس وقت کہہ دیتے جب میں آ رہا ہوتا تھا یا جا رہا ہوتا تھا۔
یہی وجہ تھی کہ ان کا پیغام ملنے پر میرا دل زور سے دھڑکا... اب میں جوں جوں سیڑھیاں اتر رہا تھا، دھڑکن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر میں ملک صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔
وہاں ایک صاحب بیٹھے نظر آئے... وہ ادھیڑ عمر شخص تھے اور چہرے سے مسکینی برس رہی تھی۔
ملک صاحب مجھے دیکھتے ہی بولے: ''آیئے اشتیاق صاحب ... ان سے ملیے... یہ ہیں خالد لطیف صاحب... ہمارے کراچی کے ڈیلر ... کراچی بک ڈپو ... کراچی میں آپ کی کتابیں ہم سے یہی منگاتے ہیں... یہ آپ سے ملنا چاہتے تھے... اب یہ خود آپ سے کہیں گے... جو یہ کہنا چاہتے ہیں۔''
''جی اچھا۔'' یہ کہہ کر میں ان کی طرف گھوم گیا۔
'' میری دکان اردو بازار میں ہے ... دکان نمبر 37 اردو بازار... نام ہے کراچی بک ڈپو ...آپ کی سیریز... یعنی انسپکٹر جمشید سیریز کراچی میں بہت مقبول ہو رہی ہے ... بہت جلد آپ کی کتابیں کراچی میں بہت مشہور ہو جائیں گی۔''
''بہت بہت شکریہ جناب!'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''بس آپ سے یہی کہنا تھا ... دراصل میں آپ سے ملنا چاہتا تھا... سو ملاقات ہوگئی۔''

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب میں جاسکتا ہوں... تاکہ ہم کاروباری بات کرسکیں۔ میں ان سے ہاتھ ملا کر چلا آیا...

میں اوپر آیا... دوپہر ہوچکی تھی... میرے کمرے میں دو صاحب اور بیٹھتے تھے ... ان میں سے ایک کا نام رفیع اللہ تھا... اس وقت رفیع اللہ نے بتایا:

''ساتھ والے کمرے میں جو اکاؤنٹنٹ تھے، چند دن پہلے وہ ملازمت چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ آج ہی ان کی جگہ نئے اکاؤنٹنٹ آئے ہیں۔ ان کا نام نقش محمد ہے ... ریٹائرڈ فوجی ہیں۔''

''اچھی بات ہے، ان سے ملاقات کر لیتا ہوں ... نئے پڑوسی جو ہوئے۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور ان کے کمرے میں جا کر ملاقات کی...

وہ بہت خوشگوار انداز سے ملے ... قدرے لمبے قد کے خوش شکل انسان تھے ... ناک قدرے پھولی ہوئی تھی... رنگ سرخ و سفید تھا۔

'' خوشی ہوئی آپ کی آمد پر۔'' میں نے کہا۔

'' میں بھی یہاں آکر خوشی محسوس کر رہا ہوں۔'' انھوں نے کہا۔

چند جملوں کے تبادلے کے بعد میں اپنی میز پر آگیا ... اب ان سے روزانہ ملاقات ہونے لگی ... باقی سب سے بھی علیک سلیک ہوتی رہتی تھی۔

دوپہر کو کھانے کا وقفہ ہوتا تھا... یہ سب لوگ اس وقفے میں ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے ... سب اپنے اپنے گھر سے اپنا دوپہر کا کھانا لاتے تھے اور اکٹھے بیٹھ کر کھاتے تھے... لیکن چونکہ میرا لاہور میں گھر نہیں تھا... میرا مطلب ہے... ماں باپ، بیوی بچے جھنگ میں تھے، اس لیے میں بازار سے کھانا کھاتا تھا ... ایک دن رفیع اللہ اپنا ٹفن اٹھا کر ان کی طرف جانے لگا تو نہ جانے اسے کیا خیال آیا... مجھ سے کہنے لگا:

''آیئے! آج آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔''

''نہیں بھئی ... آپ سب لوگ تو اپنے اپنے گھر سے کھانا لاتے ہیں جب کہ میرے پاس گھر کا کھانا ہوتا نہیں ... اس لیے میں آپ کے ساتھ کھانا کیسے کھا سکتا ہوں۔''

''آج میں جو آپ کو دعوت دے رہا ہوں۔''

''نہیں... یہ اچھا نہیں لگتا ... آپ کھائیں۔''

رفیع اللہ چلا گیا... لیکن نقش محمد صاحب نے یہ بات سن لی ... ساتھ ساتھ کیبن تھے ... ایک کیبن کی آواز سب کیبنوں تک جاتی تھی، انہوں نے وہیں سے پکارا:

''آجائیں اشتیاق صاحب آج ہم سب کی طرف سے آپ کی دعوت!''

اب میں مجبور ہوگیا اور ان کے ساتھ جا بیٹھا، اب سب نے اپنا اپنا کھانا نکال کر سامنے رکھ لیا... اور سب مل جل کر کھانے لگے... یعنی آٹھ دس آدمیوں کا کھانا ... آٹھ دس طرح کا کھانا عجیب مزے دار لگا ... سچی بات یہی ہے کہ اس روز بہت ہی مزہ آیا... رنگ رنگ کے، طرح طرح کے کھانوں کا اپنا ہی مزہ تھا...

دوسرے دن رفیع اللہ اپنا ٹفن اٹھا کر چلا گیا ... میں میز کی چیزیں ترتیب سے لگا کر بازار جانے کے لیے اٹھا ... اسی وقت نقش محمد صاحب کی آواز سنائی دی ...

''آجائیں اشتیاق صاحب ...آپ ہمارے ساتھ ہی کھا لیا کریں۔''

میں نے ان کے دروازے پر پہنچ کر کہا:

''یہ اچھا نہیں لگتا ... ہاں میں بھی گھر سے کھانا لایا کرتا تو اور بات تھی ... پھر تو یہ شرکت برابری کی ہوتی... اب میرے شریک ہونے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔''

''کوئی فرق نہیں پڑتا، آپ بس آج سے ہمارے ساتھ ہی کھایا کریں۔''

میں نے پھر کہا: ''جی نہیں نقش صاحب ... میں اس طرح روزانہ شرم

محسوس کرتا رہوں گا۔''

عین اس وقت مجھے ایک بات سوجھی ... میں نے کہا:

'' ہاں! اس کی ایک صورت ہے۔''

'' اور وہ کیا؟ ''

'' میں جب بھی جھنگ جاتا ہوں تو وہاں سے دیسی گھی لاتا ہوں ... میں وہ گھی یہاں رکھ دیتا ہوں... دال میں یا کسی اور سالن میں گھی ڈالنے کی ضرورت پیش آئے تو اس میں سے ڈال لیا کریں ... اس صورت میں میری بھی کوئی چیز کھانے میں شامل ہو جائے گی اور میں شرم محسوس نہیں کیا کروں گا... بلکہ میں اپنی روٹی بازار سے لے آیا کروں گا... صرف سالن میں شرکت ہو جایا کرے گی۔''

'' چلیں ٹھیک ہے...'' سب نے ایک ساتھ کہا۔

اور پھر میں ان کے ساتھ کھانا کھانے لگا ... اس طرح دوپہر کے وقت بازار کے کھانوں سے نجات ملی ... اور ان دوستوں سے بھی گاڑھی چھننے لگی۔

ہم سب ایک دوسرے کے نام سے بخوبی واقف تھے... یعنی سب جانتے تھے ... کون کیا کرتا ہے ... اس کی ڈیوٹی کیا ہے... نقش محمد صاحب کا کام تھا تمام کتابوں کا حساب کتاب رکھنا... یعنی کون سی کتاب کتنی تعداد میں شائع ہوتی ہے... اس میں سے روزانہ کتنی کتب سیل ہوئی ہیں... باہر کتنی ہیں... اس کے علاوہ سب کی تنخواہوں کا حساب کرنا... وغیرہ...

صبح میں ان سے علیک سلیک کرنے جاتا تو ان کے کتابوں والے رجسٹر پر نظر ڈالتا، یہ دیکھتا کہ آج میری فلاں فلاں کتاب کتنی فروخت ہوئی ہے... پھر یہ دیکھنا گویا شوق بن گیا... ادھر نقش محمد سے دوستی گہری ہونے لگی تھی... رجسٹر اٹھا کر دیکھنے پر کوئی پابندی تو تھی نہیں... نہ وہ کوئی پوشیدہ رجسٹر تھا... مجھے تو اس وقت صرف یہ دلچسپی تھی کہ میری کتابیں کس رفتار سے فروخت ہورہی ہیں ...لیکن وقت کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایک سوچ سر ابھار رہی تھی... ایک نیا خیال جنم

لے رہا تھا اور وہ یہ تھا:

''یہ لوگ ... یعنی پبلشرز حضرات مجھے ایک مسودے کے دو تین سو روپے سے زیادہ نہیں دیتے اور خود یہ کتنا کماتے ہیں... ناول خوب فروخت ہو رہے تھے ... کراچی بک ڈپو کے مالک خالد لطیف خود مجھ سے اس بات کا اظہار کر چکے تھے کہ آپ کے ناول کراچی میں مشہور ہو رہے ہیں۔

میں دوسروں سے یہ بات کہتے ہوئے ڈرتا بھی تھا کہ کہیں بات رب نواز صاحب تک نہ پہنچ جائے... لیکن میں کب تک خاموش رہتا۔ میرے اندر تو اُبال اٹھ رہے تھے ... آخر ایک دن میں نے سلیم اختر سے دل کی بات کہہ ہی دی...'' میں نے ان سے کہا:

'' یار سلیم اختر صاحب! ایک بات کہنے کو بہت جی چاہتا ہے... لیکن ڈرتا بھی ہوں... کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

سلیم اختر نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا... شاید اسے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ اس شخص کے پاس بھلا ایسی کیا بات ہوسکتی ہے۔

آخر انہوں نے کہا: ''ایسی کیا بات ہے... جس کے کہنے سے آپ ڈر رہے ہیں۔''

'' بس ہے! ایک بات ... میں نے سب سے پہلے آپ سے ذکر کیا ہے ... کیونکہ آپ کافی حد تک خاموش رہتے ہیں... یعنی میری بات پسند نہ آئے تو بھی آپ بات کو اپنے تک رکھ سکتے ہیں۔''

'' اگر بات راز کی ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔'' انہوں نے کہا۔

'' اچھی بات ہے ... میں عرض کرتا ہوں ... میرے ناول اب مشہور ہو چکے ہیں ... کراچی کے ڈیلر خالد لطیف، ملک صاحب کے سامنے اس بات کا اظہار مجھ سے کر چکے ہیں... میں نقش محمد صاحب کی میز پر رکھے رجسٹروں کو دیکھتا

رہتا ہوں ... اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ناولوں کی فروخت اچھی جارہی ہے ... تو...'' میں کہتے کہتے رک گیا۔ اس وقت میرا دل زور سے دھڑکا۔

''تو کیا؟''

''تو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں اپنے ناول خود شائع کروں۔''

سلیم اختر خالی خولی نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے ... شاید وہ سوچ رہے تھے کہ اس شخص کی بات کا کیا جواب دیا جائے ... آخر انہوں نے کہا:

''میں اس بات کا ذکر جلال انور سے کرتا ہوں۔ ایسا تجربہ اسے ہے۔''

''جلال انور کون ؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''ماہنامہ حکایت کے سیلز منیجر ہیں ... میں بھی ماہنامہ حکایت کا آرٹ ایڈیٹر ہوں ... جلال انور کے علاوہ میں یہ بات عبدالرشید خاکی اور محمد فاروق عظمت سے بھی کروں گا ... دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔''

''اور یہ دونوں حضرات کون ہیں۔''

عبدالرشید خاکی اور محمد فاروق حکایت کے کاتب ہیں ... دیکھو نا... پبلشنگ کا ادارہ قائم ہونے کے لیے صرف لکھنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی ... کاتب، آرٹسٹ اور سیلز منیجر کی بھی ضرورت ہوتی ہے ... اور ہم چاروں حکایت میں کام کرتے ہیں... لہٰذا آپ فکر نہ کریں ... کل میں ان کے سامنے یہ معاملہ رکھوں گا... دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

آخر سلیم اختر نے ایک شام میٹنگ طے کرلی۔

☆☆☆☆☆

O

یہ میٹنگ میرے گھر پر طے ہوئی ... گھر کا ... آپ کو بتا چکا ہوں کہ چھوٹا سا کمرہ تھا... اس میں ایک چارپائی کی جگہ کے بعد بہت تھوڑی سی جگہ بچتی تھی ... یعنی دو چارپائیوں کی جگہ بھی اس میں نہیں تھی۔

میٹنگ سے پہلے میں سلیم اختر کے ساتھ حکایت کے دفتر کا چکر لگا چکا تھا اور جلال انور، عبدالرشید خاکی اور محمد فاروق عظمت صاحب سے مل چکا تھا... حکایت میں بھی میری کچھ کہانیاں شائع ہوچکی تھیں... اس میں شائع ہونے والے میرے افسانے باہر کا آدمی کو بہت پسند کیا گیا تھا... اس افسانے کے بعد میں نے انھیں ایک مزاحیہ افسانہ لکھ کر دیا تھا... اس کا نام تھا میاں بیوی ایکشن، انھوں نے اس افسانے کو بھی شائع کیا تھا...

وہ شام چار بجے میرے گھر پہنچ گئے... میں نے سموسوں اور چائے کا انتظام کیا تھا... چائے کے دوران جلال انور صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا۔

'' میں ایک ڈائجسٹ رسالہ نکالنے کی تجویز پیش کرتا ہوں... ہم میں ایڈیٹر، آرٹسٹ، کاتب اور سرکولیشن منیجر موجود ہیں ... میرا مطلب ہے، سرکولیشن کا تجربہ مجھے ہے ... آخر میں حکایت کا سرکولیشن منیجر ہوں...تمام ڈیلروں اور بک اسٹالوں کے پتے میرے پاس موجود ہیں... اس طرح ہماری کامیابی کے امکانات روشن ہیں... اشتیاق احمد کانٹ چھانٹ اور مضامین کا انتخاب کریں گے... کتابت عبدالرشید خاکی اور محمد فاروق عظمت کریں گے، سلیم اختر ڈیزائن بنائیں

گے... پورے ملک کے بک اسٹالوں پر پرچہ پہنچانا میرا کام ہے..."

میں ان کی بات سن کر فکر مند ہوگیا... خیال بھی نہیں تھا کہ وہ ڈائجسٹ پرچے کی تجویز پیش کریں گے... لہٰذا میں نے کہا:

"ہم ناولوں کی اشاعت کیوں نہ شروع کریں، میرے ناول اب بچوں میں مقبول ہورہے ہیں... ایک ایک ہزار ناول تو بک ہی جائیں گے... اور ان شاء اللہ ہم عزت سے روزی کما سکیں گے۔"

اس پر جلال انور نے تلملائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ابھی تمہارے ناول اتنے مشہور نہیں ہوئے... مقابلے میں فیروز سنز اور شیخ غلام علی اینڈ سنز جیسے نامور ادارے ہیں ... ان کے مقابلے میں ہماری کیا دال گلے گی۔"

اس پر میں نے جل کر کہا:

"یوں تو پھر اس وقت بڑے بڑے مشہور و معروف اور کامیاب ڈائجسٹ نکل رہے ہیں، کراچی میں نکلنے والے سب رنگ ڈائجسٹ کا طوطی بول رہا ہے ... اردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ بھی کم نہیں ہیں ... خود آپ کا حکایت بھی خوب جارہا ہے اور بھی کامیاب ڈائجسٹ شائع ہورہے ہیں تو کیا ان سب کی موجودگی میں ایک ڈائجسٹ کامیاب ہوسکے گا، اس کی دال گل سکے گی۔"

میری بات کے جواب میں جلال انور نے بھی طیش میں آکر کہا:

"لیکن جب سلیم اختر ڈیزائن بنائے گا اور میں اس کی سرکولیشن کروں گا تو ناکامی آڑے نہیں آئے گی۔"

"مجھے ڈائجسٹ والی بات پسند نہیں آئی ... اس پروگرام کا محرک میں ہوں ... میں نے سلیم اختر صاحب کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی... اس تجویز کے نتیجے میں ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں ... ڈائجسٹ کی تجویز تو تھی ہی نہیں۔" میں نے بھی جلے کٹے انداز میں کہا۔

''اشتیاق احمد! میری بات پر توجہ دو ... آج کی دنیا چمک دمک کی دنیا ہے... سلیم اختر کا تیار کردہ سرورق جب اسٹال پر آئے گا تو ڈائجسٹ ہاتھوں ہاتھ بکے گا... اور ہم خوب مال کما سکیں گے۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ڈائجسٹ صرف سرورق کے بل پر بک جایا کرے گا، اندر مواد چاہے جیسا بھی ہو۔'' میں نے اسے گھورا۔

''یہ بات نہیں ... مواد کی اپنی اہمیت ہے ... لیکن سب سے پہلے نظر سرورق پر پڑتی ہے ... اور سرورق کو خوب صورت ترین بنانا آرٹسٹ ہی کا کام ہے۔'' سلیم اختر نے بھی جلال انور کی تائید کی۔

''ٹھیک ہے جلال انور! آپ حساب لگائیں کہ ڈائجسٹ کے لیے ہمارے پاس کتنا سرمایہ ہونا چاہیے۔''

جلال انور کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا ... حساب کتاب لگانا اس کا کام تھا ... ہمیں اس کی کوئی سدھ بدھ نہیں تھی... ہم ادھر اُدھر کی باتوں میں لگ گئے... آخر جلال انور نے سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا:

''ہمارے پاس کم از کم تیس ہزار روپے ہونے چاہئیں۔''

''گویا ہر ایک کو چھ ہزار روپے کا بندوبست کرنا پڑے گا، لیکن میرے پاس چھ ہزار روپے نہیں ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''اور نہ میرے پاس ہیں۔'' محمد فاروق عظمت نے فوراً کہا۔

''یوں تو میرے پاس بھی چھ ہزار نہیں ہیں، لیکن میں بندوبست کر لوں گا۔'' جلال انور نے کہا۔

سلیم اختر اور عبدالرشید خاکی خاموش رہے ... ان کی مالی حیثیت بہت اچھی تھی ... یہ بات ہم سب کو معلوم بھی تھی ... چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سلیم اختر نے کہا:

''تب پھر پیسوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا۔''

"سوچو، غور کرو... جیسے بھی ہو، اتنے پیسے جمع کرو... آج کی میٹنگ ختم... اب ہم اگلے ہفتے پھر یہیں جمع ہوں گے... شام کو چار بجے... اور دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا قدم اٹھایا گیا۔" جلال انور نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ چاروں چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں گم ہوگیا... میں خود کو بے حد پریشان محسوس کر رہا تھا... دوسرے دن میں نے اس میٹنگ کا ذکر نقش محمد صاحب سے کیا... وہ سنتے ہی کہنے لگے

"اشتیاق صاحب! میں خود ان دنوں پریشان ہوں... یہاں سے چھ سو روپے تنخواہ ملتی ہے جب کہ میرے گھر کا خرچ بارہ سو روپے ماہوار ہے... چھ سو روپے کے قریب ہر ماہ بنک سے نکلوا لیتا ہوں... بنک میں وہ رقم جمع ہے... جو مجھے فوج سے ریٹائر ہوتے ہوئے ملی تھی... صورتِ حال اگر یہی رہی تو یہ رقم کب تک چلے گی... مجھے تو بس یہ فکر کھائے جارہی ہے... اگر آپ لوگ اپنا کوئی کاروبار شروع کریں تو مجھے بھی اس میں شریک کرلیں... میں ادارے کا اکاؤنٹ کا کام سنبھال لوں گا۔"

ان کی بات سن کر میں نے کہا:

"اچھی بات ہے... میں سلیم اختر وغیرہ سے بات کروں گا۔"

ایک ہفتے بعد ہماری میٹنگ پھر ہوئی، جلال انور اور محمد فاروق رقم کا بندوبست کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس روز بھی میں نے ان کے لیے چائے اور سموسوں کا بندوبست کیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے ہم نے بات چیت بھی جاری رکھی۔

"میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک باقاعدہ ڈائجسٹ نکالنے کے لیے ہمیں کافی سرمائے کی ضرورت ہے، لیکن اگر ہم بچوں کے ناول شروع کریں تو اس کے لیے ہمیں کم رقم کی ضرورت ہوگی... آخر آپ اس پہلو پر کیوں غور نہیں کرتے... کیوں

نہ ناولوں کی اشاعت شروع کی جائے ...کسی قابل ہوں گے تو ماہانہ رسالہ بھی نکال لیں گے۔''

'' اشتیاق احمد کی تجویز معقول ہے... ہمارے موجودہ مسئلے کا حل یہی ہے ... ڈائجسٹ کے لیے تو ہم میں سے تین رقم کا بندوبست ہی نہیں کر سکے۔'' محمد فاروق نے آخر میری تائید میں بات کی۔

'' لیکن! ناولوں کی کامیابی کا امکان بھی بہت ہی کم ہے ... جب کہ بڑوں کا رسالہ سب لوگ پڑھتے ہیں۔'' جلال انور نے اب بھی ٹس سے مس نہ ہوتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔

'' خیر جیسے آپ سب کی مرضی ... میں بہرحال چھ ہزار کا بندوبست نہیں کر سکتا ...'' جلال انور اور محمد فاروق بھی مجھ جیسے ہی تھے... لہٰذا ان دونوں نے بھی صاف کہہ دیا۔

'' ہم دونوں بھی بندوبست نہیں کر سکتے۔''

اب کمرے میں خاموشی چھا گئی ... کیونکہ بات اٹک گئی تھی ...

جلال انور کسی صورت ناولوں کی اشاعت پر تیار نہیں تھا... اور ڈائجسٹ کے لیے ہم میں سے تین کے پاس رقم نہیں تھی... اب مسئلہ حل ہو کیسے...'' آخر جلال انور نے کہا۔

'' ایک میٹنگ اور سہی۔''

'' ایک میٹنگ اور سہی کا کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

'' ہم کل یا پرسوں پھر ایک میٹنگ رکھ لیتے ہیں ... اس دوران سب سوچ لیں اور آئندہ میٹنگ میں صرف فیصلہ کن بات مانی جائے گی... یعنی آر یا پار... ہم فیصلہ کر کے ہی اٹھیں گے۔''

'' چلو ٹھیک ہے... میٹنگ کا وقت، تاریخ اور جگہ طے کر لو۔'' میں نے

کہا۔

'' اس بار نگار سینما کے باہر مرغ چھولوں کا جو بڑا سا ہوٹل ہے ... وہاں میٹنگ رکھ لیتے ہیں ... اس دوران مرغ چھولے کھائیں گے اور پروگرام طے کریں گے۔''

'' تم نے صرف جگہ بتائی ہے، وقت اور دن نہیں بتایا۔'' سلیم نے فوراً کہا۔

'' پرسوں دوپہر کے وقت رکھ لیتے ہیں۔''

'' بس ٹھیک ہے... یہ طے رہا۔''

اس روز بات یہیں تک رہی ... وہ چاروں رخصت ہوگئے ... میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔

میں صرف اور صرف اپنے ناول شروع کرنے کے موڈ میں تھا۔

میں نے دوسرے دن نقش محمد صاحب سے اس میٹنگ کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ معاملہ کہاں اٹکا ہوا ہے... میری بات سن کر وہ بولے۔''

'' اشتیاق صاحب ... چھوڑیں ان لوگوں کو ... صرف میں اور آپ مل کر پبلشنگ کا ادارہ شروع کر لیتے ہیں ... آپ ایک پیسہ بھی نہ لگائیں... سرمایہ سارا میں لگاتا ہوں ... آپ بس ناول لکھتے جائیں... باقی کام میں کرلوں گا۔''

'' لیکن نقش محمد صاحب ... آپ کو اور مجھے سرکولیشن کا کوئی تجربہ نہیں ہے ... یہ تجربہ جلال انور صاحب کو ہے ... ہم سرکولیشن نہ کر سکے... تو کامیاب کیسے ہوسکیں گے... اس وقت ہماری جو ٹیم ہے ... اس میں اپنے اپنے شعبے کے لوگ موجود ہیں ... لہٰذا ہم نہایت آسانی سے ناول شائع کر سکتے ہیں اور ان شاء اللہ فروخت بھی کر سکیں گے... جب کہ آپ کے ساتھ کام شروع کرنے میں یہ آسانی نہیں ہوگی۔'' میں نے صاف بات بے دھڑک ہو کر کہہ دی۔

'' آپ کی بات ٹھیک ہے... لیکن کام تو چلا لیں گے... ملازم رکھ لیں

گے۔‘‘

’’اس طرح ہمارے اخراجات زیادہ ہوں گے... جب کہ ہم کم سے کم خرچ کر کے اپنا کام چلانا چاہیں گے۔‘‘

’’آپ کی یہ بات بھی ٹھیک ہے۔‘‘

’’اور رہ گئی بات اکاؤنٹنٹ کی... تو میں ان کے سامنے تجویز رکھوں گا کہ ہم نقش محمد صاحب کو بھی شامل کر لیتے ہیں... وہ بھی ہمارے برابر کے حصے دار ہوں گے... پیسے لگانے کو بھی تیار ہیں اور ہمارے ادارے کا اکاؤنٹ وہ کیا کریں گے۔‘‘

’’چلیے یونہی سہی... اگر وہ مجھے شامل کر لیتے ہیں تو میں ہر طرح تیار ہوں۔‘‘ انہوں نے خوش ہو کر کہا۔

دو دن بعد بھاٹی گیٹ کے باہر نگار سینما کے ساتھ واقع مرغ چنے ہوٹل میں ہم دوپہر کے وقت پہنچ گئے ... میں نے مرغ چھولے کا آرڈر دیا ... تا کہ ہوٹل کے بیرے ہمیں گھورنا نہ شروع کر دیں کہ یہ کوئی آرڈر تو دے نہیں رہے... بس باتیں کیے جا رہے ہیں۔‘‘

مرغ چنے اور روٹیاں میز پر رکھ دیے گئے... ہم کھانے لگے، اس وقت میں نے کہا:

’’ہاں! ان دو دنوں میں آپ لوگوں نے کیا سوچا... میں آپ سب کو یہ بتانا پسند کروں کہ نقش محمد صاحب تنہا میرے ساتھ مل کر سرمایہ لگانے کے لیے تیار ہیں ... اگر آپ لوگ اب بھی تیار نہ ہوئے تو میرا اور آپ کا راستہ الگ ہوگا... ہم صرف اور صرف ناولوں کی اشاعت کے سلسلے میں آپ کے ساتھ ہوں گے... ڈائجسٹ کے سلسلے میں میں ساتھ کسی طرح نہیں دوں گا۔‘‘

میری دو ٹوک بات سن کر جلال انور دھک سے رہ گیا... سلیم اختر بھی مجھے گھورنے لگا... آخر اس نے کہا:

”ٹھیک ہے ... ہم ناول شروع کیے لیتے ہیں ... جلال انور ... حساب لگاؤ ... پہلے مہینے اگر ہم چار ناول ایک ایک ہزار شائع کریں تو کتنے سرمائے کی ضرورت ہوگی۔“

جلال انور کھانا بھول کر حساب کرنے لگا ... ہم کھانا کھاتے رہے... آخر اس نے کہا:

”کم ازکم ہمیں دس ہزار روپے کی ضرورت ہوگی ... اگر ہم چار ناول شائع کریں۔“

”ارے بس! دو دو ہزار روپے فی کس۔“ عبدالرشید خاکی نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں بس! کام چلنا ہوا تو انھی سے چل جائے گا ... ورنہ صرف یہ ہوگا کہ ہمارے دو دو ہزار روپے ڈوب جائیں گے ... لیکن یہ کوئی اتنا بڑا نقصان نہیں ہوگا۔“ جلال انور نے کہا۔

”کیا خیال ہے... ہم سب دو دو ہزار روپے تو دے سکیں گے نا۔“ عبدالرشید نے سب پرنظر ڈالی۔

”بالکل۔“ سلیم اختر نے کہا۔

”میرے پاس دو ہزار روپے ہیں۔“ محمد فاروق عظمت نے بھی فوراً کہا۔

”اور میرے پاس بھی ہیں۔“ جلال انور مسکرایا۔

”دو ہزار کیا ... میں تو دس ہزار لگانے کے لیے تیار ہوں۔“ عبدالرشید خاقی نے منہ بنایا۔

”نہیں... ہر ایک کا برابر حصہ ہوگا۔“ جلال انور نے انکار میں سر ہلایا۔

میں نے ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا... وہ چاروں میری طرف دیکھنے لگے۔ اب میں نے کہا۔

'' پہلے یہ طے ہوجائے کہ تم لوگ مجھے فی ناول کتنے پیسے دو گے۔''

'' پانچ سو روپے فی ناول۔'' جلال انور نے فوراً کہا۔

'' اور کیا نقد ادائیگی کی جائے گی۔''

'' ہاں کیوں نہیں ... میں نے جو حساب لگایا ہے... اس میں ادائیگیاں نقد کی جائیں گی... اور جب چار ناول شائع ہوجائیں گے تو ہمارے پاس دس ہزار روپے میں سے کچھ بھی نہیں ہوگا... لیکن ہم ناول بازار میں دیں گے ... ان کے پیسے وصول ہونے شروع ہوجائیں گے... اس دوران ہم اگلے چار ناولوں کی تیاریاں شروع کریں گے ... ناول تم لکھ کر دو گے نا ... عبدالرشید اور محمد فاروق کتابت کرتے رہیں ... اس طرح بیس دن میں ہم دوبارہ ناولوں کی اشاعت کے لیے تیار ہوچکے ہوں گے ... فکر کی کوئی بات نہیں۔''

'' تو پھر میں چار ناول دے دیتا ہوں۔'' میں مسکرا دیا۔

'' کیا مطلب؟ '' ان چاروں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

'' بھئی ... جب تم لوگ نقد ادائیگی کرو گے تو پھر مجھ سے رقم لینے کی کیا ضرورت ہے ... میں چاروں مسودے دیتا ہوں ... تم ان کی کتابت شروع کر دو ... باقی ساتھی دو دو ہزار جلال انور کے حوالے کر دیں۔''

انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا: '' گویا تم نقد رقم نہیں دو گے۔''

'' میرے پاس ہیں ہی نہیں تو دوں گا کہاں سے... میری تو شروع سے یہ سوچ تھی کہ نقد رقم کی بجائے میں مسودے دے دوں گا... لیکن آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

'' ٹھیک ہے... کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

'' اچھی بات ہے... اب تم مسودے کب دو گے۔''

'' اللہ کی مہربانی سے میرے پاس چار مسودے تیار ہیں۔''

'' کیا!!! '' ان کے منہ سے نکلا۔ وہ بہت حیران نظر آئے۔

'' ویسے تم لوگ فکر نہ کرو ... موقع ملنے پر اپنے حصے کے دو ہزار جمع کرا دوں گا۔''

'' چلو ٹھیک ہے ... لیکن اشتیاق احمد ... تم نے ایک بات نہیں سوچی۔'' جلال انور کے لہجے میں قدرے طنز تھا۔

'' اور وہ کیا۔'' میں نے اسے گھورا۔ اس کا طنزیہ لہجہ بہت برا لگا تھا۔

''جب ہمارے چار ناول چھپیں گے تو ظاہر ہے ... رب نواز ملک اور ارشد نیاز کو پتا چل جائے گا ... کیا تم نے سوچ لیا ہے کہ اس وقت کیا ہوگا۔''

'' مجھے کسی حد تک اندازہ ہے... وہ ناراض تو ہوں گے ... لیکن کر کچھ نہیں سکیں گے ... کیونکہ میرے پاس ان کے اعتراض کا جواب ہے... تم ان کی بات چھوڑو ... کام شروع کرنے کی بات کرو۔''

'' اچھی بات ہے ... لیکن۔''

'' لیکن کیا۔''

'' ہم ایک نازک کام کرنے چلے ہیں... اس کام کے ساتھ ہمیں اپنی اپنی ملازمت کی بھی شدید ضرورت ہوگی... کیونکہ ہم ملازمت کرتے رہیں گے... اور تنخواہ سے اپنی گزر بسر کرتے رہیں گے... ادارے سے فی الحال منافع نہیں لیں گے ... لیکن اگر تمہاری ملازمت چھوٹ گئی تو تمھارے لیے مسئلہ کھڑا ہوجائے گا۔''

'' تم فکر نہ کرو... میں نے کہا نا ... میرے پاس ان کے اعتراض کا جواب ہے۔''

'' اچھی بات ہے۔''

ہم اٹھ گئے... ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے کہ جلال انور نے چونک کر کہا: '' ایک بات ہم بھول گئے۔''

'' اور وہ کیا؟''

'' ہم نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ ہمارے ادارے کا نام کیاہوگا۔''

''اوہ ہاں واقعی... نام کے بغیر ناول کیسے شائع ہوں گے۔''

''تب پھر سوچو۔''

اب ہم مرغ چھولے ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے ادارے کا نام سوچنے لگا۔آخر سلیم اختر نے کہا:

''میرے ذہن میں ایک نام آیا ہے۔''

''تو بتا دو۔'' میں نے فوراً کہا۔

''اقرا... مکتبہ اقرا۔''

جلال انور پنجابی بولتا تھا... وہ لفظ اقرا کو کچھ اور ہی سمجھا... اس نے کہا:

''بالکل ٹھیک... مکتبہ اک راہ، یعنی ایک ہی راستہ۔''

اس پر ہمیں زبردست ہنسی آئی ... میں نے اور سلیم اختر نے تو پیٹ پکڑ لیے ... آخر میں نے کہا:

''اک راہ نہیں بھائی اقرا... قرآنِ کریم میں نازل ہونے والا سب سے پہلا لفظ جب آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم غارِ حرا میں تشریف فرما تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلی وحی لے کر آئے تھے تو انہوں نے آپ سے کہا تھا۔''

''اقرا۔''

آپ نے جواب میں فرمایا تھا... میں نہیں پڑھ سکتا... ایک مرتبہ جبرئیل علیہ السلام نے پھر کہا تھا:

''اقرا۔''

آپ نے پھر یہی فرمایا تھا، میں نہیں پڑھ سکتا۔

اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو سینے سے لگا کر بھینچا تھا اور کہا تھا:

''اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے جس نے انسان کو پیدا فرمایا۔''

تب آپ نے پڑھا تھا ... تو سلیم اختر اقرا کہہ رہے ہیں... یعنی مکتبہ

اقرا... اور میرے خیال میں یہ بہترین نام ہے... مکتبے کا نام اس سے بہتر شاید ہی کوئی ہو۔''

'' بالکل ٹھیک۔'' محمد فاروق نے خوش ہو کر کہا۔ وہ کافی حد تک مذہبی خیالات کا حامل تھا۔

'' مجھے بھی یہ نام پسند ہے۔'' عبدالرشید خاکی نے کہا۔

'' بس تو پھر یہ نام طے ہوگیا... لیکن ہم نے ایک اور بات نہیں سوچی... ادارے کا دفتر کہاں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

'' اس کی تم فکر نہ کرو۔'' سلیم اختر نے مسکرا کر کہا۔

'' وہ کیوں۔''

'' میرے بھائی سعیداختر آرٹسٹ ہیں... اور انہوں نے شاہ عالم مارکیٹ میں دوسری منزل پر دو کمرے لے رکھے ہیں ... فی الحال ہم ان سے ایک کمرہ لے لیں گے... یا ان کے ساتھ کوئی اور کمرہ خالی ہوا تو وہ کرائے پر لے لیں گے... فی الحال تم چار مسودے عبدالرشید اور محمد فاروق کو دے دو... یہ دونوں دو دو مسودے کتابت کر دیں گے ... سلیم اختر ان کو پڑھ کر ان کا سرورق بنانا شروع کر دیں گے ... میں ان کے اشتہار وغیرہ بناتا ہوں ... پہلے چار ناولوں کے نام کیا ہیں؟ ''

'' محمود فاروق فرزانہ کا اغوا ، کمرہ نمبر420 ، خون کی تحریر اور پہاڑیوں میں موت۔'' میں نے نام بتا دیے۔

دوسرے دن میں نے انھیں چار مسودے دے دیئے۔ اس طرح گویا نئے ادارے کے لیے عملی کام کی ابتدا ہوگئی۔

'محمود فاروق فرزانہ کا اغوا' پہلا ناول تھا جس کی دو باتیں لکھی گئیں۔

گویا دو باتیں کا آغاز بھی اسی ناول سے ہوا۔

☆☆☆☆☆

O

جن دنوں مکتبہ اقرا کے سلسلے میں ہماری میٹنگیں ہو رہی تھیں ... انہی دنوں ایک اور سلسلے کا بھی اچانک ہی آغاز ہوگیا ... میرے لئے یہ نیا معاملہ بھی حد درجے حیرت انگیز تھا... ہوا یوں کہ ایک روز ایک بھاری بھرکم سے بدن والے شخص اُس شام ملاقات کے لیے مکان نمبر دو ، شیخ اسٹریٹ والے گھر پر آئے...

'' تشریف رکھیے ! '' میں نے کمرے میں بچھی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بیٹھ گئے ... ان کے ساتھ ہی میں بھی بیٹھ گیا... چند لمحے خاموشی کے عالم میں گزر گئے ... آخر انہوں نے کہا:

'' میرا نام غلام رسول ہے ... میرا ایک ادارہ ہے ... چھوٹا سا ... میں اس سے بچوں کی کتب شائع کرتا ہوں ... ادارے کا نام ہے مکتبہ باغ و بہار ... میں چاہتا ہوں... آپ میرے ادارے کے لیے بھی ناول لکھیں... انسپکٹر جمشید کے ناول۔''

بعد میں معلوم ہوا کہ مارکیٹ میں لوگ انہیں ماسٹر غلام رسول کے نام سے پکارتے ہیں

'' انسپکٹر جمشید پر تو شیخ غلام علی اینڈ سنز ناول لکھوا رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''خیر کوئی بات نہیں... آپ کی دوسری سیریز ہے... انسپکٹر کامران مرزا ... اس پر ناول لکھ دیں۔''

''اچھی بات ہے ... آپ فی ناول کتنے پیسے دیں گے۔''

''آپ بتائیں۔'' اس نے کہا۔

میں سوچ میں پڑ گیا... اس وقت تک بھی شیخ غلام علی اینڈ سنز ایک ناول کے سوا دو سو روپے دے رہے تھے ... اور فیروز سنز والے 300 روپے کے قریب دے رہے تھے... اب میں سوچ رہا تھا کہ ان صاحب کو کیا بتاؤں ... آخر میں نے کہہ دیا:

''ایک ہزار روپے فی ناول۔''

انہوں نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا ... آخر کہنے لگے:

''کیا یہ زیادہ نہیں ہیں۔''

''نہیں... میں نے حالات کا جائزہ لے کر بتائے ہیں... یہ زیادہ نہیں ہیں۔''

اب وہ سوچ میں پڑ گئے... آخر کہنے لگے:

''ایک ہزار ہی سہی، آپ پہلا ناول کب تک دے دیں گے۔''

''آپ کو کب تک چاہیے۔'' میں نے پوچھا۔

''میں تو کہتا ہوں... ابھی دے دیں۔''

''اس وقت میرے پاس انسپکٹر کامران مرزا کا کوئی مسودہ تیار نہیں ہے... آپ چار دن بعد آکر لے جائیں... ہزار روپے لیتے آیئے گا۔''

''اچھی بات ہے... چار دن بعد ملاقات ہوگی۔''

وہ تو ہاتھ ملا کر چلے گئے اور میں حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے... مجھے تو پہلے ناول کے صرف پچاس روپے ملے تھے... اس کے بعد فیروز سنز اور شیخ غلام علی اینڈ سنز سوا دو سو روپے اور تین سو سے آگے نہیں بڑھے تھے... لیکن اب

یہ صاحب ایک ہزار روپے دینے پر تیار تھے ... یہ بات میرے لیے انتہائی اچنبھے کی تھی... اچنبھے کے ساتھ ساتھ میں حد درجے خوشی بھی محسوس کر رہا تھا...

چار دن پورے ہوتے ہی ماسٹر غلام رسول آ گئے ... ان کی دکان اسلام پورہ میں ہی تھی اور میرا گھر بھی وہیں تھا ... ان کی اسلام پورہ بازار میں اخبارات کی ایجنسی تھی ... وہیں وہ کتابوں کی اشاعت کا کام بھی کرتے تھے ... انہوں نے آتے ہی پوچھا:

''ناول تیار ہے۔''

''جی بالکل۔''

''یہ لیں ایک ہزار روپے اور مسودہ مجھے دے دیں۔''

میں نے انھیں ناول کا مسودہ دے دیا ...

اس کا نام تھا پراسرار وارداتیں... ساتھ ہی وہ کہنے لگے:

''دوسرا ناول شروع کردیں ... میں چار دن بعد آ کر لے جاؤں گا اور اس کے بعد آپ ہمیں ہر ماہ ایک ناول لکھ دیا کریں۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ کہا۔

آمدنی کا ایک اور ذریعہ شروع ہو چکا تھا۔ ابھی جلال انور وغیرہ کے ساتھ میٹنگوں میں میں ان سے کہہ چکا تھا کہ میرے پاس تو دینے کے لیے دو ہزار روپے بھی نہیں ہیں، لیکن اب دو ماہ بعد میں اس پوزیشن میں آنے والا تھا کہ اپنے حصے کے دو ہزار روپے انھیں دے دوں... اس خیال نے اطمینان کی ایک لہر دوڑا دی۔

چار دن بعد مکتبہ باغ و بہار والے ماسٹر غلام رسول صاحب پھر آ گئے... کہنے لگے: '' آپ کا پہلا ناول پراسرار وارداتیں کتابت ہوگیا ہے اور ہم اسے پریس میں دے رہے ہیں، سرورق بھی جلد بن جائے گا ... امید ہے، اس ماہ کے آخر تک کتاب شائع ہوجائے گی، آپ سنائیں، دوسرے ناول کا مسودہ تیار ہے۔''

''جی ہاں تیار ہے۔''

انہوں نے ایک ہزار روپے نکال کر دے دیئے ... میں نے انھیں دوسرے ناول کا مسودہ دے دیا... اس کا نام تھا موت کا کھیل... مسودہ دینے کے بعد انہوں نے کہا:

'' اب میں ایک ماہ بعد آؤں گا ... تیسرا ناول لینے کے لیے ... آپ تیار رکھیے گا۔''

''جی اچھا۔'' میں نے کہا۔ وہ تو مسودہ لے کر چلے گئے اور میں حیرت کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ حالات میرے لیے حیرت انگیز تھے۔

ایک طرف تو مکتبہ اقرا کے کام کی ابتدا ہوچکی تھی ... دوسری طرف میں پریشانی محسوس کر رہا تھا ... میں سوچ رہا تھا... جب چارناول مکتبہ اقرا کے تحت اسٹالوں پر رکھے جائیں گے اور ملک صاحب اور ارشد نیاز صاحب کو پتا چلے گا تو کیا ہوگا ... ان دنوں روشن کتابیں اور نئے ناولوں کے سلسلے میں یہ دونوں حضرات اسٹالوں کے چکر لگاتے تھے ... اور جلال انور مکتبہ اقرا کے جو اشتہار بنا رہا تھا... وہ کیلنڈر نما تھے... ان کو رسی سے لٹکایا جانا تھا... دونوں سائیڈوں پر اشتہار لگایا جانا تھا... تاکہ وہ اسٹالوں پر گھومتے نظر آئیں اور لوگوں کی نظریں ان پر پڑیں...

اس وقت میرے سر پر بس ایک ہی بھوت سوار تھا ... یہ کہ کسی طرح ہمارا ذاتی ادارہ شائع ہوجائے اور بس... اس کے بعد جو ہوتا ہے ہوجائے...

اس سارے پروگرام کے بارے میں شیخ غلام علی اینڈ سنز کے ادارے میں اگر کسی کو کچھ معلوم تھا تو وہ تھے نقش محمد صاحب ... سلیم اختر وغیرہ سے میں نے یہ بھی کہا تھا:

'' میں چاہتا ہوں... ہم نقش محمد صاحب کوبھی اس کاروبار میں اپنے ساتھ شامل کر لیں ... مالی اعتبار سے ان کی پوزیشن بہتر ہے۔''

میری بات سنتے ہی جلال انور نے کھٹ سے کہہ دیا:

'' نہیں! بس ہم پانچ ہی کافی ہیں ... اس طرح منافع چھ حصوں میں

تقسیم ہوگا۔''

دوسرے دن میں نے نقش محمد صاحب کو بتایا:

''نقش محمد صاحب ... جلال انور اس کام میں مزید کوئی حصے دار رکھنے پر تیار نہیں ہے ... تاہم ہمارا ادارہ چل گیا تو ہم آپ کو اس میں اکاؤنٹنٹ ضرور رکھیں گے۔''

''کوئی بات نہیں اشتیاق صاحب ... خیر ہے۔'' بظاہر انہوں نے خوش دلی سے کہا ... لیکن اندر سے وہ میری بات سن کر پریشان ہوگئے تھے ... شاید ان کا خیال تھا کہ ہم لوگ انھیں شامل کر لیں گے ... وہ جانتے تھے کہ میری مرضی ہے لیکن ان چار کی مرضی نہیں ہے ... پانچ ساتھیوں میں سے چار کا ووٹ نفی میں تھا ... ایک کا ووٹ کیا کرتا ... ہم نے شروع میں ہی یہ طے کر لیا تھا کہ جو کام کریں گے ... پانچوں کے مشورے سے کریں گے ...

تقریباً ایک ماہ میں چاروں ناول کتابت ہوگئے ... اس دوران میں نے مزید ناول لکھنے کا کام جاری رکھا تھا ... میں نے ایک دن بھی ضائع نہیں کیا تھا ... کیونکہ اب مجھے ایک ماہ میں پانچ ناول لکھنے تھے ... چار اپنے ادارے کے ... اور ایک ناول مکتبہ باغ و بہار کا ...

اس دوران سلیم اختر نے بھی چاروں ناولوں کے سرورق بنا لیے تھے ... ہم سبھی کو ان کے بنائے ہوئے سرورق اچھے لگے تھے ... اس نے خوب محنت کی تھی ... ادھر میں نے ناول بہت توجہ سے لکھے تھے ... کیونکہ آخر پہلی بار ہمارے ادارے کے ناول بازار میں آنے تھے ... اگر پہلا تاثر ہی اچھا نہ ہوتا تو بعد میں کون توجہ دیتا ... جلال انور نے بھی اشتہار تیار کر لیے تھے ... ان کے الفاظ میرے تھے ... جب کہ ڈیزائن جلال انور نے تیار کیے تھے ...

میں نے اشتہار پر یہ الفاظ درج کیے:

اشتیاق احمد کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور نئے چار ناول شائع ہوگئے ہیں۔

اس تحریر کے نیچے چاروں کے نام تھے اور ان کے سامنے ان کی قیمتیں بھی درج تھیں ... ہم نے قیمت فی ناول 4 روپے یا ساڑھے چار روپے رکھی تھی ... کیونکہ شیخ غلام اینڈ سنز اور فیروز سنز کی قیمتیں بھی تقریباً اتنی ہی تھیں ... ہم نے سوچا تھا... قیمتیں ان سے زیادہ ہرگز نہیں ہونی چاہئیں کم بے شک ہوں...

جب سب تیاریاں ہوگئیں تو باری آئی کاغذ خریدنے کی ... کاغذ خرید کر پریس کے حوالے کرنا تھا ... تبھی ناول چھپتے ... کاغذ کی مارکیٹ میں جلال انور کے کئی واقف تھے ... اس نے چار ناولوں کے حساب سے نیوز پرنٹ خرید لیا... اور پھر کاغذ پریس پہنچ گیا... اس پریس سے حکایت بھی چھپتا تھا۔

ناولوں پر پتے کی جگہ پر14.B شاہ عالم مارکیٹ لاہور لکھا گیا ...

سلیم اختر کے بھائی سعید اختر صاحب نے اپنے ساتھ والا کمرہ ہمیں کرائے پر دلوا دیا تھا... گویا اب وہ مکتبہ اقرا کا دفتر تھا۔

اب جب کہ کتب چھپنے جارہی تھیں، ہم نے اس راز میں نذیر ہاشمی صاحب کو بھی شامل کر لیا ... وہ بھی ہمارے پرخلوص دوست تھے... راز میں شامل نہ کرتے تو بعد میں وہ ناراض ہوتے، آخر ہم نے ناولوں کے کتابت ہوئے صفحات پریس میں دے دیئے ... اور اس نے پرنٹنگ کا کام شروع کر دیا ... کتابوں کے اشتہارات چھپنے کے لیے دے دیے گئے ... ہم چاہتے تھے... ادھر کتابیں بک اسٹالوں پر رکھی جائیں، ادھر اشتہار لٹکے نظر آئیں...

اشتہار چھپ کر آئے تو ہم انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے ... وہ چار رنگ میں خوب چمک دمک رہے تھے... سچ تو یہی ہے کہ جلال انور اور سلیم اختر کا تجربہ کام کر رہا تھا... اور پھر ناولوں کے سرورق چھپ کر آگئے... انھیں دیکھ کر ہم اور بھی زیادہ خوش ہوئے، اب ناول رہ گئے تھے... پریس والے کے پاس چونکہ پہلے سے کافی کام تھا اور اس نے کہا تھا کہ جو کام اس وقت ہورہا ہے... اس کے ختم ہونے پر ہی ناول چھپیں گے... اس لیے پریس میں کچھ دیر لگے گی...

یوں بھی ہمارا بالکل نیا کام تھا ... پریس والا لحاظ تو کر رہا تھا... کیونکہ جلال انور سے اس کا تعلق تھا... لیکن زیادہ جوش نہیں دکھا رہا تھا... آخر کار ناول بیس دن کے انتظار کے بعد چھپ ہی گئے... بس اسی روز پمفلٹ نما اشتہار اسٹالوں پر پہنچا دیئے گئے ... جلال انور نے یہ کام سائیکل پر بیٹھ کر ایک ایک اسٹال پر جا جا کر کیا... باقیوں نے بھی سائیکلوں پر دوڑیں لگائیں... اسٹال والے حکایت کی وجہ سے جلال انور کے خوب واقف تھے... اس لیے کسی نے بھی اشتہار لٹکانے سے انکار نہیں کیا... دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک بک اسٹالوں والے اشتیاق احمد اور انسپکٹر جمشید سیریز کو جاننے پہچاننے لگے تھے... پڑھنے والے یہ کہہ کرناولوں کا پوچھنے لگے تھے...

"اشتیاق احمد کا کوئی ناول آیا ہے۔"

لٹکنے والے اشتہارات نے خوب کام دکھایا... لیکن ایسے اشتہار صرف ہم نے ہی تیار نہیں کرائے تھے ... یہ کام دراصل شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شاہکار کتابوں کے سلسلے میں شروع کیا تھا ... اب ایک طرف بک اسٹالوں پر شاہکار کتابوں کے اشتہار لٹک رہے تھے... تو دوسری طرف اشتیاق احمد کے چار نئے ناولوں کے اشتہار ہوا سے چکرا رہے تھے... اور ہم ان اشتہارات کو دیکھ دیکھ کر پھولے نہیں سما رہے تھے...

شائع شدہ تمام ناولوں کو اٹھا کر ہم شاہ عالم مارکیٹ لے آئے ... اور دوسرے شہروں کے لیے پیکٹ بنانے لگے ... دوسرے شہروں کے بک اسٹال مالکان کو ہم پہلے ہی اشتہارات ارسال کر چکے تھے ... ان سے بذریعہ ڈاک آرڈر ارسال کرنے کی درخواست بھی ہم کر چکے تھے... اور ان کے آرڈر آ بھی گئے تھے ... اب انھی آرڈرز کے مطابق ہم بیٹھے پیکٹ بنا رہے تھے...

پیکٹ بنانا صرف جلال انور کو آتا تھا ... باقی ہم چاروں کو یہ کام بالکل نہیں آتا تھا ... پہلے کبھی کیا جو نہیں تھا ... لہٰذا پہلے جلال انور نے ہم چاروں کو

گزارش

شیشے کا [illegible] کے بعد "تہ خانے کا راز" آپ کے سامنے [illegible] میرا پانچواں ناول ہے۔ اس بار بھی محمود، فاروق اور فرزانہ نے خوب گل کھلائے ہیں۔ فاروق اور محمود آپ کو ہنسائیں گے بھی۔ امید ہے اس بار کا ناول دلچسپی، تجسس اور تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی کہانی اور حیرت انگیز انجام کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ پسند فرمائیں گے۔

اشتیاق احمد

پیش لفظ لکھنے کا سلسلہ اشتیاق احمد صاحب نے پانچویں ناول "تہ خانے کا راز" سے شروع کیا۔ اس ناول میں پہلی بار اشتیاق احمد قارئین سے مخاطب ہوئے۔ دو باتیں سے پہلے اسے "گزارش" کہا جاتا رہا۔

دو باتیں

آپ سے دو دو باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، اسی لیے اس صفحے کا عنوان 'دو باتیں' رکھ دیا ہے۔ ہر ناول میں میں آپ سے یہ دو باتیں ضرور کروں گا اور رفتہ رفتہ آپ یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ دو باتوں کے بغیر ناول نامکمل محسوس ہوتا ہے۔ مجھ پر تاؤ نہ کھایئے کہ کیا دو باتوں کی گردان کر[illegible] گیا ہوں۔

خیر جانے دیجئے — محمود، فاروق [illegible] انہ کے بارے میں بات کر لیتے ہیں.... لیکن نہیں [illegible] ں پر بات کرنا حماقت ہوگی۔ اس پر تو بات آپ کریں گے۔ جی ہاں آپ کے خطوط ہی یہ بتائیں گے کہ ناول کس پائے کا ہے۔

آئندہ ناول کمرہ نمبر ۴۲۰ ہوگا۔ نام پڑھ کر ہنسیے مت — اس کی جھلکیاں ناول کے آخر میں پڑھ لیجئے۔

اشتیاق احمد

دو باتیں کے عنوان سے ناول کا پیش لفظ پہلی بار ''محمود، فاروق اور فرزانہ کا اغوا'' میں منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل اشتیاق احمد صاحب ''گزارش'' کا عنوان استعمال کیا کرتے تھے۔ اس طرح اوپر دی گئی دو باتیں اشتیاق احمد کی زندگی کی پہلی دو باتیں ہیں۔

پیکٹ بنانے سکھائے ... ہم مشق کرتے رہے ... آخر آدھ گھنٹے کی محنت کے بعد ٹوٹے پھوٹے اور لبوترے سے پیکٹ بنانے آگئے ... جلال انور ہمارے بنائے ہوئے پیکٹ دیکھ دیکھ کر ہنس پڑتا تھا ... لیکن یہ حالت ایک دو دن تک رہی... پھر ہمیں بھی صاف ستھرے پیکٹ بنانے کا ڈھنگ آگیا... جب تمام پیکٹ تیار ہوگئے تو انھیں اٹھا کر ڈاک خانے لایا گیا اور سب کو پارسل کیا گیا ... اس طرح کراچی، راولپنڈی، اور دوسرے تمام بڑے شہروں کو پیکٹ روانہ کر دیے گئے... لاہور میں تین تھوک فروشوں کو ناول دیے گئے...

اس سارے کام سے فارغ ہو کر جب ہم نے حساب کتاب کا جائزہ لیا تو ہمارے پاس بنک میں صرف سو روپے بچے تھے ... گویا آٹھ ہزار خرچ ہو چکے تھے... اور ابھی پریس اور بائنڈنگ والوں کے بل ادا کرنے تھے ... میں نے چاروں شائع شدہ ناول نقش محمد صاحب کو بھی دکھائے ... وہ ناولوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے...

میرے ساتھی پریشان تھے ... ایک تو اس لیے کہ ابھی بل ادا کرنے تھے ... دوسرے اس لیے کہ تمام کتابیں ہم دے چکے تھے... اب ان کی وصولی کا انتظار تھا ... پیسوں کی وصولی شروع ہوتی تو ہم اگلے چار ناولوں کی تیاری شروع کر سکتے تھے ... اور میں نے ناولوں کے پیچھے یہ اعلان شائع کیا تھا کہ آئندہ ماہ یہ چار ناول شائع ہو رہے ہیں:

موت کی سرنگ، ہنگامے کی موت، بنک کے ڈاکو، لوہے کا آدمی ...

نقش محمد صاحب نے ناول دیکھنے کے بعد اعلان کرنے والے انداز میں کہا تھا: ''آپ کے ادارے کا اکاؤنٹ میں کیا کروں گا... اور فی الحال کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔''

ان کی بات سن کر ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا تھا... اب چونکہ میں ایک بار پھر شاہ عالم مارکیٹ میں آگیا تھا... لہٰذا گزرے دنوں کی یادیں تازہ ہوگئیں...

میں نے دوستوں سے کہا:

''بھئی میں تو دوپہر کا کھانا حلیم والے کے پاس جا کر کھاؤں گا۔''

''ہم بھی وہیں کھائیں گے۔''

چنانچہ ہم پانچوں حلیم والے کے پاس پہنچ گئے ... لکڑی کی چوکیوں پر بیٹھ کر ہم نے شو مارکیٹ کے باہر حلیم سے روٹی کھائی ... حلیم والا آج بھی وہی تھا... اس کے حلیم کا ذائقہ بھی وہی تھا... اور اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ بھی وہی تھی ... اس نے مجھے پہچان لیا تھا ...

اگلے چار ناول دونوں ساتھیوں کو دے دیئے گئے ... انہوں نے کتابت شروع کر دی تھی ... سلیم اختر نے سرورق بنانے شروع کر دیئے تھے ... اور میں ان سے اگلے چار ناولوں پر کام شروع کر چکا تھا... ایسے میں میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا:

'' میرے پاس مکتبہ باغ و بہار کے پیسے آگئے ہیں... لہٰذا میں اپنے حصے کے دو ہزار دینے کے لیے تیار ہوں... جب کتابوں کے پیسے آنے لگ جائیں گے تو میں اپنے مسودوں کے پیسے لے لوں گا۔''

'' یہ اچھی بات ہے۔'' جلال انور نے خوش ہو کر کہا۔

کتابیں شائع ہوئے ابھی چوتھا روز تھا ... اور ابھی کہیں سے کتابوں کے پیسے وصول نہیں ہوئے تھے۔

اسی روز کا ذکر ہے کہ میں شیخ غلام علی کی میز پر بیٹھا کام کر رہا تھا کہ چپراسی نے آ کر کہا:

'' اشتیاق ! ملک صاحب آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔''

میں نے دل میں کہا: ''یا الٰہی خیر!''

پھر میں اپنی کرسی سے اٹھا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

☆☆☆☆☆

O

ملک صاحب کے چہرے پر غصے کے آثار تھے ... بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا چہرہ غصے سے سرخ تھا تو بے جا نہ ہوگا ...

میں نے ان کے سامنے والی کرسی کے نزدیک پہنچتے ہوئے کہا:

'' السلام علیکم جناب! آپ نے مجھے یاد فرمایا۔''

'' ہاں! بیٹھیں! '' انہوں نے کہا۔

میں ان کے سامنے بیٹھ گیا، تب انہوں نے کہا:

'' آپ نے جلال انور کو انسپکٹر جمشید کی چار کتابیں دی ہیں۔''

''جی ... جی ہاں!'' میں نے فوراً جواب دیا اور دل میں اپنے آپ سے کہا ...تو انھیں پتا چل گیا ہے، خیر کوئی بات نہیں ، کم از کم ابھی انہیں یہ پتا نہیں کہ یہ کتابیں میں نے خود شائع کی ہیں ...

میرا جواب سن کر ملک صاحب نے تنک کر کہا:

'' لیکن کیوں... یہ سیریز کسی اور کو دینے کا آپ کیا حق رکھتے ہیں... کیا آپ کا اور ہمارا معاہدہ نہیں ہو چکا ...ہمارے درمیان یہ معاہدہ طے ہوا تھا کہ آپ یہ کسی اور کو نہیں دیں گے۔''

میں نے ان پر ایک نظر ڈالی ... پھر کہنے لگا:

'' جی ہاں! یہی معاہدہ میرا تھا... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

'' تب پھر آپ نے معاہدے کی خلاف ورزی کیوں کی۔''

"جناب آپ نے معاہدہ یہ کیا تھا کہ آپ ہر ماہ ایک ناول لیں گے ... لیکن آپ نے اب تک صرف سولہ ناول خریدے ہیں ... اور معاہدے کو سوا دو سال گزر چکے ہیں ... میں دو چار بار اس طرف اشارہ بھی کر چکا ہوں کہ میرے پاس مسودے تیار ہیں... لیکن آپ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ ابھی ٹھہر جائیں ... اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ اس سلسلے کے مزید ناول نہیں لینا چاہتے، چنانچہ وہ میں نے کسی اور کو دے دیئے۔" یہاں تک کہہ کر میں خاموش ہوگیا... اب انہوں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھئی مزید ضرورت نہیں محسوس ہورہی تھی، اس لیے نہیں لیے... لیکن ضرورت تو یہاں ہوتی ہی رہتی ہے۔"

"یہ تو خیر آپ نے ٹھیک کہا ... ضرورت تو یہاں ہوتی رہتی ہے... لیکن میں کیا کرتا ... میرے پاس کئی مسودے جمع ہوچکے تھے۔"

"خیر اب جو ہونا تھا، ہوچکا... آپ نے جلال انور کو کچھ اور ناول تو نہیں دیے؟" انہوں نے پوچھا ... انداز اب بھی غصیلا تھا۔

"جی... جی ہاں! چار اور دے چکا ہوں۔"

"کیا کہا... چار اور دے چکے ہیں۔"

ملک صاحب دھک سے رہ گئے ... ان کی ناراضی بڑھ گئی... وہ تیز آواز میں گویا ہوئے...

"تب پھر! آپ فوراً وہ چاروں ناول اس سے واپس لے لیں۔"

میں نے حیران ہوکر ان کی طرف دیکھا ... چند لمحے کے لیے سوچا کہ کیا جواب دوں ... آخر میرے منہ سے نکلا:

"لیکن جناب! میں وہ چار ناول واپس کس طرح لے سکتا ہوں۔"

"ناول تو آپ کو اس سے واپس لینے پڑیں گے۔"

"نہیں جناب! یہ نہیں ہوسکتا۔" آخر میں نے کہہ ہی دیا۔

''اگر یہ نہیں ہوسکتا تو آپ یہاں کام بھی نہیں کر سکتے۔''

اس بار میں دھک سے رہ گیا ... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یکدم اتنی بڑی بات کہہ دیں گے...

ایک تو میں جگنو کا ایڈیٹر تھا ... دوسرے ان کی روشن کتابوں کا سارا کام اس وقت میں کر رہا تھا ... ہر کتاب کا پیش لفظ مجھے لکھنا ہوتا تھا ... آئندہ کتابوں کے اشتہارات بنانا پڑتے تھے ... اگلے پچھلے تمام صفحات مجھے تیار کرنے ہوتے تھے ... پھر مسوددں والی میز میرے پاس تھی... لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے فوراً یہ کہہ دیا کہ آپ یہاں کام نہیں کر سکتے...

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے... آخر میں نے کہا:

''بہتر! آپ میرا حساب کر دیں... میں اسی وقت جارہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

انہوں نے کہا اور چٹ بنانے لگے ... کاروباری مصلحتیں بھی عجیب ہوتی ہیں ... ملک صاحب ذاتی طور پر مجھے بہت پسند کرتے تھے ... میں بھی ان کی دل سے قدر کرتا تھا ... وہ تھے ہی بہت ملنسار اور خوش اخلاق ... جب بھی ملتے تھے، مسکرا کر ملتے تھے ... چائے وغیرہ پلانا تو ان کی خاص عادت تھی ... لیکن اس وقت مسئلہ تھا کاروبار کا...

انہوں نے بقیہ تنخواہ کی چٹ مجھے تھما دی ... چٹ لے کر میں اوپر آیا... سبھی میرا انتظار کر رہے تھے ... ان سب کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھ گئیں...

''کیا ہوا... کیا کہا انہوں نے۔'' نقش محمد صاحب نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''وہ کہتے ہیں... میں نے جو مزید چار ناول جلال انور کو دیئے ہیں... وہ اس سے واپس لے لوں... اب تم ہی بتاؤ دوستو... وہ میں کیسے واپس لے سکتا ہوں۔''

'' پھر... تم نے کیا کہا۔''

''بس... میں نے کہہ دیا کہ میں وہ واپس نہیں لے سکتا۔''

'' اور... انہوں نے یہ سن کر کیا کہا۔''

'' انہوں نے کہا ہے... اگر آپ وہ چار ناول واپس نہیں لے سکتے تو یہاں کام بھی نہیں کر سکتے۔''

'' کیا!!! '' ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

'' ہاں! یہ دیکھیں بقیہ تنخواہ کی چٹ ... میں اسی وقت جارہا ہوں... اب میں آپ لوگوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا نہیں کھایا کروں گا ... البتہ ہم کبھی کبھار ملا ضرور کریں گے ... اور ہاں نقش صاحب ... آپ تو خیر ہمارے ادارے کے اکاؤنٹنٹ بننے والے ہیں ... آپ سے تو روزانہ ملاقات رہے گی۔''

'' ہاں کیوں نہیں... ہماری ملاقات رہے گی۔'' انہوں نے کہا۔

باقی ساتھیوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا ... سب کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا ... میں نے خاموشی سے اپنی چیزیں اٹھائیں... اور ان سب سے باری باری ہاتھ ملایا... ان کی خالی خالی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں ... آخر میں مڑا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا ... ملک صاحب کے کمرے کے دروازے پر رک کر میں نے کہا:

'' اچھا ملک صاحب! میں جارہا ہوں۔''

انہوں نے منہ سے کچھ نہ کہا ... نفرت زدہ انداز میں سر ہلا دیا اور میں کاؤنٹر پر آگیا ...

''دلاوری صاحب... آخری تنخواہ دے دیں۔'' میں نے چٹ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''آخری تنخواہ... کیا مطلب؟'' غلام محمد صاحب اور دلاوری صاحب نے ایک ساتھ کہا۔

'' ہاں! مجھے ملازمت سے جواب مل گیا ہے ... تفصیل آپ کو معلوم ہو ہی جائے گی ... آپ یہ پیسے دے دیں۔''

انہوں نے رقم مجھے تھما دی ... میں 14.B شاہ عالم مارکیٹ چلا آیا... مکتبہ اقرا کے دفتر میں چاروں ساتھی موجود تھے... میرا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا...

'' لگتا ہے... ملازمت سے جواب مل گیا ہے۔'' سلیم اختر نے کہا۔

'' ہاں! وہ کہتے ہیں... آئندہ چار ناول جو دے چکا ہوں ... وہ واپس لے لوں تو ملازمت میں رہ سکتا ہوں ... ورنہ نہیں۔''

'' یہ ... یہ بہت برا ہوا۔'' جلال انور نے پریشان ہو کر کہا۔

'' لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں... ملک صاحب کو کیا پتا کہ میں نے چار ناول جلال انور کو نہیں دیئے ... بلکہ خود شائع کیے ہیں۔''

ان کے تو اوسان خطا ہوگئے ... بری طرح بدحواس دکھائی دینے لگے... دراصل انھیں یہ امید قطعاً نہیں تھی کہ مجھے اس قدر جلد جواب مل جائے گا ... ان کی پریشانی بھی سچی تھی... مکتبہ اقرا ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا تھا کہ یہ واقعہ ہوگیا... ورنہ ہم پانچوں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ مکتبہ اقرا سے فی الحال کوئی پیسہ نہیں لیں گے ... ہمارے معاوضے حساب کتاب میں جمع ہوتے رہیں گے جب حالات بہتر ہوجائیں گے، تب لینا شروع کریں گے ... لیکن میرے بے کار ہونے کی صورت میں انھیں مکتبہ اقرا کے حساب میں سے مجھے حصہ دینا پڑتا... ان کی پریشانی دراصل یہ تھی... میں نے فوراً یہ بات بھانپ لی...

'' یہ تم لوگوں کے منہ کیوں لٹک گئے، میں مکتبہ اقرا سے فی الحال کچھ نہیں لوں گا ... بس مجھے میرے مسودوں کے پیسے دیتے رہنا، یعنی پانچ سو روپے فی مسودہ ... باقی کام میں مکتبہ باغ و بہار سے چلا لوں گا ... وہ مجھ سے ہر ماہ ایک ناول تو لکھوا ہی رہے ہیں...

''ہوں ٹھیک ہے۔'' جلال انور نے بڑی کوشش سے یہ الفاظ کہے:

ان حالات میں ہم پہلی چار کتابوں کے پیسوں کا انتظار کرنے لگے۔ آخر خدا خدا کر کے پیکٹوں کی رقوم آنے لگیں... لاہور کے دکان داروں سے بھی پیسے وصول ہوگئے... لیکن کراچی اور راولپنڈی جیسے شہروں کی رقوم ابھی تک رکی ہوئی تھیں... بڑی رقم تھی بھی کراچی کی... سب سے زیادہ کتاب کراچی والوں نے منگائی تھی ... آخر کار ان دونوں شہروں کے بل بھی وصول ہوگئے اور آئندہ ماہ کے ناولوں کے آرڈرز بھی وصول ہوگئے... اس ماہ پہلے کی نسبت زیادہ کتابیں منگائی گئی تھیں اور یہ بات حوصلہ افزا تھی ... گویا تمام کتب فروخت ہوگئیں...

اس وقت تک ہم اگلے ماہ کے ناولوں کی تیاری شروع کر چکے تھے... پریس اور بائنڈنگ والوں نے بہت ساتھ دیا ... انہوں نے ایک ماہ کا ادھار منظور کر لیا ... ادھر جونہی ہمیں رقوم وصول ہوئیں ... ہم نے ان کے بل ادا کردیئے... اس طرح وہ مطمئن ہوگئے اور انہوں نے اگلی چار کتابوں کی تیاری میں تیزی دکھائی...

ان کتابوں کی پوزیشن پہلی چار کتابوں سے بہتر رہی... پیسے جلد ہی مل گئے اور ہم نے تیسرے ماہ کی کتابیں آسانی سے شائع کر لیں... تین ماہ میں ہی مکتبہ اقرا نے شہرت حاصل کر لی... اب ہمارے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے جمع ہوگئے کہ مجھے مسودوں کے پیسے ملنے لگے... دو ہزار روپے ان چار مسودوں کے اور بارہ سو روپے مکتبہ باغ و بہار سے ایک مسودے کے ملنے لگے ... اس طرح ایک بار پھر مجھ پر بے فکری کا دور شروع ہوا... پریشانیاں رفع ہوئیں... میں گھر والوں کو تقریباً دو ہزار روپے بھیجنے لگا ... کھانا ہم اب بھی کبھی حلیم والے سے کھا لیتے تھے اور کبھی کسی عام ہوٹل سے منگوا لیتے تھے... اس ماہ سے ہم جلال انور کو بھی تنخواہ دینے لگے، کیونکہ میری طرح جلال انور کو تو مجھ سے بھی پہلے حکایت سے جواب مل چکا تھا ... ناولوں کی اشاعت کے ساتھ ہی ناولوں کے بارے میں خطوط آنے لگے

... نئے نئے بک سٹال مالکان کے آرڈرز آنے لگے... میں ایک روز دفتر گیا تو میز پر بہت سے خطوط کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا ... اور جلال انور کرسی پر اونگھ رہا تھا... میں نے السلام علیکم کہا تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا...

''یہ خطوط آج آئے ہیں۔''

'' ہاں! یہ صرف آج کی ڈاک ہے... کل کوئی ڈاک نہیں آئی تھی۔''

'' خوشی کی بات ہے... تین ماہ کے ادارے کو اتنی ڈاک وصول ہورہی ہے۔''

'' ہاں اس میں شک نہیں ... یہ کامیابی کی دلیل ہے۔'' جلال انور نے بھی خوش ہو کر کہا۔

دوسرے دن میں دفتر پہنچا تو ڈاک پہلے سے بھی زیادہ نظر آئی... میں نے پوچھا:

''یہ صرف آج کی ڈاک ہے۔''

''نہیں! اس میں کل والی ڈاک بھی شامل ہے۔''

'' کیا مطلب... کل کی ڈاک کو کل نہیں کھولا۔''

''کھول لیں گے... ایسی بھی کیا جلدی ہے۔''

'' لیکن یہ تو ٹھیک نہیں ... روزانہ کی ڈاک روزانہ کھلنی چاہیے اور آرڈرز کی تعمیل ہونی چاہیے۔''

'' کوئی فرق نہیں پڑتا ... کل کھول لیں گے۔'' جلال انور نے لاپروائی سے کہا۔

میں حیران رہ گیا... تیسرے دن اور زیادہ ڈاک کا ڈھیر نظر آیا ... لیکن ڈاک کھولنے کا کام اب بھی شروع نہیں ہوا تھا ... میں فکر مند ہوگیا کہ ایسے کیسے کام چلے گا... میں نے دبے لفظوں میں کہا:

'' جلال انور! یہ بات ٹھیک نہیں۔''

'' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ... سرکولیشن کو میں سمجھتا ہوں... تم نہیں ... تم صرف مسودے لکھو ... باقی کام میرا ہے ... اور یہ بات جان لو... اس کام میں جو اہمیت سرکولیشن کی ہے... اور کسی چیز کی نہیں... ہاں دوسرے نمبر پر سرورق کی اہمیت ہے۔''

میں چونک گیا... میرا رواں رواں سلگ اٹھا... میں نے جل کر کہا:

'' کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے ناولوں کی تحریر کی کوئی اہمیت نہیں۔''

'' میں یہ نہیں کہتا... بلکہ یہ کہتا ہوں کہ پہلی اہمیت سرورق کی اور دوسری سرکولیشن کی ہے ... اس کے بعد تحریر کی باری آتی ہے ... سب سے پہلے نظر سرورق پر پڑتی ہے... اور سرورق پر نظر تب پڑے گی جب سرکولیشن منیجر اسٹالوں پر کتاب پہنچائے گا... لہٰذا تمہیں اس اہمیت سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔''

میں سکتے میں آ گیا ... آخر میں نے کہا:

'' خیر... یونہی سہی... لیکن یہ جو تین دن سے ڈاک آئی ہوئی ہے... اس ڈاک کو کیوں نہیں کھولا جا رہا ... آخر ان خطوط میں صرف تعریفی خطوط نہیں ہوں گے ... بلکہ بک اسٹال مالکان کے خطوط بھی ہوں گے... کچھ نئے بک اسٹال والوں نے بھی خطوط لکھے ہوں گے ... ایسے بک اسٹال والوں کے آرڈرز کی تو فوری تعمیل ہونی چاہیے۔''

'' تو ابھی صرف تین دن ہی تو ہوئے ہیں ... کل ساری ڈاک کی تعمیل ہو جائے گی۔''

میں خاموش ہوگیا ... کچھ کہنے کو تو جی چاہ بھی نہیں رہا تھا... دوسرے دن بھی ڈاک جوں کی توں پڑی رہی ... اب تو میرا پارہ چڑھ گیا... میں سلیم اختر کے پاس گیا ... وہ اس وقت شیخ غلام علی کے دفتر میں تھا ... اس کے بارے میں ملک صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی ہمارے ادارے سے منسلک ہے ... اس لیے اسے جواب نہیں ملا تھا... جس روز سے میں ملازمت سے فارغ ہوا تھا، اس

روز کے بعد پھر ان کے شو روم میں داخل نہیں ہوا تھا... لیکن اب مجھے کاؤنٹر تک جانا پڑ گیا... میں نے دلاوری صاحب سے درخواست کی:

'' دلاوری صاحب! مجھے ذرا سلیم اختر سے کام ہے ... کیا آپ انہیں پیغام بھجوا سکتے ہیں۔''

'' دلاوری صاحب نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، پھر مسکرا کر گویا ہوئے:

'' ہاں ہاں! کیوں نہیں! آپ بیٹھیں... میں بلواتا ہوں۔''

'' نہیں! میں باہر کھڑا ہوں ... ملک صاحب نے دیکھ لیا تو نہ جانے کیا خیال کریں۔''

دلاوری صاحب مسکرا دیئے اور میں باہر نکل آئے ... ساتھ ہی تھانے کی دیوار ہے... اس کے پاس جا کھڑا ہوا... پندرہ منٹ بعد سلیم اختر میرے پاس آ گیا ... اس نے آتے ہی کہا :

'' خیر تو ہے اشتیاق میاں! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا ... ملک صاحب دیکھ لیں گے تو میری ملازمت بھی کھٹائی میں پڑ سکتی ہے۔''

'' ہاں! یہ تو ہے ... خیر... اب تو میں آ گیا ہوں... مہربانی کر کے میری بات سن لو۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

'' لیکن یہاں نہیں ... آؤ... آگے چلتے ہیں۔''

اب ہم سرکلر روڈ پر نگار سینما کی طرف بڑھنے لگے ... میں نے کہنا شروع کیا :

'' دیکھو سلیم اختر ... ہر شخص کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے، میں چاہتا ہوں... جو آرڈر روز آئیں ... انہیں روز انہ ہی کھولا جائے ، یہ نہیں کہ تین چار دن لفافے پڑے رہیں ... میز پر چار دن سے لفافوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے ... اور جلال انور کھولنے پر تیار نہیں ... دفتر میں بیٹھ کر مکھیاں مارنے کا آخر کیا فائدہ ... بس میں تو یہ کہنے کے لیے آیا تھا۔''

میری بات سن کر سلیم اختر نے کہا: ''اچھی بات ہے... تم دفتر چلو... میں بھی اپنا اسکوٹر لے کر آتا ہوں۔''

اس کے پاس اسکوٹر تھا... جو شیخ غلام علی اینڈ سنز کے باہر کھڑا تھا... ہم اس جگہ سے واپس مڑ گئے... اور دونوں مکتبہ اقرا پہنچ گئے... اب سلیم اختر نے جلال انور سے اس سلسلے میں بات شروع کی... جلال انور بڑے بڑے منہ بنانے لگے... آخر اس نے کہا:

''اس میں اس قدر جلدی کی کیا بات ہے۔''

''لیکن جلدی تو ہمیں ہے۔'' سلیم اختر نے فوراً کہا۔

جلا ل انور نے ہم دونوں کی طرف دیکھا... وہ سمجھ گیا کہ ہم دونوں اس سے ناراض ہیں... فوراً ہی مسکرانے لگا...

''ابھی کھول دیتا ہوں، آج ہی تمام آرڈر چلے جائیں گے، بس خوش۔''

اس طرح ڈاک کھل سکی... لیکن میں اتنے میں ہی دل برداشتہ ہو چکا تھا... اور اس وقت میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ میں بہت زیادہ جذباتی ہوں... میرے لیے یہ احساس بہت شدید تھا کہ وہ سرورق اور سرکولیشن کو اہم سمجھتے تھے... ناول کی تحریر ان کے نزدیک کوئی اہم چیز نہیں تھی... اور ان کی یہ سوچ میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی... میں سوچنے لگا کہ ان کی یہ سوچ تو مجھے جلا کر راکھ کر دے گی۔

اس وقت مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ لکھنے والا بہت زیادہ حسّاس ہوتا ہے... ذرا سی ٹھیس لگنے پر پریشان ہو جاتا ہے... اور یہاں تو ٹھیس پر ٹھیس لگ رہی تھی... ہماری سوچ تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ اس ٹیم میں سب کا کام بہت اہم ہے... ہم سب ایک ٹیم ہیں اور ٹیم میں کوئی بھی غیر اہم نہیں ہوتا... لیکن جلال انور اور سلیم اختر میں یہ سوچ بالکل نہیں تھی۔

رہ گئے محمد فاروق اور عبدالرشید... انہیں ایسی باتوں سے کوئی غرض نہیں

تھی ... وہ تو بس کتابت کرنا جانتے تھے ... اور یہ سمجھتے تھے کہ ادارہ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے اور بس...

گویا ان پانچوں میں میں ہی ایک ایسا تھا ... جو بے اطمینانی کا شکار ہو گیا تھا اور میری بے اطمینانی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی ... میں نے خود کو یہ کہہ کر بہلانے کی کوشش کی کہ چلو مجھے اس سے کیا ... کوئی کچھ خیال کرتا رہے ... ہمارا ادارہ تو کامیابی کی طرف رواں دواں ہے نا۔

اور شاید میں خود کو یہ سمجھا بھی لیتا، لیکن اس دوران چند اور باتیں پیش آ گئیں اور میں نے صاف طور پر یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ میرے اور ان چاروں کے مزاجوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ... میں چاہے کچھ کر لوں ... اس فرق کو کبھی ختم نہیں کر سکتا ... یہ فرق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ تو ہو سکتا ہے ... کم نہیں ہو سکتا ... اب میرے ذہن میں سوال گونجا ...

"پھر ... میں کیا کروں ... اگر آگے چل کر تعلقات اور خراب ہو گئے تو یہ چاروں تو ایک ہیں ... نقصان میں تو میں رہوں گا ... کیونکہ ادارے سے الگ تو صرف میں رہوں گا ، الگ ہونے کی صورت میں کتابوں کی اشاعت کے حقوق تو مکتبہ اقرا کے پاس رہیں گے۔"

میں دن رات اس سوچ میں رہنے لگا ... سچ پوچھیں تو میری راتوں کی نیند اڑ گئی ... جب ہم نے ادارہ شروع کیا تھا ... اس وقت تحریری شرائط لکھی گئی تھیں ... ان میں یہ شرط بھی تھی کہ اگر کوئی ادارے سے کسی بھی بنیاد پر یا کسی بھی وجہ سے الگ ہونا چاہے تو خوشی سے الگ ہو سکتا ہے ... اس کا حساب کتاب کر کے اسے الگ ہونے دیا جائے گا ... اس کی مرضی کے خلاف اسے ادارے میں رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

یہ شرط میرے لیے کافی حوصلہ افزا تھی... لیکن اس کے باوجود میں بری طرح گھبرایا ہوا تھا اور پریشان تھا ... میں نے خود کو بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی

کہ چلو کوئی بات نہیں میرا مزاج ان سے نہیں ملتا ... تو نہ سہی ...ادارہ تو کامیابی سے چل رہا ہے اور ایک معقول آمدنی کی صورت بنتی جا رہی ہے ... آئندہ اور بہتر ہونے کے امکانات روشن ہیں، لیکن جوں جوں میں خود کو یہ سمجھاتا تھا ...

میری پریشانی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا ... اس کیفیت میں پورے دو ماہ گزر گئے ...

ان حالات میں میں نے سوچا ، نقش صاحب سے مشورہ کرنا چاہیے ... میں نے انھیں ملاقات کے لیے پیغام بھیجا ... اس کا طریقہ وہی اختیار کیا ... جو پہلے بھی کر چکا تھا ... یعنی دلاوری صاحب کے ذریعے اوپر پیغام بھیج دیا اور خود نگار سینما والے مرغ چھولے ہوٹل میں جا بیٹھا ... ان دنوں ہم دوپہر کا کھانا وہیں کھانا پسند کرتے تھے ...

میں نے تمام حالات نقش محمد صاحب کو سنا دیئے ... وہ سن کر فکر مند ہو گئے اور سوچ میں ڈوب گئے ... وہ کافی دیر سوچ میں ڈوبے رہے ... آخر انہوں نے کہا :

''میں غور کروں گا ۔''

بات ختم ہو گئی ... ہم وہاں سے اٹھ گئے ... انھی دنوں مکتبہ باغ وبہار کے مالک ماسٹر غلام رسول نیا مسودہ لینے کے لیے آئے تو انہوں نے کہا۔

''میری ایک درخواست ہے۔''

''ہاں فرمائیں ۔'' میں نے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ ہمیں ہر ماہ ایک ناول انسپکٹر جمشید سیریز کا بھی لکھ دیا کریں۔''

میں نے ان کی طرف دیکھا:

''آج کل میں بہت پریشان ہوں ... فی الحال آپ کو کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں ... اس بارے میں پھر کبھی بات کریں گے ۔''

''اچھی بات ہے ... کامران مرزا کا تو لکھ کر دیتے رہیں گے نا ۔''

''ہاں کیوں نہیں۔''

اس وقت تک میں انھیں یہ چھ ناول لکھ کر دے چکا تھا ...

پراسرار وارداتیں ، موت کا کھیل ، جنگل میں چیخ ، ڈاکو کا خوف ، گمشدہ نواب ، کتاب کی چوری اور ان چھ کے بعد ان کے لیے خون کی لکیر ناول پر کام کر رہا تھا ... میرا جواب سن کر وہ چلے گئے ...

میں پھر اسی ادھیڑ بن میں لگ گیا ... اب میں بالکل صاف طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکوں گا ... شاید یہ میرا احساس تھا ... یا میری خواہش تھی ... یا کیا تھا ... میں کچھ نہیں کہہ سکتا ... بس میری عین خواہش یہ ہو چکی تھی کہ ان سے کسی نہ کسی طرح علیحدگی اختیار کر لوں ... ذہنی پریشانی کی وجہ سے اب مجھ سے ناول بھی ٹھیک طور پر لکھے نہیں جا رہے تھے۔

ادھر مکتبہ اقرا کامیاب جا رہا تھا ... اس کا نام اب چل نکلا تھا ... آرڈر پر آرڈر آنے لگے تھے ... لیکن جلال انور کا حال جوں کا توں تھا ... ڈاک کئی کئی دن گزرنے پر کھولی جاتی ... روز کی ڈاک روز کھولنے کا اس طرف تصور ہی نہیں تھا ... جب کہ یہ میری عین خواہش تھی کہ روز کا کام روز کر لینا چاہیے ...

مجھے یہ خوف بھی تھا کہ ان کے مقابلے میں علیحدہ ہو کر میں کیا کر سکوں گا ... وہ اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے اور میں بالکل اناڑی تھا۔

پھر انہی دنوں مجھے ایک نیا خیال سوجھا ...

☆☆☆☆☆

O

خیال یہ آیا تھا کہ کیوں نہ میں ایک مزاحیہ ناول لکھوں ... بس میں نے مزاحیہ ناول شروع کر دیا ... جلد ہی ناول مکمل ہو گیا ... اس کا نام تھا جاسوس کہیں کا ... اس ناول کا مرکزی کردار بھی میں خود تھا ... اب میں نے مکتبہ باغ و بہار کے مالک ماسٹر غلام رسول سے ملاقات کی اور باتوں باتوں میں سرسری انداز میں ان سے کہا:

" میں نے ایک مزاحیہ ناول لکھا ہے ... میں چاہتا ہوں، اسے خود ہی شائع کروں ... کیونکہ مزاحیہ ناول نہ تو آپ لیں گے، نہ مکتبہ اقرا والے شائع کرنا پسند کریں گے ... شیخ غلام علی اینڈ سنز سے پہلے ہی تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔ فیروز سنز والے بھی ان دنوں مسودے نہیں لے رہے ... اس لیے کیوں نہ یہ ناول میں خود چھاپوں۔"

میری بات سن کر ماسٹر غلام رسول مسکرا دیے ... پھر کہنے لگے:

" چھاپنے کو تو آپ چھاپ لیں ... لیکن رہیں گے آپ نقصان میں۔"

" چلیے نقصان ہی سہی ... ایک تجربہ تو ہو جائے گا ... کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔"

" ضرور ... کیوں نہیں۔"

اب میں نے سوچے سمجھے بغیر ایک اور ناول لکھنا شروع کر دیا... اس کا نام 'یہ بچے خطرناک ہیں' رکھا ... مکمل کرنے کے بعد میں نے ماسٹر غلام رسول

سے کہا:

''ماسٹر صاحب! میں نے سوچا ہے ... ایک ناول کی بجائے دوناول شائع کر دوں ... ایک اکیلا ناول کیا اچھا لگے گا ... اس لیے میں نے جاسوس کہیں کا کے ساتھ ایک اور ناول یہ بچے خطرناک ہیں لکھ لیا ہے۔''

''اس طرح آپ اور زیادہ نقصان میں رہیں گے۔''

''کوئی بات نہیں ... دیکھا جائے گا۔''

ماسٹر غلام رسول کچھ نہ کہہ سکے ... وہ بہت نیک آدمی تھے ... دراصل وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں یہ کام خود کر کے کوئی نقصان اٹھاؤں ... لیکن میرے سر پر تو بھوت سوار تھا ... میں نے دونوں مسودے دو کاتبوں کو کتابت کرنے کے لیے دے دیئے ... شیخ غلام علی اینڈ سنز کی مسودوں والی میز پر کام کرنے کا یہ بہت بڑا فائدہ ہوا تھا کہ کئی کاتبوں سے اچھی علیک سلیک ہو گئی تھی ... اور میں ان کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ کہاں بیٹھ کر کام کرتے ہیں ... ان کے کام کرنے کی جگہ نگار سینما کے پیچھے تھی ... انہوں نے مسودے لے لئے اور جلد کام مکمل کرنے کی ہامی بھر لی ... ان کی طرف سے بے فکری ہونے کے بعد میں سلیم اختر کے بھائی سعید اختر کے پاس گیا... میں نے ان سے کہا۔

''ایک دوست کے لیے دوناولوں کے سرورق بنوانے ہیں ... کیا آپ بنا دیں گے ... کیونکہ میں آپ ہی سے بنوانا چاہتا ہوں۔''

سعید اختر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں خود اپنے لیے بنوا رہا ہوں ... کیونکہ اس وقت تک میں نے اپنے خیالات ان میں سے کسی پر ظاہر نہیں کئے تھے ... اس طرح نہایت خاموشی سے یہ دونوں کام شروع ہو گئے ... کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ...

ہاں ! یہ بتانا بھول گیا ... سعید اختر کو دونوں ناولوں کے سرورقوں کا خیال مجھے دینا پڑا تھا ... میں نے انھیں بتایا تھا کہ انھیں کیا بنانا ہے ... اب ایک

طرف ٹائیٹل تیار ہورہے تھے تو دوسری طرف کتابت ہو رہی تھی ... اور ان دنوں کاموں کے مکمل ہونے کی دیر تھی ... پھر ناول شائع کرانا کوئی مسئلہ نہیں تھا...

میں نے اپنے ذہن میں باقاعدہ پروگرام ترتیب دے ڈالا ... دو ناول مکتبہ اقرا کے لیے لکھے ... ایک ناول مکتبہ باغ و بہار کے لیے لکھ لیا اور اگلے دو ناول اپنے لیے بھی لکھ لیے ...

یعنی ' یہ بچے خطرناک ہیں' اور 'جاسوس کہیں کا' کے بعد 'کان کا راز' اور 'خونی ایجاد' لکھ ڈالے ... اس دوران پہلے دونوں ناولوں کی کتابت ہوگئی تھی ... چنانچہ میں نے نئے دونوں ناول بھی کتابت کے لیے دے دیے ... اور پہلے دونوں کی اجرت انھیں دے دی ... ادھر سعید اختر نے سرورق تیار کر دیئے ... میں نے انھیں دو اور خیال دے دیئے اور ان دونوں کی اجرت انھیں دے دی ... انہوں نے ان پر بھی کام شروع کر دیا ... اب انھیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ میں کس کے لیے بنوا رہا ہوں ... اندر ہی اندر کیا ہو رہا ہے ... جب ان دونوں کی بھی کتابت ہوگئی اور سرورق بھی تیار ہو گئے تو ضرورت پیش آئی ... سرورق کے پروسیس تیار کرنے والے کی ... کتابت کا کام میں نے جن سے لیا تھا، ان میں سے ایک کا نام سعید کمال تھا ... میں نے ان سے پوچھا:

'' کیا آپ کا کوئی فلم پروسیس والا واقف ہے۔''

پروسیس کہتے ہیں سرورق کی فلمیں بنانے کو ... سعید کمال نے فوراً کہا۔

'' ایک واقف ہیں تو سہی۔''

'' تو مجھے ان کے پاس لے چلیں۔''

وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے ... دراصل یہ حضرات ایک تو مجھ سے اس لیے خوش تھے کہ کام کرنے کے فوراً بعد میں ان کا معاوضہ دے دیتا تھا ... دوسرے میں کام میں تیزی دکھا رہا تھا ... وہ میری پھرتی پر بھی حیران تھے ...

انہوں نے نسبت روڈ پر ایک پروسیس والے سے ملوا دیا ... میں نے

چاروں سرورق ان کے حوالے کیے اور ان سے اجرت کے بارے میں بھی پوچھ لیا ... ساتھ ہی میں نے کہا ۔

'' یہ مجھے کب تک مل جائیں گے ۔''

'' ایک ہفتہ تو لگ جائے گا ۔''

'' جی بہتر ! میں ایک ہفتے بعد آؤں گا ... کام تیار رکھیے گا ۔''

'' فکر نہ کریں ۔''

ایک ہفتے بعد مجھے سرورق کی فلمیں مل گئیں ... اب چار میں سے دو ناول شائع کرنا چاہتا تھا ... اور اس کے بعد والے دو ناول بھی چھپنے کے لیے ہر طرح تیار تھے ... میں نے کچھ سوچ کر 'جاسوس کہیں کا' کو تیسرے نمبر پر رکھا ... اور پہلے ماہ انسپکٹر جمشید سیریز کے دو ناول شائع کرنے کی ٹھانی ۔

اس طرح یہ بچے خطرناک ہیں اور کان کا راز میرے اپنے شائع ہونے والے دو ناول تھے ...

اب میں پروگرام کے مطابق شیخ غلام علی اینڈ سنز کے شو روم گیا... کاؤنٹر سے نقش محمد صاحب کو پیغام بھجوایا کہ میں ملنا چاہتا ہوں ... وہ پیغام ملتے ہی نیچے آگئے ، گرم جوشی سے ملے ... ابھی تک میں نے انھیں کچھ نہیں بتایا تھا ... میں نے ان سے آہستہ آواز میں کہا ۔

'' مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے ... یہاں سے کچھ دور بیٹھتے ہیں ۔''

'' اچھی بات ہے ... میں اوپر کہہ کر آتا ہوں کہ ذرا کام جا رہا ہوں ۔''

یہ کہہ کر وہ اوپر چلے گئے ... جلد ہی ہم ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے ...

'' ہاں اشتیاق صاحب ! اب بتائیں کیا بات ہے ۔''

''نقش صاحب ! جب میں شیخ غلام علی اینڈ سنز میں تھا تو آپ مجھے بار بار کہتے تھے ، آیئے ... مل کر کام شروع کریں ... لیکن میرا پروگرام جلال انور اور سلیم اختر کے ساتھ کام شروع کرنے کا بن گیا ... میرا پروگرام آپ کو بھی شریک

کرنے کا تھا ... لیکن ان حضرات نے منظور نہ کیا ... اس طرح آپ شریک نہ ہو سکے لیکن اب میں ان کے ساتھ نہیں چل سکتا ... میں نے ان سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے ... ان کے اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے ... میں ان کے درمیان خوش نہیں رہ سکتا اور اطمینان نہ ہو تو لکھنے والا لکھ نہیں سکتا ... ان چاروں کی رائے ایک ہوتی ہے اور میری دوسری ...لہٰذا رائے ان کی ہی چلتی ہے ... مجھ اکیلے کی نہیں ... ان حالات میں میں کب تک ان کے ساتھ چل سکوں گا ... لہٰذا ۔''میں کہتے کہتے رک گیا ۔

'' لہٰذا کیا۔'' نقش صاحب فوراً بولے ... وہ بے چین سے ہو گئے۔

'' لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنا مکتبہ خود شروع کروں ، اگر آپ پسند کریں تو میرے ساتھ اس کاروبار میں شریک ہو سکتے ہیں ... ورنہ میں تو اب یہ شروع کر کے رہوں گا ... جیسے بھی ہو ، میں یہ ٹھان چکا ہوں ۔''

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا ... دراصل میرے پاس سرمائے کی کمی تھی ... اس لیے میں انھیں ساتھ شامل کرنا چاہتا تھا ... نقش محمد صاحب میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے کہا۔

'' اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے ...میں تو دل سے یہ چاہتا ہوں ... لیکن ذرا تفصیل تو بتائیں ... پروگرام کیا ہے۔''

'' پروگرام یہ ہے کہ ہم ہر ماہ جمشید سیریز کے دو ناول شائع کریں گے ...دو دو ہزار چھاپ لیا کریں گے ... ان کا بکنا میرے خیال میں مشکل نہیں ہوگا ... میرے پاس بک اسٹالوں اور تھوک فروشوں کے پتے موجود ہیں ... بہت سے بچے بھی مجھے خط لکھتے رہتے ہیں ... ان کے پتے بھی میرے پاس ہیں ... ہم ان کو بھی ناول بذریعہ وی پی ارسال کریں گے ...ہم ان سے رابطہ قائم کریں گے اور انھیں بتائیں گے کہ اب اشتیاق احمد کی کتابیں صرف ہمارے ادارے سے شائع ہوں گی۔''

'' ہوں ... اور ہمارے ادارے کا نام کیا ہوگا۔'' انہوں نے پوچھا۔
میں نے ان پر ایک نظر ڈالی ... پھر کہنے لگا ۔
''دیکھیے نقش صاحب ... برا نہ مانیے گا ... میں جو بات کہنے لگا ہوں... مصلحت اسی میں ہے ... میرے 18 ناول وہاں سے شائع ہو چکے ہیں ... لوگ مکتبہ اقرا کے نام سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اشتیاق احمد کے ناولوں کے لیے یہ ادارہ مخصوص ہے، اس لیے ہمیں شروع میں دشواری پیش آسکتی ہے ... لہٰذا میں نے اس بارے میں دو باتیں سوچی ہیں ... نمبر ایک تو یہ کہ ہمارے ادارے کا نام مکتبہ اشتیاق ہوگا ... دوسرے یہ کہ سرورق کی پشت پر میری تصویر شائع ہوا کرے گی ... صرف اسی طرح ہم لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔''
'' بالکل ٹھیک کہا آپ نے ... میں نے بالکل برا نہیں مانا ... اس میں برا ماننے والی بات تو کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں۔'' انہوں نے پرجوش انداز میں کہا ۔
'' بات دراصل یہ ہے کہ میرا خیال تھا ، آپ سوچیں گے، یہ تو اپنے نام پر ادارے کا نام رکھ رہا ہے ... اور اپنی تصویر بھی شائع کیا کرے گا ... لیکن میں سمجھتا ہوں ... یہ وقت کی ضرورت ہے۔''
'' میں ایسی کوئی بات نہیں سوچ رہا ... آپ فکر نہ کریں ۔''
'' بہت خوب ! تو پھر چند روز تک ہم مکتبہ اشتیاق کے نام سے بنک میں اکاؤنٹ کھلوائیں گے ... ہم برابر کے حصے دار ہوں گے ... ہر ماہ دو ناول شائع کریں گے ... آپ بدستور شیخ غلام علی اینڈ سنز میں کام کرتے رہیں گے ... ادارے کو میں اکیلا سنبھال لوں گا ، ہاں ایک ملازم کی ضرورت ہوگی۔''
میری بات سن کر انہوں نے کہا :
'' چند دن پہلے ہی میرے ایک کلرک کو ملازمت سے فارغ کیا گیا ہے

... اس کا پتا رجسٹر میں موجود ہے ، میں اسے خط لکھ دیتا ہوں ... وہ آجائے گا۔''

''یہ اچھی بات ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

دوسرے دن نقش صاحب نے اس کلرک کو خط لکھ دیا ... اس کا نام عبیداللہ تھا ... ادھر کتابیں پریس جانے کے لیے بالکل تیار تھیں ، لیکن میں ان کو پریس والے کے حوالے کرنے سے پہلے جلال انور اور سلیم اختر سے بات کرنا چاہتا تھا ... کیونکہ ابھی ان سے حساب کتاب بھی لینا تھا ... اور حساب کتاب لیے بغیر میں نئے اکاؤنٹ میں اپنے حصے کی رقم شامل نہیں کر سکتا تھا ...

مکتبہ اقرا شروع کرنے سے پہلے ہم نے یہ بات طے کر لی تھی کہ کوئی حصے دار کسی بھی وقت وجہ بتائے بغیر ادارے سے علیحدہ ہو سکتا ہے ... اس صورت میں اسے اس کے حصے کا منافع دیا جائے گا ... شائع ہونے والی کتب کے حقوقِ اشاعت بدستور ادارے کی ہی ملکیت رہیں گے ... یعنی قانونی مدت پوری ہونے تک ادارہ ہی ان کو شائع کرنے کا حق دار ہو گا ... ہاں مدت پوری ہونے پر ان کے حقوق واپس مصنف کو مل جائیں گے ...

میں نے مکتبہ اقرا کے لیے لکھے گئے انیسویں اور بیسویں ناولوں کے مسودے اٹھا لیے ... ان دونوں ناولوں کا اعلان سترہویں اور اٹھارہویں ناول کے آخر میں ہو چکا تھا ... میں سیدھا شیخ غلام علی اینڈ سنز پہنچا ... کیونکہ سلیم اختر کی چھٹی کا وقت قریب تھا اور میں وہیں اس سے بات کرنا چاہتا تھا... میں وہاں پہنچ گیا ... کچھ دیر بعد سلیم اختر سیڑھیاں اترتا نظر آیا ... نیچے آکر وہ اپنے اسکوٹر کی طرف بڑھا ... اس وقت میں نے اس سے کہا۔

''سلیم اختر ... مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا ... کیونکہ اسے اس طرح مجھے اچانک وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی ...

'' ہاں ! کہو ... کیا بات ہے ۔''

ہم لوگ لوہاری تھانے کی دیوار کے ساتھ کھڑے تھے ... اس وقت میں نے کہنا شروع کیا اور سچ یہ ہے کہ اس وقت اس سے بات کرنا مجھے بہت مشکل لگا ...

'' سلیم اختر ! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے ... تمھیں محسوس تو ہو گا ... لیکن مجبوری ہے ۔''

'' ایسی کیا بات ہے ۔'' سلیم اختر پریشان ہو گیا۔

'' بات یہ ہے کہ میں اب تم لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکتا ... میری اور تم لوگوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ... ہمارے خیالات آپس میں بالکل نہیں ملتے ... لہٰذا شرائط کے مطابق میں الگ ہونے کا حق رکھتا ہوں... تم میرا یہ فیصلہ جلال انور اور باقی دونوں ساتھیوں کو بتا دو ... میں کل حساب کتاب کرنے کے لیے آؤں گا۔''

سلیم اختر تو دھک سے رہ گیا ... اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ میں اسے یہ خبر سنا سکتا ہوں ... کئی سیکنڈ تک گنگ رہنے کے بعد اس نے کہا :

'' لیکن مسودوں کا کیا ہوگا ، تم ہمارے لیے ناول تو لکھتے رہو گے نا۔''

'' میں ناول ضرور لکھوں گا ... لیکن پہلے معاوضہ طے کیا جائے گا۔''

'' میں باقی ساتھیوں کو جا کر بتاتا ہوں ... ویسے تم نے یہ اچھا فیصلہ نہیں کیا ... کام اچھا بھلا چل رہا تھا ... کوئی بات تھی تو تم مجھے بتا دیتے ۔''

'' میں نے بار بار آ کر کہا لیکن میری بات تو سنی ہی نہیں گئی ... تم لوگ اپنی مرضی چلاتے رہے ... لیکن اب اس کا کیا ذکر کرنا ... میں کل آؤں گا۔''

'' ہوں ... ٹھیک ہے۔'' اس نے بہت مشکل سے کہا۔

پھر اس نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور چلا گیا ... میں نے بھی گھر کی راہ لی ... دوسرے دن میں نے نقش محمد کو ساتھ لیا اور پہنچ گیا مکتبہ اقرا کے دفتر ...

نقش محمد کو اس لیے ساتھ لے لیا تاکہ وہ مجھ سے کوئی زیادتی کرنے کے بارے میں نہ سوچ لیں ... نقش محمد صاحب آخر ریٹائرڈ فوجی تھے ... ان کا رعب داب تھا ... دھڑلے سے بات کرتے تھے ... وہاں جلال انور، عبدالرشید خاکی اور محمد فاروق کا رنگ اڑا جارہا تھا ... سلیم اختر غصّے میں نظر آیا ...

میں نے انیسویں اور بیسویں ناول کے مسودے ان کے سامنے رکھ دیئے ... انہوں نے مسودے رکھ لیے ... جلال انور نے کہا۔

''تمھارا حساب ہم چند دن تک کردیں گے۔''

''ٹھیک ہے ... ہم چار دن بعد آئیں گے۔''

انہوں نے سر ہلا دیئے ... چار دن بعد میں پھر نقش محمد کے ساتھ وہاں پہنچ گیا ... انہوں نے بھی درمیان میں اپنے ایک دوست کو ڈال لیا تھا ... وہ ایک بک اسٹال کے مالک تھے ... بک اسٹال کا نام تھا حامد برادرز ... ان لوگوں نے پہلے ہی حساب کتاب تیار کر رکھا تھا ... جب وہ انہوں نے میرے سامنے رکھا تو میں دھک سے رہ گیا ... میرے خیال میں میرا جو حصہ بنتا تھا، وہ اس سے بہت ہی کم تھا ... لیکن میں نے اس موقعے پر ان سے جھگڑا کرنا مناسب نہیں سمجھا ... آخر ہم دوست تھے اور ہم نے اکٹھے وقت گزارا تھا ... پیسوں کی خاطر جھگڑا مناسب نہیں لگا ... جو حساب انہوں نے بتایا ... میں خاموشی سے سنتا رہا اور رقم لے کر میں نقش صاحب کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا ...

''اور اشتیاق ... تم نے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے لیے بھی ناول لکھتے رہو گے۔''

''ہاں بالکل ... لیکن میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ معاوضہ پھر سے طے ہو گا ... سلیم اختر تم میرے پاس آ جانا ... بات طے کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے ... ابھی تو ہمارے پاس یہ دو ناول ہیں ... سترہ اور اٹھارہ نمبر آنے والے ہیں ... ان کے بعد ان کی باری ہے ... جب یہ پریس میں چلے

جائیں گے ... تب میں تمھارے پاس آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

ہم دونوں وہاں سے چلے آئے ... اس وقت میں بھی اپنے دل پر بوجھ محسوس کر رہا تھا ... دراصل میں نے بھی یہ بات نہیں سوچی تھی کہ ہمارے درمیان اس طرح سے علیحدگی ہو گی ... حقیقت یہی تھی کہ میں جذباتی طور پر یہ بات محسوس کرنے لگا تھا کہ میں ان کے ساتھ نہیں چل سکتا ... وہ قدم قدم پر میرے جذبات کا خون کر دیتے تھے اور ایسا کرتے وقت ذرا بھی پروا نہیں کرتے تھے ... شاید اس میں میری عجیب و غریب طبیعت کا بھی دخل تھا ... میں جب تک کسی کے ساتھ ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں ہو جاتا تھا، اس وقت تک اس کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا تھا ... مالی نقصان ایک حد تک برداشت کر سکتا تھا ... جیسا کہ اس وقت بھی کیا تھا، لیکن روحانی تکلیف میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی اور یہ سب میں نے خود کو روحانی تکلیف سے بچانے کے لیے کیا تھا ...اس حالت میں میں اپنا کام نہیں کر سکتا تھا ... میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے ... غلط نہیں کیا۔

☆☆☆☆☆

O

دوسرے دن میں نقش محمد کے ساتھ مسلم کمرشل بنک گیا ... ہم نے وہاں مشترکہ اکاؤنٹ مکتبہ اشتیاق کے نام سے کھلوایا ... یہ اکاؤنٹ بیس ہزار روپے سے کھولا گیا ... میرے پاس اس وقت بھی میرے حصّے کی رقم پوری نہیں تھی ... وہ نقش صاحب نے پوری کر دی ...اس وقت میں نے ان سے کہا۔

'' جونہی پیسے میرے ہاتھ میں آئے ، میں آپ کا حساب برابر کر دوں گا۔''

'' کوئی بات نہیں... فکر نہ کریں۔'' انہوں نے خوش دلی سے کہا۔

اب میں نے کاغذ خرید کر پریس بھجوایا اور ناول چھپنے کے لیے دے دیئے ... میرا قیام ابھی تک اسی چھوٹی سی گیلری میں تھا ... اسی گیلری کو مکتبہ اشتیاق کا دفتر بنایا گیا ... اس وقت تک اپنے گاؤں سے عبید اللہ بھی آ چکا تھا... نقش صاحب نے حساب کتاب اس کے حوالے کر دیا ...ایک کھاتہ خرید کر اسے دے دیا گیا ... وہ اس میں اخراجات لکھنے لگا ...پریس اور بائنڈنگ والے سے ہم نے یہی کہا تھا کہ جونہی کتب تیار ہوں گی ، ہم آپ کے بل ادا کر دیں گے ... ادھار نہیں کریں گے ...

پہلی دونوں کتابیں ہم نے یکم جنوری 1980 کو بازار میں لانے کا پروگرام بنایا تھا ... اس غرض کے لیے کتابیں بیس دن پہلے پریس میں دے دی

تھیں ... 18 دسمبر کو کتب تیار ہو گئیں ... اشتہارات وغیرہ چھپوا کر ہم پہلے ہی بک اسٹالوں کو بھجوا چکے تھے ...

بائنڈر نے ہمیں اطلاع بھیجی کہ کتابیں تیار ہیں ، تو میں ،نقش محمد اور عبیداللہ تینوں فوراً وہاں چلے گئے ... اپنے ادارے کی پہلی دونوں کتابوں کے بنڈل ہمیں بائنڈر کی دکان پر نظر آئے ... لوہاری دروازے کے قریب گندے نالے کے پاس بائنڈر کی دکان تھی ... میں نے کہا ۔

'' ساری کتابیں کرشن نگر لے جانے کی ضرورت نہیں . . . کراچی، راولپنڈی، فیصل آباد ، پشاور وغیرہ جہاں زیادہ کتاب جاتی ہے اور بوریوں میں ڈال کر ٹرک کے اڈے پر دینی ہوتی ہیں ... وہ یہیں بوریوں میں بھر لیتے ہیں ... اس طرح ساری کتاب لے جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی ۔''

'' اچھی ترکیب ہے ... ہم یہیں سامان لے آتے ہیں ۔''

'' بالکل ٹھیک ۔''

نقش محمد ، عبیداللہ کے ساتھ چلے گئے ... ان کے پاس موٹر سائیکل تھی ...انھیں نئی چیزوں کی ضرورت تھی ... تعداد والا رجسٹر ، سیبا ، سوا ... بوریوں پر لکھنے کے لیے موٹا قلم وغیرہ ... یہ سامان آ گیا تو ہم کتابیں آرڈر کے مطابق بوریوں میں بھرنے لگے ... گندے نالے کے کنارے ہم تینوں یہ کام کر رہے تھے، موسم اگرچہ گرم نہیں تھا ... لیکن پھر بھی ہمیں پسینہ آ گیا ... دو گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد ہم نے تمام آرڈر بوریوں میں پیک کردیئے ... اس کے بعد اس مال کو ریڑھے پر لاد کر ٹرک کے اڈے پر لے گئے ... وہاں مال الگ الگ شہروں کو بک کروایا اور بلٹیاں لے کر پھر بائنڈر کے پاس آ گئے ... باقی مال ریڑھے پر لاد کر کرشن نگر لے آئے ... اب چھوٹے دکان دار بک اسٹالوں اور لائبریریوں کے پیکٹ بنانے بیٹھ گئے ... شام ہو گئی کام مکمل نہ ہو سکا ... تو باقی کام دوسرے دن آ کر مکمل کیا ... پھر ان پیکٹوں کو ڈاک خانے لے جایا گیا اور پیکٹ رجسٹری کرائے

گئے ...

اس طرح میں نے پہلے مہینے کی کتابیں پوسٹ کیں ... لاہور کے بک اسٹالوں پر نقش محمد اور عبیداللہ نے موٹر سائیکل پر کتابیں پہنچائیں... اب گویا ہماری ہنگامہ خیز کاروباری زندگی کی ابتدا ہو چکی تھی ...

مکتبہ اقرا کے ناول ابھی آئے نہیں تھے ... وہ آجاتے تب بھی کوئی بات نہیں ... کیونکہ ان کے آخر میں میرے ناولوں کے اشتہار نہیں ہو سکتے تھے ... اس وقت ہمارے ادارے کے ناولوں کی طرف کون دھیان دیتا ... اس وجہ سے پہلے پہل بہت زبردست پریشانی اور الجھن رہی ... نقش صاحب مجھ سے زیادہ پریشان تھے ... ان کا تو خیال تھا کہ ناول دھڑا دھڑ بک جائیں گے اور کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی ... جب کہ ہمارے پاس تقریباً ایک ایک ہزار ناول بچ رہے تھے ... یہ صورتِ حال بہت پریشان کن تھی ...

آخر مکتبہ اقرا کے دو ناول بازار میں آگئے ... ان کے آخر میں میری کتابوں کا اشتہار نہیں تھا ...پڑھنے والوں کو جب اشتہار نظر نہ آئے تو اس وقت اسٹالوں پر لگے اشتہارات کی طرف توجہ دی گئی اور اسٹالوں پر ناول اٹھتے نظر آئے ... ہم ان دنوں اسٹالوں کے خوب چکر لگاتے تھے اور صورتِ حال معلوم کرتے تھے ...پھر تو صورتِ حال ایسی بنی کہ نئے دو ناول آنے سے پہلے ہی ہمارے بچے ہوئے ناول بھی فروخت ہو گئے ... ادھر ادھر سے آرڈر آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ... اور ہماری پریشانی دور ہوتی چلی گئی ...

اشتہارات میں ہم نے یہ جملہ موٹے حروف میں لکھا تھا کہ اشتیاق احمد کے ناول اب صرف مکتبہ اشتیاق سے شائع ہوا کریں گے ...

تین ماہ تک ہماری حالت بہت خستہ رہی ... یہ دن ایک طرح سے بے سروسامانی کے تھے ... نقش صاحب کے پاس تو خیر بنک میں پیسے موجود تھے ... میں اپنا سارا سرمایہ مکتبہ اشتیاق میں لگا چکا تھا اور صورتِ حال یہ تھی کہ پیسے

آتے تو ہم ان سے ادائیگیاں کر دیتے ... کیونکہ وقت پر اگلے ناولوں کا شائع کرنا وقت کا سب سے بڑا تقاضہ تھا ...

وہ دن سخت تکلیف میں گزارے ... عبیداللہ کو بہرحال تنخواہ دے دیتے تھے کہ کہیں دل برداشتہ ہو کر بھاگ نہ جائے۔

ہمارے ادارے کی اگلی دو کتابیں شائع ہوئیں تو ان کی صورتِ حال پہلے سے بہتر رہی ... کیونکہ مکتبہ اقرا والی الجھن ختم ہو چکی تھی ...اب لوگ مکتبہ اشتیاق کی کتابوں کو قبول کرنے لگے تھے ... ان کا یہ شک دور ہو گیا تھا کہ کہیں یہ نقلی ادارہ نہ ہو... کیونکہ اشتیاق احمد کی کتابیں تو مکتبہ اقرا سے شائع ہو رہی تھیں ... اور پھر چھ ماہ گزرنے پر تو حالت یہ ہو گئی کہ میری کتابوں کے لیے مکتبہ اشتیاق ہی کا نام لیا جانے لگا ...

مکتبہ باغ و بہار کے مالک ماسٹر غلام رسول اور چند دوسرے لوگوں نے شروع مجھے بہت ڈرایا تھا ... کہ یہ کام نہ کریں ... نقصان اٹھائیں گے ... تباہ ہو جائیں گے ... آپ کا کام تو بس لکھنا ہے ... آپ لکھتے رہیں ... چھاپنے کے چکر میں پڑے تو لکھنے سے بھی جائیں گے ... اور چھاپنے سے بھی۔

لیکن مجھ پر جو بھوت سوار ہوا تو پھر اتر نہ سکا ... بڑا کمرہ لینے سے پہلے ان حالات میں مکتبہ اقرا کی طرف سے سلیم اختر مجھ سے ملنے ہمارے چھوٹے سے دفتر میں آیا تھا ... اس دفتر کو دیکھ کر وہ طنزیہ انداز میں مسکرا دیا ... شاید اس نے اپنی زندگی میں اس سے چھوٹا دفتر نہیں دیکھا تھا ... ہم نے اسے دری پر بٹھایا ... چائے پلائی ... پھر اس نے کہا۔

'' بھئی وہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ مکتبہ اقرا کو بھی مسودے دو گے۔''

'' بالکل کہا تھا ... '' میں نے فوراً کہا۔

'' تو پھر؟ '' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

'' اور یہ بھی تو کہا تھا کہ مسودے کا معاوضہ نئے سرے سے طے ہو گا۔''

''بالکل ٹھیک ! مجھے یاد ہے، تم نے یہ بات کہی تھی ... تو پھر بتاؤ ... اب تم فی مسودہ کتنے پیسے لینا چاہتے ہو۔''

''میں اپنے منہ سے اس بات کا جواب نہیں دوں گا ... حال ہی میں کراچی کے ایک پبلشر نے مجھے خط لکھا ہے ... وہ بھی مجھ سے ناول لکھوانا چاہتے ہیں ... انہوں نے فی مسودہ تین ہزار روپے دینے کی پیش کش کی ہے ... لیکن چونکہ اس وقت تک میں مکتبہ اشتیاق شروع کر چکا تھا ... اس لیے میں نے انھیں انکار کر دیا تھا ... یہ رہا ان کا خط ... تم خود پڑھ کر دیکھ لو ... میں تمھیں مسودے لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں ... لیکن جو معاوضہ دوسرے دینے کے لیے تیار ہیں ... تم کم ازکم وہ تو دو گے نا۔''

یہ کہہ کر میں نے کراچی کے پبلشر کا خط اس کے سامنے رکھ دیا ... اس نے خط پڑھا اور کہنے لگا :

''تو تم اب تین ہزار سے کم میں مسودہ دینے کے لیے تیار نہیں۔''

''یہ بات نہیں ... انھیں تو میں نے اتنے معاوضے پر بھی انکار کر دیا تھا ... یہ خط تو تمھاری اطلاع کے لیے دکھایا ہے ... میں مسودے لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں ... تم ساتھیوں سے مشورہ کر لو ... مشورہ کر کے مجھے بتا دینا۔''

سلیم اختر کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا ... اس کے بعد ادھر ادھر سے بہت سے لوگوں نے مسودے لکھ کر دینے کی پیشکش کی ... لیکن میں نے صاف انکار کر دیا ... کیونکہ اب میں نے سوچ لیا تھا ... اپنے ادارے کے لیے ہی لکھوں گا ... ہاں اپنا ادارہ نہ رہا تو اور بات ہے ...

اس طرح مکتبہ اشتیاق شروع ہوا... میں نے پہلے دن ہی نقش محمد صاحب سے بات صاف الفاظ میں کہہ دی تھی کہ ہم سب لوگوں کو نقد ادائیگیاں کریں گے ... کسی کو یہ بھی نہیں کہیں گے کہ کل آ کر لے جانا ... جونہی کوئی اپنا بل لے کر ہمارے پاس آئے گا ... اسی وقت اسے ادائیگی کر دی جائے گی ...

کیونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو ...

دوسری بات میں نے یہ کہی تھی کہ ملازمین کی تنخواہ ہر ماہ کی آخری تاریخ کو دے دی جایا کرے گی ... یہ نہیں کہا جائے گا کہ آج دیتے ہیں ... کل دیتے ہیں ... تیسری بات یہ طے کی تھی کہ ہم لوگ جب تک حالات درست نہیں ہو جاتے، کوئی منافع تقسیم نہیں کریں گے ... ہاں میں اپنے مسودے کے پیسے وصول کرتا رہوں گا ... آپ اور میں ادارے کے بے تنخواہ ملازم ہوں گے ... یعنی ہم کوئی تنخواہ نہیں لیں گے ... جب ادارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا تب منافعے میں ایک مقررہ رقم لے لیا کریں گے... یعنی شروع میں ہم نے پانچ پانچ ہزار روپے منافعے میں سے لینے شروع کیے تھے ...

نقش محمد صاحب نے یہ تمام شرطیں خوش دلی سے منظور کر لی تھیں... اس کے بعد میں نے ایک شرط یہ رکھی تھی کہ ہم ہر سال سارے مال کی اور نقدی کی زکوٰۃ نکالا کریں گے ...

یہ شرط انہوں نے خوش دلی سے قبول نہیں کی تھی ... بس یہ کہا تھا...

'' اچھا ٹھیک ہے۔''

'' ایک اور بات !'' میں نے مسکرا کر کہا۔

'' اور وہ کیا ۔''نقش محمد صاحب نے چونک کر کہا تھا۔

'' ہم ادارے کا انکم ٹیکس بھی باقاعدگی سے ادا کریں گے۔''

'' ایک سال تو انکم ٹیکس والے پوچھتے نہیں ... یعنی قانون ہی نہیں ہے کہ سال سے پہلے وہ پوچھ لیں ... کیونکہ ٹیکس سالانہ ہوتا ہے ... لہٰذا اس موضوع پر سال کے بعد بات کریں گے ۔''

'' اچھی بات ہے ...اب ایک بات اور بھی ہے ... اور وہ شرائط میں سے نہیں ہے ... لیکن میری عین خواہش ہے۔''

''چلیے ... وہ بھی بتادیں۔''

''ہم غریب طالب علموں کو وظیفے بھیجا کریں گے۔''

یہ سنتے ہی نقش محمد صاحب کا رنگ اڑ گیا ... انہوں نے فوراً کہا۔

''ابھی تو ہمارا ادارہ پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا ... یہ سب باتیں بعد کی ہیں ... بعد میں مناسب ہوا تو ایسا بھی کر لیں گے۔''

ان کے لہجے سے میں نے صاف محسوس کر لیا کہ وہ اس بات کے حق میں بالکل نہیں ہیں ... میں نے یہ سوچ کر سر کو جھٹک دیا کہ اگر یہ وظائف دینے کے حق میں نہیں ہیں تو کیا ہوا ... میں اپنی جیب سے بھیج دیا کروں گا ...

بہرحال یہ تھی ابتداء میرے ذاتی ادارے کی ... لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے ... تین ماہ بعد ہمیں تعداد اشاعت میں اضافہ کرنا پڑا ... اب ہم ہر ماہ دو ناول تین تین ہزار شائع کرنے لگے ...

☆☆☆☆☆

O

اور انھی دنوں ایک لڑکا مجھ سے ملنے کے لیے آیا ... اس کا رنگ صاف ستھرا سرخ وسفید تھا ... آنکھیں بڑی بڑی تھیں ... قد بھی لمبا تھا ... چہرہ بہت ہنس مکھ تھا ... اس نے آتے ہی سلام کیا ... میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور دری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ... وہ پینٹ بوشرٹ میں تھا ... دری پر بیٹھنا اس کے لیے مشکل تو تھا ... لیکن جیسے تیسے وہ بیٹھ گیا ... اس وقت میں نے محسوس کیا جیسے میرے ناولوں کا کردار فاروق احمد مجھ سے ملنے کے لیے آیا ہو ...

''میں آپ سے ملنے کے لیے کراچی سے آیا ہوں ...''

میرے ذہن میں فاروق کے بھی نقوش تھے ... اور وہ ان پر پورا اترتا تھا۔

''اوہو اچھا ... لاہور میں کسی عزیز کے ہاں آئے ہوں گے، آپ نے سوچا ، مجھ سے بھی مل لیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ بات نہیں ... آپ غلط سمجھے ۔'' وہ مسکرایا ۔

''کیا مطلب ؟''

''میں کراچی سے صرف آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔''

''نہیں !'' مارے حیرت کے میرے منہ سے نکل گیا ... پھر میں نے کہا۔

''گویا اتنا لمبا سفر آپ نے صرف مجھ سے ملنے کے لیے کیا ہے ۔''

''جی ہاں!'' اس نے کہا۔

''یہ سن کر بہت خوشی ہوئی ... اور میں پریشانی محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نے اتنی زحمت کی۔''

''یہ زحمت نہیں ... مجھے تو خوشی محسوس ہو رہی ہے۔''

''اور آپ کا نام کیا ہے۔''

''جی ... فاروق احمد ... کراچی میں میرے والد صاحب کا بلیچنگ کیمیکلز کا کاروبار ہے ... کبھی کراچی آئیں تو ہمارے ہاں ٹھہریں ... بلکہ جب بھی آپ کا کراچی آنا ہو ... آپ ہمارے ہاں ہی ٹھہرا کریں ...''

میں حیرت زدہ رہ گیا... اس کا تو نام بھی فاروق احمد تھا۔

''بہت بہت شکریہ! کراچی آنا ہوا تو ضرور آپ کے ہاں ہی ٹھہروں گا ... کیونکہ کراچی میں میرا کوئی ملنے والا نہیں ہے۔''

''بس تو پھر یہ طے رہا ... آپ جب بھی کراچی آئیں گے ہمارے ہاں ہی ٹھہریں گے۔''

چائے پی کر اور کچھ دیر بیٹھ کر یہ شرمیلا سا لڑکا چلا گیا ... جانے سے پہلے کراچی کا پتا لکھ کر دے گیا ... اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ اس لڑکے سے میرے کیا تعلقات قائم ہونے والے ہیں ... اور مستقبل میں کیا ہونے والا ہے... تقدیر کے کھیل عجیب ہیں ... بلکہ عجیب وغریب ہیں ...

اس وقت تک میں نے باقاعدہ نماز شروع کردی تھی اور میری کوشش ہوتی تھی کہ میرے ساتھ نقش محمد اور عبیداللہ بھی نماز پڑھیں ... وہ کبھی پڑھ لیتے تھے اور کبھی نہیں پڑھتے تھے...

یہ چھوٹا سا دفتر کرشن نگر کے عمر روڈ کی گلی شیخ اسٹریٹ کے مکان نمبر دو میں واقع تھا... مکان نمبر 2اور گلی نمبر 68 ... یہ پتا تھا اس کا ... فاروق احمد بعد میں جب بھی لاہور آئے ... ان کا قیام اسی گھر میں رہا ...

عمر روڈ پر ایک بڑی جامع مسجد تھی ... میں اس میں نماز پڑھنے لگا تھا ... آصف محمود کے بھائی محمد مونس خان بھی اسی مکان میں اپنی والدہ کے ساتھ آ کر رہنے لگے تھے ... وہ بھی وہیں نماز پڑھنے لگے تھے ... وہ نماز کے لیے اوپر سے اترتے تو گیلری کے دروازے پر رک کر کہتے :

''چلو اشتیاق ! نماز کے لیے چلیں ۔''

میں ان کے ساتھ ہو لیتا ... پھر تو یہ ہم دونوں کا معمول بن گیا ... اکٹھے نماز کے لیے جاتے اور اکٹھے واپس آتے ... ان دنوں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا ... اور میں اس پر آج تک حیران ہوں ...

میں ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے اذان سے بھی پہلے چلا گیا ... بھائی مونس خان اس روز لاہور سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے ... اذان میرے سامنے شروع ہوئی ... اذان سے پہلے الصلوٰۃ والسلام یا رسول اللہ پڑھا گیا ... میں بہت حیران ہوا کہ کل تک تو کسی اذان کے ساتھ یہ الفاظ نہیں کہے گئے تھے... آج اذان میں ان الفاظ کا اضافہ کیسے ہو گیا ... نماز پڑھ کر گھر آ گیا ... لیکن الجھن بدستور موجود تھی ... عصر کی اذان ہونے لگی تو پھر اذان سے پہلے یہی الفاظ کہے گئے ... اب میں نے شدید الجھن محسوس کی ...

میں نماز کے لیے گھر سے نکلا تو اس مسجد میں جانے کو جی نہ چاہا ... کچھ فاصلے پر ہرن روڈ کے سرے پر ایک اور مسجد ہے ... میں نے اپنا رخ اس مسجد کی طرف کر لیا ... وہاں اس وقت اذان شروع ہوئی تھی ... اور اذان سے پہلے یہ الفاظ نہیں کہے گئے تھے... یعنی صلوٰۃ وسلام والے ... یہ دیکھ کر مجھے بہت سکون محسوس ہوا ... میں نے وہاں نماز پڑھی اور گھر آ گیا ...

مغرب میں پھر وہیں چلا گیا ... اس طرح میں نے عمر روڈ کی مسجد میں نماز پڑھنا چھوڑ دی... ادھر بھائی مونس خان آ گئے ... میں ان کے نیچے اترنے سے پہلے ہی گھر سے نکل کر ہرن روڈ والی مسجد کی طرف چلا جاتا ... بھائی مونس خان کو

دال میں کالا محسوس ہوا ، وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے :

''تم نے نماز چھوڑ دی ۔''

'' جی نہیں ... پڑھتا ہوں ۔''

''نہیں ... تم نے نماز چھوڑ دی ۔''

'' جی نہیں ... پڑھتا ہوں ۔''

'' لیکن تم مسجد میں نظر نہیں آتے ... پہلے تم میرے ساتھ جاتے تھے... اب میں نیچے اترتا ہوں تو تم پہلے ہی جا چکے ہوتے ہو۔''

'' وہ ... میں ... دراصل آج کل ہرن روڈ والی مسجد میں نماز پڑھتا ہوں۔''

''یہ کیوں۔''

اب میں چپ ... وجہ تو خود مجھے بھی معلوم نہیں تھی ... بس میں نے الجھن محسوس کی تھی ... اور ادھر جانے لگا تھا ... آخر میں نے انھیں بتایا ...

''چند روز پہلے تک یہاں اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھا جاتا تھا اب پڑھا جانے لگا ہے ... بس اس بات سے میں نے الجھن محسوس کی۔''

'' تو اس میں کیا حرج ہے ۔''

''مجھے نہیں پتا ... بس میں نے الجھن محسوس کی ۔''

''نہیں ... تمھیں ضرور کسی نے ورغلایا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

'' جی نہیں ... مجھے کسی نے نہیں ورغلایا۔''

بھائی مونس منہ بنا کر اوپر چلے گئے ... دوتین دن بعد وہ پھر آئے ... ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی ... وہ کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا ...

'' یہ کتاب پڑھ کر دیکھو ... حقیقت تم پر کھل جائے گی ۔''

میں نے دیکھا ... کتاب کا نام '' زلزلہ'' تھا ... اور لکھنے والے کا نام

ارشد القادری تھا ... میں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔

یہ کتاب علمائے دیو بند کے خلاف لکھی گئی تھی اور سارا زور اس بات پر لگایا گیا تھا کہ دیوبندی حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے بہت بڑے گستاخ ہیں ...بھائی مونس خان نے مجھے یہ کتاب اس لیے دی تھی کہ ہرن روڈ والی مسجد دیو بند کی تھی ...

اب میں پریشان کہ بھائی مونس خان پوچھیں گے تو انہیں کیا جواب دوں گا ...جس بات نے مجھے حیرت میں ڈالا اور جو حیرت آج تک قائم ہے ... یعنی 32سال گزرجانے کے بعد بھی حیران ہوں ... اس کا ذکر میں اب کرنے لگا ہوں ...زلزلہ پڑھ کر میں بہت پریشان تھا ...

ایک روز یونہی میں نے گیلری میں بنی ایک چھوٹی سی الماری کی صفائی شروع کر دی ... اس میں میں نے کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں ... میں نے ان کتابوں کی صفائی بھی شروع کر دی... اچانک ایک پرانی کتاب کے سرورق پر میری نظر پڑی ... اس پر لکھا تھا...

''بریلوی فتنے کا نیا روپ''

''ارشد القادری کی کتاب زلزلہ کا دندان شکن جواب''

میں دھک سے رہ گیا ... جس مسئلے نے مجھے پریشان کر رکھا تھا... اس کا جواب پہلے ہی میری الماری میں اللہ تعالیٰ نے پہنچا دیا تھا ... یہ کتاب میری الماری میں کہاں سے آئی ... کیسے آئی ... مجھے بالکل معلوم نہیں تھا... آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کتاب کیسے میری الماری تک پہنچی تھی ... اور اسی بات پر میں حیرت زدہ ہوں ...

خیر میں نے اس کتاب کو پڑھا تو ذہن صاف ہوتا چلا گیا۔ ارشد القادری نے پیرا گراف نقل کرتے ہوئے بہت خرد برد کر رکھی تھی ... اس سے معلوم ہوا... وہ درست آدمی نہیں تھا ... اب میں نے وہ کتاب بھائی مونس کو دے دی اور کہا :

''اب آپ اس کتاب کو پڑھیں ...آپ کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔''

بھائی مونس نے کتاب کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا ... شاید وہ سوچ رہے تھے کہ میں یہ کتاب کہاں سے لے آیا ... خیر انہوں نے کتاب لے لی اور اس کا مطالعہ شروع کر دیا ... کتاب پڑھ کر انہوں نے مجھے واپس کر دی... لیکن تبصرہ کوئی نہ کیا ... اب وہ مجھ سے یہ نہیں کہتے تھے ... تم عمر روڈ والی مسجد میں نماز کیوں نہیں پڑھتے ... اس واقعے کے بعد مجھے دینی کتب خریدنے ، پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق شروع ہو گیا ... مالی حالات بھی اب آہستہ آہستہ بہتر ہو رہے تھے ... اس لیے کتابیں آسانی سے خرید سکتا تھا ...

ان حالات میں ادارے کو ایک سال گزر گیا ... ایک دن والد صاحب کہنے لگے :

'' بیٹا ! اگر تمہارے حالات بہتر ہو گئے ہوں تو مجھے اگلے سال حج پر بھیج دو ... میری بہت بڑی خواہش ہے ۔''

ان کی بات سن کر میں مسکرا دیا ...میں نے فوراً کہا ۔

'' اگلے سال کیوں ... اسی سال درخواست دے دیتا ہوں ۔''

ان دنوں بنکوں میں حج کے لیے درخواستیں وصول کی جاتی تھیں سو میں نے بھی والد صاحب کی درخواست جمع کرا دی اور پیسے بنک میں جمع کرا دیئے... قرعہ اندازی میں والد صاحب کا نام بھی نکل آیا ...

انہوں نے بحری جہاز کے سفر کو پسند کیا تھا ... اگرچہ میں کہتا بھی رہا تھا کہ بحری جہاز میں بہت دیر لگتی ہے ... ہوائی جہاز سے چلے جائیں ... لیکن انہوں نے یہ بات منظور نہ کی ... اس زمانے میں تمام حاجی کراچی سے جدہ کے لیے روانہ ہوتے تھے... ہوائی جہاز بھی کراچی سے ہی جاتے تھے ...

اور اس طرح سن 1981 میں، میں والد صاحب کو ٹرین کے ذریعے کراچی لے گیا ... فاروق احمد کو خط کے ذریعے پہلے ہی اطلاع دے دی تھی ...

وہ اسٹیشن پر پہنچے ہوئے تھے... ہم دونوں کو گھر لے آئے ...

اس طرح زندگی میں پہلی بار فاروق احمد کا گھر دیکھا ... اس کے والدین سے ملاقات ہوئی ... یہ گھرانہ میرے لیے بہت ہی ملنسار ثابت ہوا ... انہوں نے خوب آؤ بھگت کی ... تین دن تک والد صاحب حاجیوں کے تربیتی کیمپ میں رہے ... اور اس کے بعد بحری جہاز پر سوار ہو کر جدہ روانہ ہوگئے۔ میں واپس لاہور آگیا... اس وقت میں نے نقش محمد صاحب سے کہا ...

'' اس سال تو والد صاحب حج کے لیے گئے ہیں ، آیندہ سال میں جاؤں گا ۔''

'' ضرور کیوں نہیں ۔''

حالات بہتر ہوتے جا رہے تھے ... کتابوں کی مانگ میں اضافہ ہورہا تھا... اس وقت تک نقش محمد صاحب کے ساتھ معاملات بھی ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے ... ناول اب چار چار ہزار چھپ رہے تھے ...

اب وہ کمرہ ہمیں بہت تنگ پڑنے لگا ... کتابوں کے بنڈل رکھنے کی جگہ نہ رہی ... اب ہم سوچ میں پڑگئے کہ کیا کریں ... آخر ایک دن میں نے نقش محمد صاحب سے کہا۔

'' نقش صاحب ! جگہ کے سلسلے میں ایک تجویز ہے ، اگر آپ پسند کریں۔''

'' خرچ والی تجویز نہیں ہونی چاہیے ۔''انہوں نے کہا۔

'' خرچ کے بغیر تو نقش صاحب کوئی کام آج کے دور میں ممکن نہیں۔''

'' خیر ... پہلے بتاؤ ...تجویز ہے کیا۔''

'' ہمارے سامنے والے مکان میں شیخ صاحب اپنے ایک بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں ... ان کی اوپر والی منزل خالی ہے ...یعنی ان دونوں کے استعمال میں نہیں ... اوپر دو بڑے کمرے اور آگے بہت بڑی چھت ہے ... اگر ہمیں یہ اوپر

والا حصہ کرائے پر مل جائے تو ہمارے لیے بہت آسانی رہے گی ... ہم وہاں اپنا کام آسانی سے کرسکیں گے ... کمرے میں بہت کتابیں سماسکتی ہیں۔''

نقش محمد نے کچھ دیر تک سوچا ... پھر کہنے لگے :

'' چلوٹھیک ہے ... آپ بات کرلیں ... اگر وہ تیار ہوں تو کرایہ پوچھ لیں... پھر دیکھیں گے۔''

'' ٹھیک ہے ۔'' میں نے کہا۔

پھر میں نے پہلے شیخ صاحب کے بیٹے طارق سے بات کی ... اس نے اپنے والد سے بات کی ... اور وہ حصہ ہمیں تین سو روپے کرائے پر مل گیا ... ہم بہت خوش ہوئے ...

یہ مکتبہ اشتیاق کی ترقی کی طرف ایک اور قدم تھا ... ہم کتابوں کے بنڈل ادھر منتقل کر نے لگے ...دو دن میں یہ کام مکمل ہوا اور اب ہم نے اس کمرے کو اپنا دفتر بنا لیا ...

ہم نے چھ ماہ اس کمرے میں نکالے ... پھر ہمیں وہ کمرہ بھی چھوٹا نظر آنے لگا ... ایک روز میں نے نقش صاحب سے کہا :

'' نقش صاحب ! ایک تجویز ہے ... اگر آپ پسند کریں۔''

'' خرچ والی نہیں ہونی چاہیے ۔'' انہوں نے پھر اپنا جملہ دہرایا ... وہ خرچ سے بہت گھبراتے تھے ... میں جب بھی کوئی تجویز پیش کرنے لگتا تو وہ ڈرجاتے کہ اب کوئی خرچ کرائے گا ... میں نے بھی حسبِ معمول اپنا جملہ کہا۔

'' نقش صاحب! خرچ کے بغیر تو کوئی کام ممکن نہیں ... آج کے دور میں ۔''

'' خیر پہلے آپ تجویز بتائیں۔''

'' چھ ماہ پہلے میں نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اس گیلری سے سامنے والے مکان میں چلتے ہیں ... آپ نے یہ بات منظور کرلی تھی ۔''

’’ ہاں تو پھر اب کیا ہے۔‘‘ انہوں نے گھبرا کر کہا۔

’’ اب یہ کمرہ بھی تو چھوٹا لگنے لگا ہے۔‘‘

’’ یہ بات تو خیر ہے ... پھر ہم کیا کریں ...‘‘

’’ میں چاہتا ہوں ... ہم اردو بازار میں کوئی کرائے کی جگہ لے کر اپنا دفتر وہاں بنائیں ... اس سے ہمارا ادارہ اور ترقی کر سکتا ہے۔‘‘

’’ تجویز اچھی ہے ... لیکن بہت خرچ والی ہے۔‘‘

’’ اوہو ... نقش صاحب معاملہ ادارے کی ترقی کا ہے۔‘‘

’’ ہوں ... بات ٹھیک ہے ... لیکن سنا ہے ... وہاں کرائے کی جگہ حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے۔‘‘

’’ کوشش کرے انسان تو کیا نہیں ہو سکتا۔‘‘ میں نے ہنس کر کہا ... پھر میں نے انھیں بتایا:

’’ مین روڈ پر دکانیں حاصل کرنا مشکل ضرور ہے ... لیکن اوپر والی منزل میں ایک دو کمرے حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں ... اردو بازار میں ہماری کتابیں محبوب بک ڈپو پر جاتی ہیں ... اس کا ملازم آیا تھا ... میں نے اس سے بات کی تھی ... وہ کہہ رہا تھا ، میں آپ کو کرائے کی جگہ دلوا سکتا ہوں ...

’’ ارے ! تو یہ تجویز اس کی ہے۔‘‘ وہ چونکے ۔

’’ خیال تو مجھے ہی آیا تھا ... اس نے میرے خیال کی تائید کردی۔‘‘ میں نے جلدی سے کہا۔

’’ میں سوچوں گا بھئی ... اس طرح ادارے پر بوجھ بھی تو پڑے گا۔‘‘

’’ ایک تو آپ کو بوجھ کی فکر رہتی ہے ... آپ یہ بھی تو سوچیں کہ ایک طرف ادارے پر بوجھ پڑے گا ... تو دوسری طرف ہماری کتابوں کی فروخت پر بھی تو نمایاں فرق پڑ سکتا ہے ... اس طرح ہم کرائے کا بوجھ محسوس نہیں کریں گے۔‘‘

’’ خیر ... ہم غور کر لیتے ہیں ... مزید غور کرنے میں ہمارا حرج کیا

ہے۔''

''کوئی حرج نہیں ... ضرور غور کریں۔'' میں نے جواب دیا۔

غور کرنے میں انہوں نے ایک ماہ لگا دیا ... میں اس دوران بے چین رہا ... میں جلد از جلد اردو بازار چلے جانا چاہتا تھا ... وہاں کاروبار کی ترقی کے بہت مواقع تھے ... آخر نقش صاحب بھی وہاں جانے پر تیار ہو گئے ...

محبوب بک ڈپو کے ملازم سے بات کی گئی ... اس نے جلد ہی ہمیں بتایا کہ دو کمروں کا ایک دفتر کرائے کے لیے مل سکتا ہے ... ہم نے وہاں جا کر جگہ دیکھی ... جگہ مناسب نظر آئی ... لہٰذا پانچ ہزار روپے پگڑی کے ادا کر کے وہ جگہ کرائے پر لے لی گئی ... اور ہم کتابوں سمیت وہاں منتقل ہو گئے ...

اب ہمارا نیا دور شروع ہوا ... کتابوں کے خریداروں میں اضافہ ہونے لگا ... بک اسٹالوں کے آرڈر بڑھنے لگے ... ہر ماہ ہمیں کچھ زیادہ ہی کتاب چھپوانی پڑتی تھی ... لائبریریوں والوں سے بھی کتابیں مانگی جانے لگیں... وہ بھی کتابیں خرید کر کرائے پر دینے لگے ...

ایک طرف ہم ترقی کی منازل طے کر رہے تھے ... دوسری طرف ایک اور تکلیف دہ معاملہ شروع ہوا... پھر اس معاملے نے مجھے پوری طرح جکڑ لیا ...

☆☆☆☆☆

O

مکتبہ اشتیاق کو قائم ہوئے ایک سال پورا ہو چلا تھا۔
نقش محمد ایک سال تک تو میرے ساتھ بہت خوش مزاجی سے چلتے رہے ... سال کے بعد ان میں روکھا پن آنا شروع ہوا ... ہم نے طے کیا تھا کہ لوگوں کے بلوں کی ادائیگی ساتھ ساتھ کریں گے ... جونہی وہ بل لینے کے لیے آئیں گے ... ان سے یہ نہیں کہا جائے گا ... کہ کل آکر لے جانا ... پرسوں آکر لے جانا ... میں نے یہ بات طے کرتے وقت حدیث شریف کا حوالہ دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دینی چاہیے ...بل لینے کے لیے آنے والے سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ کل آنا ...پرسوں آنا یا ایک ہفتے کے بعد آنا ...
میں یہ بات بالکل پسند نہیں کرتا تھا ، لیکن اس کے باوجود نقش صاحب نے اس بات پر عمل بالکل ترک کر دیا ...جو بل لینے کے لیے آتا ، وہ اس سے کہتے... '' کل آکر لے لینا۔''
یا وہ کہتے: '' پرسوں آجانا۔''
میں نے انھیں ٹوکا: '' یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس رقم موجود ہے پھر کسی سے یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ کل آنا یا پرسوں آنا ۔''
میری اس بات کا جواب انہوں نے یہ دیا۔
'' اشتیاق صاحب ! آپ نہیں جانتے ... یہ لوگ اسی طرح سیدھے رہتے

ہیں ... اگر انھیں فوراً بل دے دیا جائے تو کل یہ ہمیں کتابیں وقت پر چھاپ کر نہیں دیں گے ... میرا مطلب ہے ... ان لوگوں کے ساتھ ذرا سخت رویہ رکھنا چاہیے۔''

''لیکن جناب ! ہم یہ بات طے کر چکے ہیں۔''

'' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ... میں انھیں زیادہ چکر نہیں لگواتا۔''

'' لیکن میرے خیال میں چکر لگوانے کی ضرورت ہے ہی نہیں۔''

'' آپ ان باتوں کو نہیں سمجھتے ... آپ بس لکھنے کی حد تک رہیں ... باقی سب کام میں دیکھ لوں گا ... آپ بس پر سکون رہ کر لکھتے رہیں اور اپنا حصّہ لیتے رہیں۔''

ان کے الفاظ سن کر میں دھک سے رہ گیا ... تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا تھا ... اس قسم کے خیالات کا اظہار جلال انور نے بھی کیا تھا ... میرے اندر ہلچل شروع ہو گئی ...

پھر ایک اور واقعہ پیش آیا ... ہم نے طے کیا تھا کہ ہر سال باقاعدہ زکوٰۃ نکالا کریں گے ... میں نے رمضان میں نقش صاحب سے کہا

'' آپ زکوٰۃ کا حساب لگا لیں ... کل زکوٰۃ کا نصف مجھے دے دیں ... میں اپنے رشتے داروں اور محلّے داروں میں خود تقسیم کروں گا ... آپ اپنا حصّہ خود تقسیم کریں۔''

'' اچھی بات ہے۔''

انہوں نے کہا اور حساب کتاب کرنے کے بعد مجھے بتا دیا کہ اتنی زکوٰۃ بنتی ہے ... اس کا نصف انہوں نے مجھے دے دیا ... کچھ دن بعد شدید ترین بارشیں ہوئی ... اور نہ جانے کس طرف سے بارش کا پانی ہمارے اسٹاک کی طرف آ گیا ... ان گنت کتابیں بھیگ گئیں اور وہ فروخت ہونے کے قابل نہ رہ گئیں ... مجھے فوراً خیال گزرا کہ کہیں نقش صاحب نے زکوٰۃ پوری پوری نہ نکالی ہو اور اس

وجہ سے ہمار انقصان ہوا ہو۔

میں نے نقصان کا اندازہ لگایا تو تقریباً پچیس ہزار روپے کی کتابیں خراب ہوئی تھیں ... مجھ سے رہا نہ گیا ... میں نے ان سے پوچھ لیا:

''نقش صاحب کیا آپ نے زکوٰۃ کا حساب بالکل پورا پورا کیا تھا۔''

''نہیں ... اندازے سے حساب لگا لیا تھا ... اب تمام کتابیں کون گنتا۔''

اور میں سمجھ گیا کہ نقصان کیوں ہوا تھا ...

ایک مسئلہ اور پیش آیا ... عید کا موقع تھا ... مجھے جھنگ جانا تھا... میں نے ان سے کہا۔

''عید کے سلسلے میں ملازمین کو ڈبل تنخواہیں دے دیجیے گا۔''

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا ... بس سر ہلا دیا ... اس سے میں نے سمجھا کہ وہ کہہ رہے ہیں: ''اچھا ...''

اس وقت ہمارے پاس تین ملازم کام کرتے تھے ...عبیداللہ ملازمت چھوڑ کر اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ میں عید گزار کر آیا تو میں نے تینوں سے پوچھا:

''عید پر تنخواہ ڈبل مل گئی تھی نا۔''

تینوں نے کوئی جواب نہ دیا ... مجھے حیرت سی ہوئی ... نقش صاحب ابھی گھر سے نہیں آئے تھے ...

''تم نے بتایا نہیں۔''

''جی نہیں ... انہوں نے ہر ماہ جتنی ہی تنخواہ دی تھی۔''

''کیا !!!''

مجھ پر بم سا گرا ... گویا انہوں نے میری بات کا ذرا سا بھی اثر نہیں لیا تھا ... کچھ دیر بعد نقش صاحب آ گئے ... گرمجوشی سے ملے ... گزشتہ عید مبارک کہا پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے ... میں بھرا بیٹھا تھا ...ذرا دیر کے لیے بھی نہ رک سکا:

''نقش صاحب ... میں نے آپ سے کہا تھا کہ عید پر ان تینوں کو ڈبل

تنخواہ دے دیجیے گا ... لیکن آپ نے تو انھیں ایک تنخواہ جتنے ہی پیسے دیئے ہیں۔''

'' ہاں ! اشتیاق صاحب ... بات یہ ہے کہ ایسا کہیں نہیں ہوتا ... نہ کسی سرکاری محکمے میں نہ غیر سرکاری میں۔''

'' نہ ہو ... لیکن میں ایسا چاہتا ہوں ... چلیے خیر ... اب انھیں ایک ایک تنخواہ اور دے دیں۔''

نقش صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے ... مجھے بہت حیرت ہوئی، بے تحاشہ غصّہ بھی آیا ... میں نے طیش کے عالم میں اپنی جیب سے پیسے نکالے اور ان تینوں کو ان کی تنخواہ کے حساب سے دے دیئے ... نقش صاحب نے یہ بات صاف طور پر دیکھی ... لیکن انہوں نے کوئی حرکت نہ کی ... نہ کچھ کہا۔

اس وقت میری حالت عجیب ہو گئی۔ مجھے صاف نظر آنے لگا کہ نقش صاحب کے نزدیک میری کوئی حیثیت نہیں، نہ وہ ادارے کو ان خطوط پر چلائیں گے جو ہمارے درمیان طے ہو چکے ہیں ...

اور ابھی تو میں غریب طالب علموں کو وظیفے بھی جاری کرنا چاہتا تھا ... نقش محمد صاحب تو اس طرف کبھی بھی نہ آتے ... انہوں نے اپنی آنکھوں سے مجھے تینوں ملازمین کو اپنی جیب سے عید کی زائد تنخواہ دیتے دیکھا تھا ... انہوں نے اخلاقاً بھی کچھ نہیں کہا تھا ... اس سے میرے دل پر بجلی سی گری تھی ... دراصل پہلے دن سے میرے جذبات یہ تھے کہ میں اپنے ادارے کو مثالی ادارہ بنانا چاہتا تھا ... لیکن نقش صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے میرے لیے یہ ممکن نظر نہیں آرہا تھا ... اسی لیے میں سوچ رہا تھا ... اگر میں نقش صاحب کے ساتھ رہا تو میں اپنی آرزوؤں اور امیدوں اور جذبات کو کبھی تسکین نہیں دے سکوں گا ... اپنا خواب کبھی پورا نہیں کرسکوں گا ...

ایک آخری وار اور ہوا ... جس نے مجھے سلگا کر رکھ دیا ... میں ہر ہفتے جھنگ جاتا تھا ... کیونکہ والد صاحب اور بیوی بچے اور چھوٹے بھائی سب جھنگ

میں تھے ... لاہور میں تو میں اکیلا تھا ... اس لیے ہر ہفتے جاتا تھا ... چھ دن لاہور میں گزارتا تو دو دن جھنگ میں ... جھنگ سے آیا تو بیلنس میں سے تیس ہزار روپے کم تھے ... تیس ہزار کا چیک نقش صاحب نے نکلوایا تھا ... میں نے ان سے پوچھا ...

''یہ تیس ہزار کس سلسلے میں نکلوائے آپ نے۔''

انہوں نے فوراً کہا اور بغیر کسی جھجک کے کہا۔

'' ایک گاڑی ٹیوٹا اچھی حالت میں ساٹھ ہزار کی مل رہی تھی ... تیس ہزار میرے پاس تھے ... سو تیس میں نے ادارے کے حساب میں سے لے لیے... میں جمع کرا دوں گا۔''

یہ بھی معاہدے کی خلاف ورزی تھی ... اگر انہوں نے تیس ہزار نکالے تھے تو تیس ہزار ہی میرے لیے بھی نکالے جاتے ... اور اگر اتنا بیلنس نہیں تھا تو ایسا کیا ہی نہ جاتا ... اس لیے مجھے اور دکھ ہوا اور آخر کار میں نے نقش صاحب سے صاف کہہ دیا :

'' نقش صاحب ... اب ہم ساتھ نہیں چل سکتے۔''

'' یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' انہوں نے تلملا کر کہا۔

'' بس میرے مزاج میں اور آپ کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

'' یہی بات آپ نے مکتبہ اقرا والوں سے کہی تھی۔''

''ہاں ! اس لیے کہ بات یہی تھی۔''

'' لیکن آپ اس طرح ادارہ نہیں چھوڑ سکتے۔''

'' نقش صاحب ... تحریری معاہدہ موجو د ہے ... اس کی شرائط پڑھ لیں ... پہلی شرط یہی ہے کہ اگر ہم دونوں میں سے کوئی ادارے سے الگ ہونا چاہے تو ہوسکتا ہے ... اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔''

نقش محمد سکتے کے عالم میں آ گئے ... وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے ... طے یہ تھا کہ جب تک خوشگوار حالات میں کاروبار کر سکے ... کرتے رہیں گے ... ورنہ الگ ہو جائیں گے ... اور علیحدگی کے وقت جس قدر کتابیں چھپ چکی ہوں گی... ان کا نصف نصف کر لیا جائے گا ... نقش صاحب کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی ...

وہ دن میرے لیے بہت پریشانی کے دن تھے ... نقش صاحب ایک طرح سے مجھے دھمکانے پر اتر آئے تھے ... کچھ اور لوگ بھی مجھے برا کہہ رہے تھے، مجھ تک یہ باتیں پہنچیں کہ یہ ہے ہی ایسا ... پہلے اس نے مکتبہ اقرا والوں کے ساتھ کاروبار ترک کیا اور اب نقش صاحب کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہتا ہے ...

یہ سب باتیں ٹھیک ہی ہوں گی ... لیکن سچ یہی ہے کہ میرے جو عزائم تھے ... وہ پورے ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے...یعنی نقش صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے میں دل کے ارمان پورے نہیں کر سکتا تھا ... جب نقش صاحب یہ حساب کتاب کرنے پر تیار نہ ہوئے تو آخر میں نے کہا :

'' میری مرضی کے بغیر آپ مجھ سے ناول کیسے لکھوا سکتے ہیں ... سوال تو یہ ہے ... اس بات پر غور کریں اور حساب کتاب کر لیں ...اس وقت تک ہم 150 کے قریب کتابیں شائع کر چکے ہیں ... ان میں 75 آپ کی ہیں ... وہ شائع کرتے رہیں ... آپ کا کاروبار جاری رہے گا ... رک نہیں جائے گا۔''

آخر کار نقش صاحب کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ حساب کتاب ہوا اور ہر چیز نصف نصف کی گئی ... ادھر میں اس منزل سے اوپر والی منزل پر اپنے لئے دو کمرے کرائے پر لے چکا تھا ... تینوں ملازمین نے نقش صاحب کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا ... وہ میرے ساتھ رہنا چاہتے تھے ... انہوں نے چند ہی گھنٹوں میں میرے حصّے کی ہر چیز اوپر منتقل کر دی ...

دوسرے دن سے ہی میں نے اگلے ماہ کی کتابوں کی تیاری شروع کر دی

...اس طرح میرے خالص ذاتی ادارے کی بنیاد پڑی ... اور سچ تو یہ ہے کہ اس دن سے میں نے خود کو آزاد محسوس کیا ... اب میں ادارے میں اپنی مرضی چلا سکتا تھا ... میرے جو ارادے تھے ...جو عزائم تھے... انہیں پورا کر سکتا تھا ... اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا ... اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میرے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں ...

☆☆☆☆☆

O
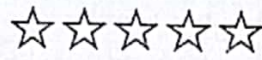
فٹ پاتھ پر حلیم اور چنوں سے روٹی کھانے والا ... کوئلے اور لکڑی کی آڑھت پر سو روپے ماہوار پر سارا دن کام کرنے والا اور پھر شیخ غلام علی اینڈ سنز میں صرف دو سو روپے ماہوار پر جگنو کی ادارت کرنے والا ... دو دو سو اور تین تین سو روپے میں ان اداروں کو ناول فروخت کرنے والا ... دنیا کے طعنے سننے والا اور ناکامیوں کے خوف دلائے جانے والا ... آج خود ایک ادارے کا مالک بن گیا تھا ... جب کہ اس کے ناولوں کا اب طوطی بول رہا تھا ... مانگ تھی کہ برابر بڑھ رہی تھی ... آرڈر پر آرڈر آنے لگ گئے تھے ...

لیکن اب میرے سامنے ایک مسئلہ یہ تھا کہ نقش محمد صاحب نے ایک نئے لکھنے والے سے دو جاسوسی ناول لکھوا کر ان کی اشاعت کی تیاری شروع کر دی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ میرے ناولوں کے بازار میں آنے سے پہلے پہلے ان کے ناول بازار میں آجائیں... اس وقت اگر ایسا ہو جاتا تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا ... کیونکہ ناول تو اشتیاق احمد کے نام سے خریدے جارہے تھے ... لیکن اس کے باوجود ... ہم نے دن رات محنت کرکے ناول ان سے پہلے شائع کر ڈالے ... اب میرے ادارے کا نام اشتیاق پبلی کیشنز تھا ... ان حالات میں ایک نئی پریشانی شروع ہوئی۔

اشتیاق پبلی کیشنز اب نقش محمد صاحب والی منزل سے اوپر تھا...

بک اسٹالوں والے اور دوسرے شہروں سے آنے والے سیدھے نقش

صاحب کے کمرے میں آتے اور ان سے پوچھتے...

''اشتیاق صاحب سے ملنا ہے ... وہ کہاں ہیں۔''

وہ فوراً جواب دیتے ... ''وہ تو لکھنا چھوڑ چکا ہے ... ادارہ ختم کر کے جھنگ چلا گیا ہے ... آپ فرمایئے ... اس کے لکھے ہوئے ناول چاہئیں۔''

اس قسم کے جواب وہ لوگوں کو باقاعدگی سے دینے لگے ... ادھر اشتیاق پبلی کیشنز سے شائع ہونے والے ناولوں پر میرا پتا اشتیاق پبلی کیشنز، بالائی منزل راجپوت مارکیٹ برابر شائع ہو رہا تھا ... پڑھنے والے اور بک اسٹالوں والے حیران ہوئے کہ راجپوت مارکیٹ میں تو اشتیاق احمد ہے نہیں ... یہاں تو نقش محمد ہیں... آہستہ آہستہ لوگوں کو معلوم ہوتا رہا کہ میں اب اوپر والی منزل پر چلا گیا ہوں ... لیکن نقش صاحب کی وجہ سے ہر وقت پریشانی سی رہنے لگی ... بہت سے لوگ مجھے نقش محمد کے بارے میں بتاتے تھے کہ وہ آپ کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ وہ ناول لکھنے چھوڑ گیا ہے ...

انہی دنوں ایک واقعہ رونما ہوا ... اس واقعے نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی ...

میں اب جھنگ میں ہی رہنے لگا تھا ... ہفتے میں دو دن کے لیے لاہور آتا اور بقیہ پانچ دن جھنگ میں گزارتا تھا ... اس لیے لکھنے کا زیادہ کام بھی جھنگ میں ہی کرتا تھا ... اس وقت تک میں پانچ بچوں کا باپ بن چکا تھا ... بڑے دو بچے فرحت اور نوید اسکولوں میں داخل تھے ... تین بچے ابھی چھوٹے تھے ... بچے لکھنے کے کام میں خوب رکاوٹ ڈالتے ... آخر میں نے سوچا، مجھے لکھنے کی کوئی الگ جگہ لینی چاہیے ... جہاں بیٹھ کر میں لکھنے کا کام سکون سے کیا کروں ... اس بات کا ذکر میں نے اپنے جھنگ کے ملنے والوں سے کیا ...

ایک صاحب نے مجھے بتایا ... نئے شہر میں پانچ مرلے کا ایک مکان برائے فروخت ہے ... آپ اسے دیکھ لیں ... ان لوگوں کو آج کل پیسوں کی

ضرورت ہے ... اس لیے مناسب قیمت پر مل جائے گا ...

میں نے جا کر وہ مکان دیکھا ...اس میں صرف دو کمرے بنے ہوئے تھے ... اور ایک غسل خانہ تھا ... باقی جگہ خالی پڑی تھی ... لکھنے کے لیے یہ جگہ بہت پر سکون محسوس ہوئی ... مالک مکان پچاس ہزار روپے مانگ رہا تھا اور اس میں سے کچھ بھی کم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا ... مجھے ایک خیال کے تحت وہ جگہ بہت زیادہ بھائی تھی... اس لیے میں نے خرید لی ... جگہ تو خرید لی ... لیکن روزانہ گھر سے اس جگہ جانا آنا بھی ایک مسئلہ تھا ...

پھر میں نے سوچا ... آنے جانے کے لیے ایک گاڑی بھی اب خرید لی جائے ... اس پر لاہور چلا جایا کروں گا ... اس خیال کا آنا جانا تھا کہ گاڑی کی کوشش شروع کر دی۔ کسی نے بتایا کہ نئے شہر میں ایک صاحب ہیں ... نمبر دار کہلاتے ہیں ...ان کا کام ہی یہی ہے ... گاڑیاں خرید نا اور بیچنا ... میں ان سے ملا ... اس وقت ان کے پاس ایک ٹیوٹا گاڑی تھی ... مجھے تجربہ تو تھا نہیں ... بس حالت کے اعتبار سے وہ اچھی لگی ... میں نے درمیان میں ایک دو آدمیوں کو شامل کر لیا کہ کہیں کوئی دھوکے بازی نہ ہو جائے ... اس طرح زندگی میں پہلی بار کار خریدی گئی ...

کار خریدتے وقت مجھے یاد آیا ... خورشید مجھ سے کہا کرتی تھی ... میں ایسے آدمی سے شادی کروں گی جس کے پاس ایک کار اور ایک کوٹھی ہو ... خورشید ابھی تک دل محمد روڈ والے کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھی ... قسمت کے کاموں پر بہت حیرت ہوئی ... میں نے تو کبھی خواب میں نہیں سوچا تھا کہ ایک کار بھی خرید سکوں گا ... میں نے کار تو خرید لی ... اب ڈرائیور کا مسئلہ پیدا ہوا ... میں نے کار کے سابقہ مالک سے ذکر کیا ... انہوں نے بتایا :

"میں جس مستری سے کار کی مرمت کا کام کراتا ہوں ... ڈرائیور حضرات کا اس کے پاس بہت آنا جانا ہے ... کوئی ڈرائیور بیکار ہوگا تو فوراً آپ

کے پاس بھیج دے گا ..."

میں نے مستری صاحب سے رابطہ کیا ... اس نے فوراً ہی ایک ڈرائیور سے ملوا دیا... اس طرح ڈرائیور بھی مل گیا ... اب میں روزانہ صبح کار میں بیٹھ کر نئے شہر جانے لگا ... وہاں ظہر کی نماز تک ٹھہرتا اور پھر گھر آجاتا ... کار کھڑی کرنے کی جگہ ایک دوست نے مہیا کر دی تھی ...

اب جس نظریے سے میں نے وہ جگہ خریدی تھی ... اس پر کام شروع کیا ... چھوٹا بھائی اشفاق احمد ضلع کونسل میں ملازم ہو چکا تھا ، میں نے اس سے کہا۔

" اپنے دفتر کے مالی کو ذرا میرے پاس لے آنا ۔"

وہ مالی کو لے آیا ... میں نے دونوں کمروں کے سامنے جو خالی جگہ پڑی تھی ... وہ اسے دکھائی ... پھر میں نے اس سے کہا ...

" میں اس ساری جگہ میں گھاس لگوانا چاہتا ہوں ... اور پلاٹ کے چاروں طرف پودے لگوانا چاہتا ہوں ... موتیا کے پودے ... گلاب کے پودے اور دوسرے پھولوں کے پودے ... سرو اور مور پنکھ کے پودے ۔"

میری بات سن کر اس نے کہا ۔

" ٹھیک ہے ... میں کام شروع کر دیتا ہوں ۔"

مالی نے کام شروع کر دیا ...زمین نرم کر کے اس نے گھاس لگا دی ... پھر پودے لگانے کا کام شروع ہوا ... میں نے اس سے کہا ۔

" میں چاہتا ہوں ... یہاں ہر رنگ کے ولایتی گلاب کے پودے لگائے جائیں ..."

" اس کے لیے تو پھر جناب فیصل آباد جانا پڑے گا ... تمام رنگوں کے گلاب تو وہیں سے ملیں گے ... یہاں تو بس سرخ گلاب مل سکتا ہے ۔"

" ٹھیک ہے ... میں آپ کو آنے جانے کا خرچ دے دیتا ہوں ... اور پودے خریدنے کے لیے رقم بھی ... آپ لے آئیں اور بھی جو پودے یہاں نہ مل

سکتے ہوں ... ان میں سے بھی کچھ لے آئیں ...''

کچھ دنوں بعد گھاس کے پلاٹ کے چاروں طرف پودے لہلہا رہے تھے ... چاروں کونوں پر چار سرو لگ گئے تھے اور چار مورپنکھ ... اس کام کے ہو جانے کے بعد میں نے ایک لوہار کو بلوایا ... اس سے کہا ...

''میں گراؤنڈ کے درمیان میں ایک جھولا لگوانا چاہتا ہوں ... لوہے کی زنجیروں والا۔''

''جی اچھا ... لگا دیتے ہیں۔''

اس طرح جھولا لگایا گیا ... اب میں نے ایک معمار کو بلوایا ... اس سے پوچھا ... ''آپ نے بچوں کے پارک دیکھے ہیں، ان میں بچوں کے پھسلنے کیلئے سلائیڈیں لگی ہوتی ہیں ... جن کو سلپری اور پھسل بنڈا بھی کہا جاتا ہے ... جن پر بچے اوپر چڑھ کر نیچے پھسلتے ہیں ... میں اس گراؤنڈ کے ایک طرف دیوار کے ساتھ وہ بنوانا چاہتا ہوں۔''

اس نے حساب کتاب لگا کر بتایا:

''اس پر دس ہزار کے قریب خرچ آئے گا۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''فکر نہ کریں ... کام شروع کردیں۔''

ایک ہفتے بعد پھسلن بن گئی ... اب یہ پارک میرے لکھنے کی جگہ تو بن ہی گیا تھا ... بچوں کے کھیلنے کودنے جھولنے اور پھسلنے کا پارک بھی بن چکا تھا ...

اتوار کا دن آیا تو میں نے بچوں سے کہا۔

''میں نے تم لوگوں کے لیے ایک مزے دار جگہ بنوائی ہے ... آج تم سب میرے ساتھ وہاں چلو گے ...''

بچے تو خوش ہو گئے ... میرے بچے پارکوں میں جانے، جھولنے پھسلنے کے بہت شوقین تھے ... جب بھی یہ میرے ساتھ لاہور جاتے تو چڑیا گھر ... جوائے لینڈ وغیرہ ... جگہوں پر ضرور جاتے تھے ... اور وہاں سے آنے کا نام

نہیں لیتے تھے ... سو میں نے ان کے لیے یہ چھوٹا سا پارک بنوایا تھا ... میں گاڑی میں بچوں کو لے کر نئے شہر والے گھر پہنچا ... بچے پارک میں داخل ہوئے تو پہلے تو وہ حیرت زدہ رہ گئے ... پھر اس طرح اچھلنے کودنے لگے کہ جیسے انہیں کوئی بہت بڑی دولت ہاتھ آگئی ہو ...

اس روز وہ جی بھر کر جھولے اور پھسلے ... پارکوں میں انھیں یہ آسانی حاصل نہیں ہوتی تھی ... وہاں تو دوسروں کے لیے جھولے خالی کرنے پڑتے تھے ... یاان کے خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑتا تھا ...

میں انھیں خوش ہوتے دیکھ کر بے پناہ خوشی محسوس کرتا رہا ... پھر ہر چھٹی کے دن انھیں یہاں لانا میرا معمول بن گیا ... اس روز ہم سب کھانا بھی وہیں کھاتے تھے ... گویا پکنک کا سماں ہوتا تھا ...

یہ معمول اس وقت جاری رہا جب تک ہم سب ہولناک حالات میں مبتلا نہیں ہو گئے ... اس سانحے کا ذکر اپنے وقت پر آنے والا ہے ...

اب میں نے گاڑی میں لاہور جانا شروع کر دیا ... اردو بازار راجپوت مارکیٹ کے عقب میں اس وقت خالی جگہ پڑی تھی ... گاڑی وہاں کھڑی کر دی جاتی۔

ایک شام میں نئے شہر والی جگہ سے واپس گھر آیا تو محلّے کی ایک لڑکی کو اپنی بیٹی فرحت کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کرتے پایا ... میں نے اس لڑکی کو پہلے بھی دوتین بار باتیں کرتے پایا تھا... مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ یہ فرحت سے کیا باتیں کرتی رہتی ہے ... اس کے جانے کے بعد میں نے فرحت سے پوچھا:

''یہ لڑکی کون ہے ... اورتم سے کیا کہتی رہتی ہے۔''

''یہ ہمارے محلّے کی ہے ... بس آجاتی ہے باتیں کرنے کے لیے ... کہتی ہے ہم مرزائی ہیں اور حکومت نے ہم پر بہت ظلم کیا ہے ... ہمارے خلاف آرڈی ننیس پاس کیا ہے ... اور یہ کہ تم ہماری کتابیں دیکھو ... ان میں تو کوئی بھی

ایسی غلط بات نہیں ہے ... پھر بھی ہمیں کافر کہا جاتا ہے ... ''

یہ سن کر میں نے شدید الجھن محسوس کی ... میں نے فرحت سے کہا ...

'' اچھا ! اب وہ آئے تو اس سے کہنا ... اپنی کتابیں ہمیں دکھائے ۔''

'' جی اچھا ۔'' فرحت نے سر ہلا دیا ۔

چند دن بعد وہ پھر آئی ... فرحت نے اسے میرا پیغام دیا یعنی اس نے یوں کہا : '' میرے ابو آپ لوگوں کی کتب دیکھنا چاہتے ہیں ۔''

وہ اچھا کہہ کر چلی گئی ...

لیکن اس دن کے بعد ہمارے گھر نہ آئی ... اس پر مجھے حیرت ہوئی ... مجھے مرزائیت کے بارے میں بس اتنا معلوم تھا کہ یہ لوگ مرزا غلام احمد قادیانی لعین کو نبی مانتے ہیں جب کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کسی کو نبوت نہیں ملے گی ...

میں سوچنے لگا ... ایک مرزائی لڑکی میرے گھر آکر میری بچی کو ورغلانے کی کوشش کر سکتی ہے ... تو میں تو ایک قلم کار ہوں ... میں اس موضوع پر کیوں نہیں لکھ سکتا ... اس سوچ کا آنا تھا کہ میں نے ایک ناول لکھا ... اس وقت مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ ناول مجھے کہاں لے جائے گا ... یا میری زندگی میں کیا تبدیلی آئے گی ... یا کیا ہونے والا ہے ...

ناول کا نام رکھا ، وادی مرجان ... یہ ستمبر 1984ء کو شائع ہوا... اس کے ساتھ ناول نوٹ بک، سرخ تحریر اور بند محل شائع ہوئے ... ناول بازار میں آئے چند دن گزر گئے ... ایک روز میں دفتر میں کام میں مصروف تھا کہ دو ہٹے کٹے آدمی دفتر میں داخل ہوئے ... ان کی موٹی موٹی آنکھیں کافی خوفناکی لیے ہوئے تھیں، ہاتھوں پیروں کے بھی بہت مضبوط دکھائی دیتے تھے ...

انہوں نے اندر داخل ہوتے کہا : '' السلام علیکم ۔''

'' وعلیکم السلام ۔'' میں نے جواب دیا اور انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا ...

وہ میری میز کے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے ... اب ان میں سے ایک نے کہا: '' آپ اشتیاق احمد ہیں ؟'' لہجہ خوفناک تھا ... میں سہم سا گیا۔

ان دونوں کا ڈیل ڈول بھی کافی تھا ... دفتر میں اس وقت تین ملازم موجود تھے ... لیکن ان کی موجودگی میں بھی میں نے خوف محسوس کیا ...

'' جی ہاں ! میں ہی اشتیاق احمد ہوں۔''

'' وادی مرجان آپ نے لکھی ہے ۔''

'' جی ہاں ! میں نے ہی لکھی ہے ۔''

'' یہ آپ نے ہمارے خلاف لکھی ہے ۔''

میں یہ سن کر بہت حیران ہوا : '' آپ کون ہیں ۔'' میں نے پوچھا ۔

'' ہم ... ہم احمدی ہیں ۔''

مجھے پتا نہیں تھا کہ کون لوگ خود کو احمدی کہلاتے ہیں ... لہٰذا میں نے کہا۔

'' احمدی کون ؟ ''

'' ہم مرزائی ہیں ۔'' آخر اس نے بتایا۔

'' یہ ناول تو پھر آپ لوگوں کے خلاف نہیں ہے ... اس میں کسی مرزائی کا نام نہیں ، ہاں یہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہے ... جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد ایک شخص کو نبی مانتے ہیں ۔''

'' ہم کہہ رہے ہیں نا ، یہ آپ نے ہمارے خلاف لکھا ہے ... اور ایسے ہی نہیں لکھ دیا ، پہلے آپ ہمارے شہر ربوہ گئے ... ربوہ کو گھوم پھر کر اچھی طرح دیکھا ، اس کے بعد آپ نے یہ ناول لکھا ہے ... ورنہ آپ یہ ناول اس طرح لکھ ہی نہیں سکتے تھے... اس میں ربوہ کے ایک ایک مقام کا ذکر ہے ... مناظر کا ذکر ہے ... طریقوں کا ذکر ہے ... اور آپ کہہ رہے ہیں ... میں کبھی ربوہ نہیں گیا...''

یہ باتیں سن کر مارے حیرت کے میرا برا حال ہوگیا ... کیونکہ میں ربوہ کا نام بھی انھی سے سن رہا تھا ... اس سے پہلے تو کبھی میں نے یہ نام سنا بھی نہیں تھا ... آخر میں نے ان سے کہا ...

''میں نے واقعی ربوہ نہیں دیکھا۔''

''یہ بات بالکل غلط ہے ... آپ نے پہلے ربوہ دیکھا ... پھر یہ ناول لکھا۔''

''خیر آپ یقین کریں یا نہ کریں ... میں نے ربوہ نہیں دیکھا ... لیکن آپ کی باتیں سن کر میں حیرت زدہ ہوں ... اور ربوہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اگر یہ بات ہے تو آپ آئیں ... ہم آپ کو ربوہ دکھائیں گے۔''

''اچھی بات ہے ... میں ربوہ آؤں گا اور آنے سے پہلے آپ کو اطلاع دوں گا ... آپ اپنے نام پتے لکھ دیں۔''

ان میں ایک نے نام پتے لکھ کر مجھے دے دیئے ... اور چلے گئے ... میں حیرت زدہ اور فکر مند سا جھنگ آیا ... میں نے ان باتوں کا ذکر اپنے ایک دوست حکیم محمد سلیم صاحب سے کیا ... اور کہا :

''میں ربوہ جانا چاہتا ہوں۔''

''اس سے پہلے آپ یہاں کے ختم نبوت کے مبلغ سے مل لیں ... میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں ... ان کا نام مولانا غلام حسین ہے۔''

''اچھی بات ہے ...''

مولانا غلام حسین سے ملاقات ہوئی ... میری بات سن کر انہوں نے کہا۔

''آپ اکیلے وہاں نہ جائیں ... دو چار دوستوں کو ساتھ لے جائیں ... بلکہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

میں تین دوستوں کے ساتھ ربوہ گیا ... مولانا غلام حسین بھی ساتھ تھے ... ربوہ اسٹیشن کی مسجد مسلمانوں کی تھی ... مولانا غلام حسین نے کہا :

'' میں یہاں مسجد میں بیٹھتا ہوں ... آپ کے ساتھ میرا جانا ٹھیک نہیں ... ہاں کوئی مسئلہ ہوا تو میں پہنچ جاؤں گا۔''

'' جی ٹھیک ہے۔''

اب میں تینوں دوستوں کے ساتھ آگے بڑھا ... شہر میں داخلے کے دروازے پر راستہ بند کیا گیا تھا ... اس وقت مجھے ان دونوں کی بات یاد آئی...وہاں گارڈ موجود تھے ... ان میں سے ایک نے پوچھا ...

'' آپ کو کس سے ملنا ہے ... کہاں جانا ہے۔''

میں نے کاغذ پر لکھے نام پتے اسے دے دیئے ...

'' ہم ان دونوں کو یہیں بلا لیتے ہیں ... آپ اس طرف بیٹھیں ۔''

ہم حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے ... کیا یہ ہمارے ملک کا حصّہ نہیں ہے ... تو پھر اس شہر کے اندر جانے پر پابندی کیوں ہے ... کیا یہ کوئی پرائیویٹ کارخانہ ہے ... کوئی مل ہے ... یہ تو شہر ہے ... تھوڑی دیر بعد وہ دونوں آتے نظر آئے ... انھوں نے گارڈ کا اطمینان کرایا اور بتایا کہ ان کے مہمان ہیں ... تب کہیں جا کر ہمیں آگے جانے دیا گیا ... اب ان دونوں نے ہمیں ربوہ کی سیر کرائی ... گھمایا پھرایا ... دارالخلافہ دکھایا جس کا ذکر ناول میں موجود تھا ... مجھے حیرت ہوئی ... ناول میں اس کا ذکر اسی طرح تھا ...پھر ان میں سے ایک طنزیہ کہنے لگا ...

'' آپ نے اپنے ناول میں لکھا ہے کہ ان لوگوں نے ایک دارالخلافہ بنایا ہوا ہے ... اس کے نیچے تہہ خانے ہیں ... ان تہہ خانوں میں یہ لوگ علماء کرام کو قید رکھتے ہیں ... اور ان کی لاشیں وہاں موجود ہیں ... اب دکھائیں... کہاں ہیں وہ لاشیں ۔''

اس کا اعتراض سن کر میں مسکرا دیا ... پھر میں نے کہا۔

'' آپ اس کی کھدائی کروا لیں ... نیچے تہہ خانے نہ ملیں اور ان میں

لاشیں نہ ملیں تو میں سزا وار۔''

میری بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا ... وہ کھسیانہ ہو گیا ... اب وہ کھانا پکانے کی جگہ لے آیا ... پھر بڑی مسجد دکھائی ... اس کا نام انہوں نے مبارک مسجد رکھا ہوا ہے ... ربوہ کی لائبریری میں لے گیا ... اور کہنے لگا ...

''یہ ہمارے شہر کی لائبریری ہے ... اس میں وادی مرجان کی اشاعت سے پہلے تک آپ کی تمام کتب تھیں ... اب اٹھا دی گئی ہیں۔''

''اوہو اچھا۔'' میں حیران رہ گیا۔

آخر میں وہ ربوہ کے کالج لے گئے ... بالائی منزل کے ایک کمرے میں ہمیں لا بٹھایا گیا ... جلد ہی ان کا ایک مربی اندر داخل ہوا ... اس نے اپنا تعارف مبشر احمد کاہلوی کہہ کر کرایا، پھر بیٹھتے ہوئے بولا ...

''ہمارے ان دو حضرات نے آپ کے بارے میں بتایا ہے ... میں نے مناسب جانا کہ آپ کے شکوک اور شبہات دور کر دوں ... آپ جو سوال کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔''

اس وقت مجھے مرزائیت کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔

بس واجبی سی چند باتیں معلوم تھیں، وہ بھی اس لیے کہ مولانا غلام حسین سے ایک دو کتابیں یہاں آنے سے پہلے لے کر پڑھی تھیں ... میں نے اس سے پہلا سوال کیا: ''ٹیپو سلطان کون تھے۔''

شاید اس سے یہ سوال آج تک کسی مسلمان نے نہیں کیا تھا ...

میرا سوال سن کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ... اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا نے انگریزوں کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کیے ہیں ... جب کہ سلطان ٹیپو شہید رحمتہ اللہ علیہ ساری زندگی انگریزوں سے لڑتے رہے ... اور آخر لڑتے لڑتے شہید ہوئے ... آخر اس نے جھلا کر کہا۔

''مجھے نہیں معلوم! ٹیپو کون تھا۔''

'' آپ کالج میں پڑھاتے ہیں ... اور آپ کو یہ معلوم نہیں ... خیر ... میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ مرزا اپنی کتاب آئینۂ کمالاتِ اسلام میں لکھتا ہے کہ جو مجھے اور میری کتابوں کو نہیں مانتا ، وہ بدکار عورتوں کی اولاد ہے ... جب کہ مرزا کے اپنے بیٹے فضل احمد نے ، مرزا کو نبی نہیں مانا اور مرزا نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی ... تو کیا مرزا کا وہ بیٹا بدکار عورت کی اولاد نہیں تھا۔''

اس سوال کا اس نے یہ جواب دیا ... '' مرزا صاحب نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ وہ ذریۃ البغایہ ہیں ... یعنی سرکش عورتوں کی اولاد ہیں ... انہوں نے بدکار عورتوں کی اولاد نہیں لکھا۔''

لیکن یہ اس نے غلط جواب دیا تھا ... کیونکہ میں نے جھنگ میں مرزا کی کتابوں میں ذریۃ البغایہ کا ترجمہ دیکھا ... یعنی جو ترجمہ خود مرزا نے کیا تھا ... وہ بدکار عورتوں کی اولاد ہی کیا تھا ... میں نے مبشر احمد کاہلوی کو خط لکھا ... لیکن اس نے خط کا جواب نہ دیا ...

خیر تو ذکر ہو رہا تھا ملاقات کا ... ملاقات کے وقت مبشر احمد کاہلوی نے طنزیہ انداز میں مجھے ایک کتاب کمالاتِ اشرفیہ دی اور کہنے لگا ...

'' آپ اس کتاب کو پڑھیں ... اور اس کا جواب دیں۔''

اس کے بعد ملاقات ختم ہوگئی ... میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس مسجد میں پہنچا ... وہاں مولانا غلام حسین موجود تھے ... میں نے ان کے سامنے وہ کتاب رکھی ... ربوہ کی سیر اور ملاقات وغیرہ کی تفصیل سنائی ... سن کر مولانا کہنے لگے ...

'' فکر کی کوئی بات نہیں ... اس کتاب کا جواب ہمارے پاس ہے ... میں آپ کو مولانا محمد صدیق صاحب سے ملواتا ہوں ... پھر ہم ملتان بھی چلیں گے۔''

'' مولانا محمد صدیق صاحب کون؟ '' میں نے ان سے پوچھا۔

'' خیر المدارس ملتان سے ہر ہفتے جھنگ آتے ہیں ، یہاں جمعہ پڑھاتے ہیں ... جمعے کے بعد چلیں گے ... ان سے ملاقات کریں گے ... اس کتاب کے

بارے میں وہ تفصیلات بتائیں گے اور ہمیں مفید مشورہ بھی دیں گے۔''

''اچھی بات ہے۔''

جمعے کے بعد ہم اس مسجد میں گئے جس میں مولانا محمد صدیق جمعہ پڑھاتے تھے اور نماز کے بعد وہاں کچھ دیر تک بیٹھتے تھے ... لوگ ان سے علمی باتیں پوچھتے تھے اور علاج معالجے کے لیے بھی ان سے اپنی بات کہتے تھے ... مولانا علاج معالجے کے بھی ماہر تھے ... وہ مولانا غلام حسین کو دیکھتے ہی کھل اٹھے ... مولانا نے میرا تعارف کرایا ... اور ساری بات بتائی ... جب انہوں نے یہ سنا کہ مرزائیوں نے انہیں ربوے بلوایا تھا اور یہ کہ ہم وہاں سے ہو کر آ رہے ہیں تو ان کی آنکھوں میں دلچسپی کے آثار واضح ہو گئے۔

سب لوگوں کو فارغ کر کے انہوں نے بتایا ...'' آپ کا مسئلہ ملتان جانے پر حل ہو گا ... کیونکہ کمالاتِ اشرفیہ کا جواب یہاں نہیں ملتان میں ہے ...

مولانا غلام حسین نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ... میں نے فوراً کہا۔

'' وہاں چلے چلتے ہیں ... لیکن اب میں ہر جمعہ مولانا صاحب کے پیچھے پڑھا کروں گا ... ان کا خطاب سن کر بہت ہی متاثر ہوا ہوں۔''

اور پھر ہوا بھی یہی ... ان کے پیچھے جمعہ پڑھنا ... ان کے درس سننا میری زندگی کا معمول بن گیا ... مولانا صاحب سے ربط اس قدر بڑھا کہ میں ان کے بہت نزدیک ہوگیا ... وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرنے لگے ... ان سے آج بھی تعلق قائم ہے۔

اگرچہ اب مولانا بہت ضعیف ہوچکے ہیں ... چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے ... جامعہ خیر المدارس میں اب بھی طلبا کو حدیث پڑھاتے ہیں ... جامعہ خیرالمدارس میں اس وقت شاید سب سے زیادہ عمر رسیدہ شیخ الحدیث وہی ہیں۔

اس طرح میں زندگی میں پہلی عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان کے دفتر گیا

... وہاں اس وقت ناظم اعلیٰ محمد شریف جالندھری رحمتہ اللہ تھے ... وہ بہت زیادہ محبت سے پیش آئے ... مولانا غلام حسین نے ساری تفصیل سنائی ... اس وقت مرزائیوں کو دی گئی کتاب کی حقیقت کا پتا چلا ... مرزائیوں کی اس کتاب کا نام تھا کمالاتِ اشرفیہ ...

اس کتاب میں انہوں نے مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ پر الزام عائد کیا تھا کہ انھوں نے اپنی ایک کتاب احکام اسلام عقل کی نظر میں، میں مرزا کی پانچ کتابوں سے اقتباسات لیے ہیں ... اگر ہمارے مرزا جھوٹے تھے تو آپ کے مولانا اشرف علی تھانوی کو ان کی کتابوں سے اقتباسات لینے کی کیا ضرورت تھی۔

اس معاملے کی حقیقت یہ تھی کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے مرزا کی پانچ کتابوں سے اقتباسات نہیں لیے تھے ... بلکہ اسرارِ شریعت، نامی ایک کتاب میں یہ پانچوں اقتباسات تھے... اس سے انھوں نے لے لیے تھے ... اب یہ ایک اتفاق تھا کہ مرزا نے بھی اسی کتاب سے وہ اقتباسات لیے تھے ... اور مولانا تھانوی صاحب نے اپنی کتاب کے دیباچے میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں ایک کتاب سے کچھ اقتباسات لیے ہیں ... اور وہ کتاب اسرارِ شریعت اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ایک پرانی لائبریری سے ملی تھی ... آج بھی یہ کتاب عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان کے دفتر میں محفوظ ہے ... ساری حقیقت معلوم ہونے پر میں نے مبشر احمد کاہلوی کو جواب لکھا کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے یہ اقتباسات اسرارِ شریعت نامی کتاب سے لیے ہیں ... میں اس کے صفات کی فوٹو اسٹیٹ آپ کو بھیج رہا ہوں ... اب آپ جواب دیں ... ہم نے تو آپ کے الزام کا واضح جواب آپ کو دے دیا...

مبشر احمد کاہلوی نے اس سوال کا جواب بھی نہ دیا ... اس نے جواب بے شک نہیں دیا ... لیکن وادی مرجان نے مجھے ختم نبوت کے عالمی ادارے سے

منسلک کر دیا اور یہ اللہ رب العزت کا اتنا بڑا احسان ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا ... کہاں میں ایک ناول لکھنے والا ... کہاں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت سے تعلق ... پھر یہی نہیں ... کچھ مدت بعد میں نے وادی مرجان کے بعد ناول جاپانی فتنہ لکھا ... ختم نبوت کے علما کرام نے اس ناول کو بھی پڑھا ...

اس کے بعد مجلس کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنے انداز میں مرزا قادیانی پر کتاب لکھوں... ان کے حکم کی تعمیل میں میں نے کتاب مرزا غلام احمد قادیانی لکھی ... یہ کتاب بہت زیادہ پسند کی گئی ... اس کے بعد مجھے حیرت کا ایک زبردست جھٹکا اس روز لگا جب مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نے فون پر بتایا ...

''آپ کو عالمی مجلس ختم نبوت کی مجلسِ شوریٰ کا رکن چن لیا گیا۔''

''لیکن حضرت ... مجلس کی شوریٰ کے تو تمام ارکان عالم حضرات ہیں ... جب کہ میں عالم نہیں ... ایک عام انسان ہوں ۔''

اس پر مولانا نے فرمایا : ''نہیں بس ... آپ کے حق میں یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے ۔''

میں نے بہت شرم محسوس کی... لیکن بڑوں کے فیصلے ماننے پڑتے ہیں ... اس وقت سے میں ہر سال شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے ملتان جاتا ہوں ... چناب نگر (ربوہ) میں سالانہ ختم نبوت دو روزہ کانفرنس ہوتی ہے ... اس میں شرکت کرتا ہوں ... ہر سال شعبان میں چناب نگر میں ردِ قادیانیت کورس کرایا جاتا ہے ... وہاں ایک عدد لیکچر دینے کے لیے بھی بلایا جاتا ہے ... اگرچہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا لیکن چلا جاتا ہوں ... کہ چلو ... فرشتے شرکت کرنے والوں میں نام ہی لکھ لیں گے ... ختم نبوت کے رسائل ماہنامہ ختم نبوت اور ماہنامہ لولاک میں اسی مضامین لکھے ...جو شائع کیے گئے ...

الحمد للہ ! یہ سب میرے مالک کا کرم ہے ... فضل ہے ... اس کی

1988 کی ایک تصویر۔

1977 کی ایک تصویر۔

PRESS CARD

CHAND SITARE

9/12, Naseerabad, Sanda Kalan, Lahore.

Phone: 321537

Serial No: 001/CS-88.

Designation: Chief Editor.

Date of issue: 1st of Nov 1988.

If found, please return to the above address.

Director (Press Information),
General Public Relations,
of the Punjab, Lahore.

Holder's Signature:

Issuing Author
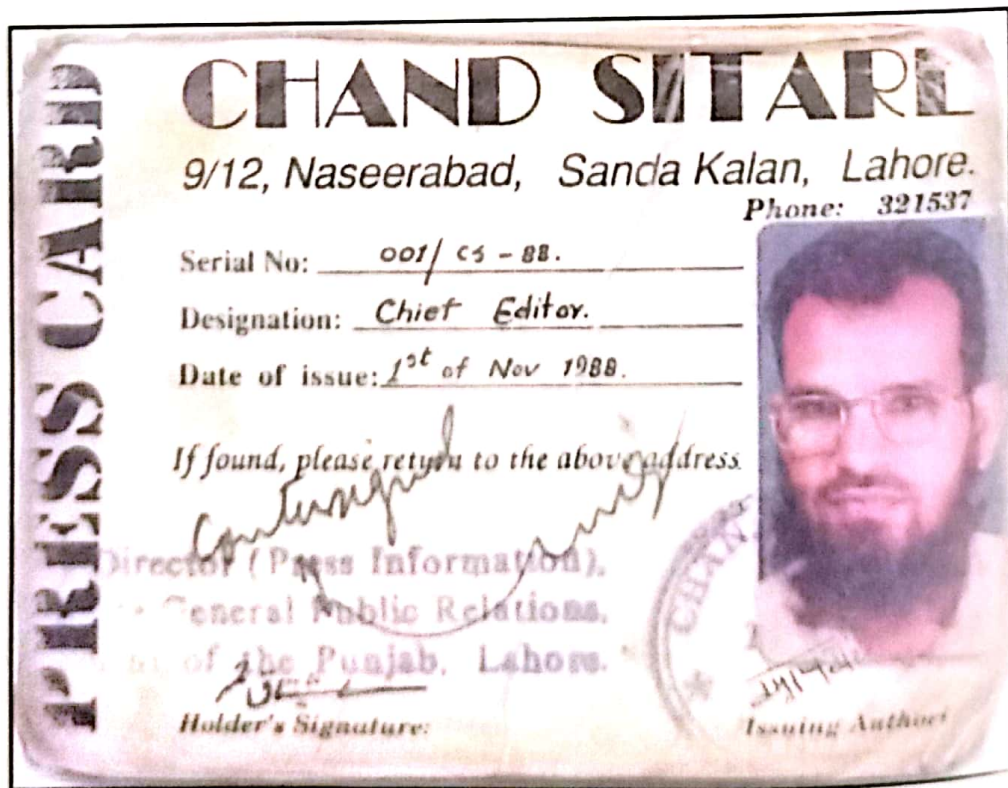
اشتیاق احمد کے ذاتی ادارے کے تحت شائع ہونے والے
ماہنامہ چاند ستارے کا پریس کارڈ۔

اشتیاق احمد اپنے والد محترم مشتاق احمد صاحب (مرحوم) کے ہمراہ کلفٹن پر۔
یہ تصویر 1981 کی ہے اس مقام پر آج ڈالمین مال تعمیر ہو چکا ہے۔

اشتیاق احمد کے والد محترم مشتاق احمد صاحب حج سے واپسی پر۔
یہ تصویر کراچی بندرگاہ پر اتاری گئی۔ (1981)۔

اشتیاق احمد....فاروق احمد کے گھر میں (1980)۔
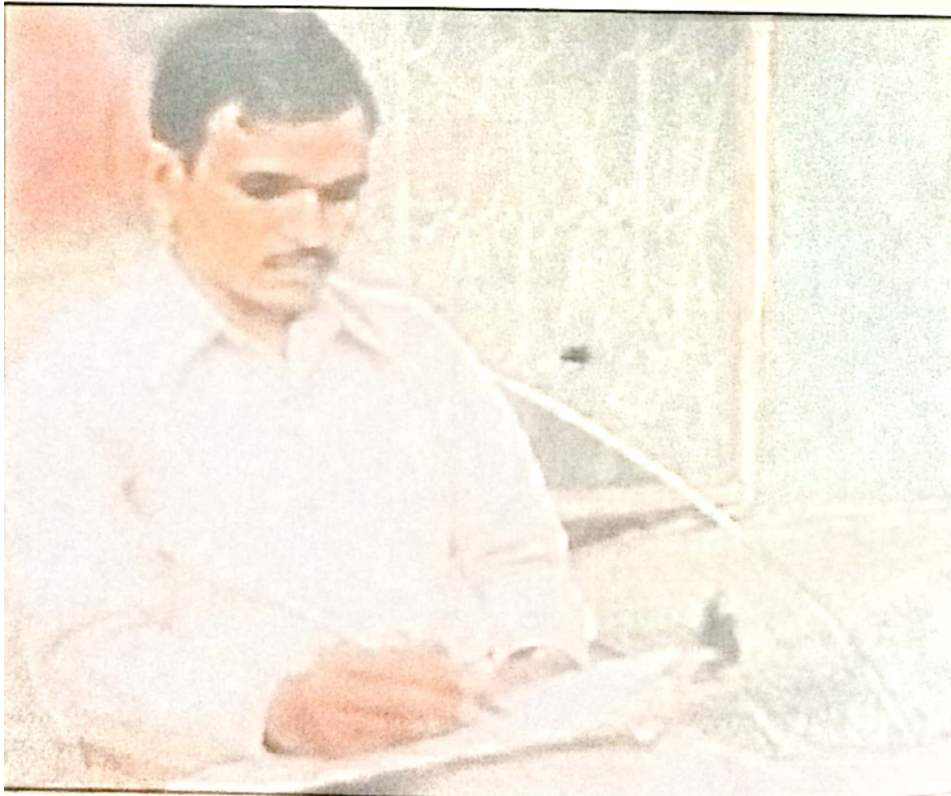
اشتیاق احمد....فاروق احمد کے گھر میں قیام کے دوران ''تیسرا آدمی'' لکھتے ہوئے۔
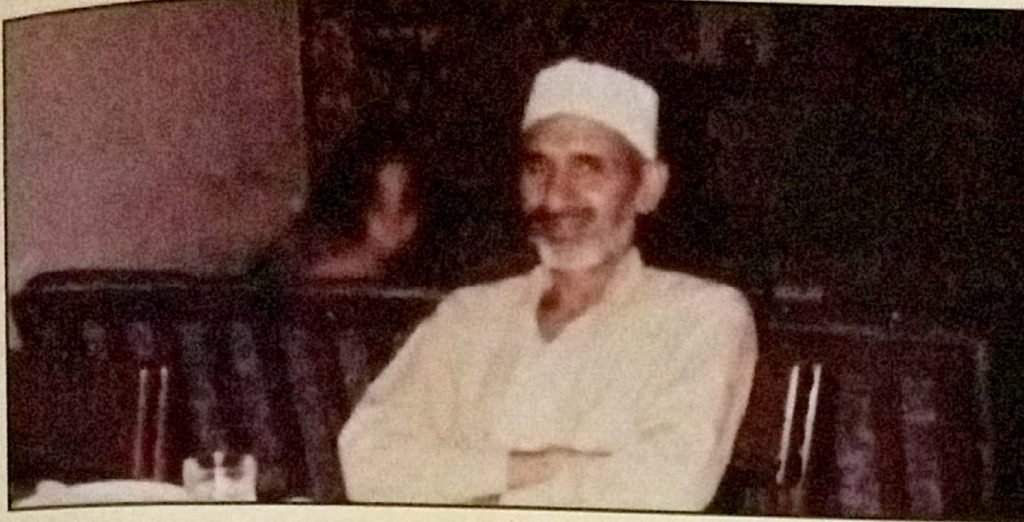
اشتیاق احمد کے والد محترم مشتاق احمد صاحب (1981)۔
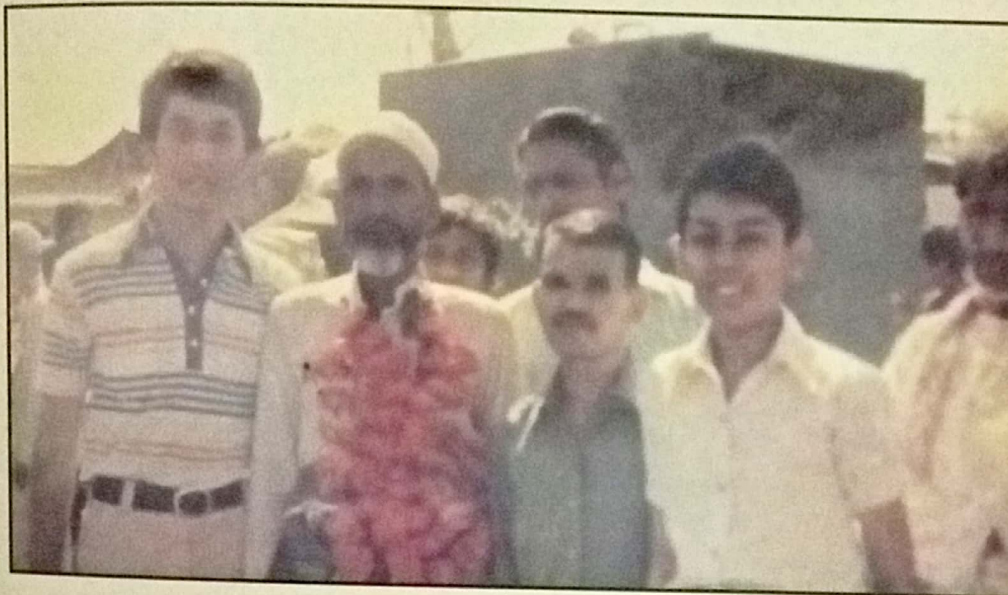
مشتاق احمد صاحب کی حج سے واپسی

(وقار احمد، اشتیاق احمد، مشتاق احمد صاحب اور فاروق احمد)(1981)۔
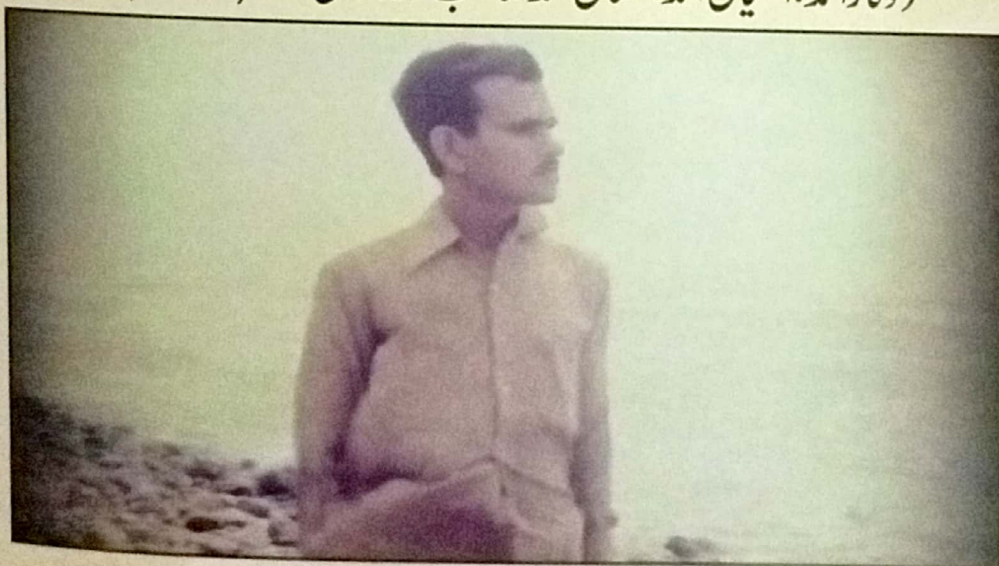
کلفٹن کے ساحل پر (1981)۔

عنایات ہیں ... مرزائی لوگ میرے پاس آنے لگے ... وہ سوالات کرتے ... میں ان کے جوابات دیتا ... اس طرح مناظرانہ کیفیت پیدا ہو جاتی... ناول چونکہ پورے ملک میں جا رہے تھے ... اس لیے پورے ملک سے باطل فرقے مجھے خطوط لکھنے لگے ... یہ خطوط بھی مناظرانہ انداز کے ہوتے ... اس کے بعد مجھے ہر موضوع پر کتب خریدنے کی ضرورت پیش آنے لگی ... اب الحمد للہ !مالی حالات پہلے والے تو تھے نہیں ، لہٰذا دھڑا دھڑ کتب خریدنے لگا ... یہاں تک کہ میرے پاس ایک لائبریری بن گئی ... یہ لائبریری اب بھی موجود ہے ... اور اس میں ہر موضوع پر... ہر باطل فرقے کے خلاف کتب موجود ہیں ۔

O

1981ء میں والد صاحب حج کے لیے گئے تھے ... میں نے اسی وقت نیت کرلی تھی کہ آئندہ سال میں جاؤں گا ، والدصاحب کے واپسی کے دن قریب آئے تو میں انھیں لینے کے لیے کراچی چلا گیا ... فاروق احمد اپنے دوست علی کے ساتھ مجھے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے ... بہت گرمجوشی سے ملے ... اپنے گھر لائے ... ان کے والدین اور چھوٹے بھائی وقار احمد سے ملاقات ہوئی ... سب ہی پر خلوص انداز میں ملے ... پھر میں فاروق احمد کے ساتھ بندرگاہ چلا گیا ... والد صاحب کو لے کر واپس جھنگ پہنچا ...

اب جب بنکوں میں حج کی درخواستیں لی جانے لگیں تو میں نے بھی فوراً درخواست دے دی اور اللہ کی مہربانی سے میری درخواست بھی والد صاحب کی طرح پہلے سال ہی قرعہ اندازی میں نکل آئی ... ورنہ ان دنوں قرعہ اندازی میں لوگ تین تین چار چار سال تک انتظار کرتے تھے...

میں حج کے لیے ہوائی جہاز سے گیا ... ان دنوں ہوائی جہاز سے بھی سب لوگ کراچی سے ہی جاتے تھے ... سب سے پہلے کراچی پہنچتے تھے ... وہاں سے حج پروازیں روانہ ہوتی تھیں...ایک بار پھر فاروق احمد سے ملاقات ہوئی... میں پروا ز سے کئی دن پہلے چلا گیا تھا ... اس طرح فاروق احمد کے گھرانے کے ساتھ کئی دن بہت ہی خوشگوار گزرے ... سچ پوچھیں تو مجھے وہ دن بہت زیادہ یاد آتے ہیں ...ان کے والد بہت سنجیدہ مزاج تھے اور والدہ بہت ہنس مکھ ... دونوں

بہت ہی محبت سے پیش آتے ... آخر میں حج کے لیے چلا گیا ... ڈیڑھ ماہ بعد واپسی ہوئی ... تو ایک دن کے لیے پھر فاروق احمد کے ہاں ٹھہرا ... اور پھر ٹرین سے جھنگ آ گیا ... اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے حج کی سعادت نصیب فرمائی ...

ایک روز ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا ... دفتر میں بیٹھا تھا، کہ دو صاحبان ملنے کے لیے آئے۔ دونوں ادھیڑ عمر تھے اور لمبے قد کے تھے ایک گورے سے رنگ کے تو دوسرے سانولے رنگ کے تھے ...ان میں سے ایک نے سوالیہ انداز میں کہا...

"اشتیاق احمد؟"

"جی میں ہوں۔" میں نے کہا ... ملازمین بھی اس وقت ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے...

"ہم ریڈیو پاکستان سے آئے ہیں ... پروگرام پروڈیوسر ہیں۔" گورے رنگ والے نے نام ریاض احمد بتایا ... دوسرے کا نام میں بھول گیا ...

"اوہو اچھا۔" ریڈیو پاکستان کا نام سن کر میں چونکا۔

"جی ہاں! ہم چاہتے ہیں ... آپ ریڈیو پاکستان کے لیے جاسوسی ڈرامے لکھیں۔"

"جاسوسی ڈرامے۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! جاسوسی ڈرامے ... ان کا دورانیہ نصف گھنٹا ہوا کرے گا ... آپ آدھ گھنٹے کا ڈراما لکھ دیا کریں ... ریڈیو پاکستان آپ کو ان کی باقاعدہ ادائیگی کرے گا... ہم اخبار میں اشتہار بھی دیں گے... ان پر تبصرے وغیرہ بھی پاکستان ٹائمز میں آئیں گے ..."

"لیکن میں نے کبھی ڈرامے نہیں لکھے۔" میں نے کہا۔

"جب کہ ہمارا خیال ہے ... آپ لکھ سکتے ہیں ... آپ شروع تو کریں... اگر آپ کو کسی موڑ پر دقت پیش آئی تو ہم مدد کریں گے آپ کی ...

ڈراما لکھ کر آپ ریڈیو پاکستان لے کر آجایئے گا ... میرا نام استقبالیہ کو نوٹ کرا دیجیے گا ... میں آپ کے پاس آجاؤں گا۔''

''جی ... جی اچھا ... میں کوشش کرتا ہوں۔''

''اور ہم آپ کا انتظار کریں گے۔''

''اچھی بات ہے۔''

اس طرح زندگی میں پہلی بار ریڈیو پاکستان کے لیے ڈرامہ لکھا ... وہ آج کا دور تو تھا نہیں ... ریڈیو پاکستان کی ان دنوں بہت اہمیت تھی ... خیر... میں نے ڈراما لکھا اور ریڈیو پاکستان پہنچ گیا۔

ریاض احمد تک پہنچنے میں دقت ہوئی ... لیکن آخر ملاقات ہو گئی ... ریاض احمد نے ڈرامے کو الٹ پلٹ کر دیکھا ... پھر کہا:

''ٹھیک ہے ... یہ ہم پڑھ لیتے ہیں ... یہ چونکہ سرکاری ادارہ ہے ... پہلے باقاعدہ اس کی منظوری لینی پڑتی ہے ... آپ اس دوران اور لکھ لیں ... میں فون پر آپ کو بتا دوں گا۔''

''جی اچھا۔''

میں وہاں سے چلا آیا ... ادارے میں فون اس وقت تک لگ چکا تھا ... دوسرے دن ہی ریاض احمد کا فون آ گیا ...

''آپ کا پہلا ڈرامہ منظور ہو گیا ہے ...آپ اور لکھ کر لے آئیں۔''

''جی اچھا۔''

اس سلسلے کا نام میں نے انسپکٹر نوید رکھا تھا ... پہلا ڈرامہ نشر ہوا... میں نے بھی سنا... دوستوں نے بھی سنا ... اچھا لگا ... ادھر انہوں نے ادائیگی بھی کر دی ... روزنامہ پاکستان ٹائمز میں اس پر تبصرہ بھی شائع ہوا ... اس کی خبر بھی مجھے دی گئی ...

میں نے اوپر تلے ڈرامے لکھے ... میں نے ریاض احمد سے ڈراموں کی

کیسٹیں حاصل کیں اور گھر والوں کو بھی ڈرامے سنائے ... بعد میں میں نے ان ڈراموں کو اپنے ادارے سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا ... ان ڈراموں کی یہ کتابیں شائع ہوئیں ... نیلا پھول ، ٹرین میں جرم ، عجیب پہلو... اور سرغنہ...

ایک روز مال روڈ کے فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا ... انارکلی سے آیا تھا ... عجائب گھر کے نزدیک پہنچنے والا تھا ... مجھ سے آگے ایک اپ ٹوڈیٹ نوجوان آئس کریم کون کھاتا جارہا تھا ... عجائب گھر کے باہر فٹ پاتھ کے کنارے کسی انگریز کا ایک بت نصب ہے ... اس بت کی چوکی پر لنگوٹی باندھے ایک ملنگ بیٹھا تھا ... لنگوٹی کے علاوہ اس کے جسم پر اور کوئی کپڑا نہیں تھا ...

اپ ٹوڈیٹ نوجوان جونہی اس ملنگ کے پاس سے گزرنے لگا ... کون آئس کریم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور فٹ پاتھ پر ملنگ کے سامنے گر پڑی ...نوجوان آگے بڑھ گیا ... میں آٹھ دس قدم اس سے پیچھے تھا ... اس وقت میں نے ایک عجیب منظر دیکھا ... وہ ملنگ آئس کریم کے گرتے ہی ... کسی چوپائے کی حالت میں آگیا ... یعنی ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا ... اور چوپائے کی طرح ہی اس گری ہوئی کون کی طرف بڑھا ... جو اب پگھلتی جارہی تھی ... اور پھر کون کے بالکل قریب پہنچ کر اس نے کسی جانور کی طرح اس گری ہوئی آئس کریم کو زبان سے چاٹنا شروع کر دیا ...

مجھے ایک جھٹکا لگا ... میرے اٹھتے قدم رک گئے ...فٹ پاتھ پر جم سے گئے... میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے آئس کریم چاٹتے دیکھ رہا تھا ... دوسرے لوگ میرے پاس سے گزر رہے تھے ... سامنے سے بھی آرہے تھے ... لیکن میرے علاوہ اس منظر کو دیکھنے کے لیے کوئی نہ رکا۔

ایک میں اکیلا وہاں رکا کھڑا تھا ...دوسری طرف ملنگ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ کوئی اسے آئس کریم چاٹتے دیکھ رہا ہے ... یا گزرنے والے لوگ اسے ایسا کرتے دیکھ کر کیا خیال کریں گے ... اور جب تک اس نے تمام

آئس کریم چاٹ نہ لی ... اس وقت تک اس نے اپنی زبان کو نہ روکا ... آخر تمام آئس کریم اس کے پیٹ میں منتقل ہوگئی ... تب وہ واپس مڑا اور اسی طرح بت کی چوکی پر بیٹھ گیا ... میں نے ایک نظر ادھر ادھر ڈالی ... کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا ... کوئی اس منظر کو دیکھنے کے لیے نہیں رکا تھا ... سوائے میرے... اس وقت مجھے محسوس ہوا ... مجھ میں اور دوسرے لوگوں میں کوئی فرق ہے ... اور وہ فرق یہی ہے کہ میں ایک لکھنے والا ہوں۔

لکھنے والے میں اور عام لوگوں میں نمایاں فرق یہی ہے کہ لکھنے والا دوسرے کی نسبت شاید سو گنا حسّاس ہوتا ہے ... یہ واقعہ آج کا نہیں ... بیس سال پرانا ہے ... لیکن میں آج تک اس منظر کو نہیں بھول سکا ...اسی قسم کا ایک واقعہ ایک دن اس وقت پیش آیا ... جب میں نگار سینما والے ہوٹل سے کھانا کھا کر اس کی سیڑھی سے اترا ... ساتھ ہی ایک ریڑھی والا کھڑا تھا ... اس نے ریڑھی پر تربوز لگا رکھے تھے ... تربوز کاٹ کر چھلکا الگ کر کے گودا اس نے برف کی پوری سل پر سجایا ہوا تھا ... شدید گرمی کا موسم تھا ... اور برف پر لگا تربوز لوگوں کو دعوت دے رہا تھا کہ اسے کھایا جائے ...

میں ہوٹل کی سیڑھی سے نیچے اترا ہی تھا کہ میرے قدم وہیں جم گئے ... ریڑھی والے نے تربوز کے چھلکے ریڑھی کے ساتھ زمین پر گرائے ہوئے تھے... ان چھلکوں پر کسی حد تک سرخ سرخ رنگ کا گودا لگا رہ گیا تھا ... میں نے دیکھا ، ایک نوجوان عین اسی وقت سائیکل پر سے گزرا ... اس کی نظر ان چھلکوں پر پڑی ... اس نے سائیکل کو زور دار بریک لگائی ... ایک ہاتھ میں اس نے ایک پیکٹ پکڑا ہوا تھا، اس وقت میں نے اس پیکٹ کی طرف نہیں دیکھا تھا ...میں تو اس رکتے ہوئے نوجوان کو دیکھ رہا تھا...وہ سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر کے ان چھلکوں کے پاس بیٹھ گیا ... دوسرے ہی لمحے وہ چھلکوں پر لگا ہوا گودا کھانے لگا ... میں دھک سے رہ گیا ... آخر وہ ایک انسان تھا ... جانور نہیں تھا ...

ایسے میں ایک گائے ادھر سے گزری ... گائے کی نظر چھلکوں پر پڑی تو وہ بھی آگے بڑھنا بھول گئی اور چھلکوں کے قریب آگئی ... اب گائے کی کوشش تھی ... چھلکوں کو کھانا شروع کرے ، لیکن وہ نوجوان ایک ہاتھ سے چھلکے کھانے میں زورشور سے مصروف تھا تو دوسرے ہاتھ سے گائے کو پیچھے ہٹا رہا تھا ... اور میں نے دیکھا ... اس نے گائے کو کوئی چھلکا اٹھانے نہ دیا ... وہ چاہتا تھا... تمام چھلکوں کی سرخی پہلے خود کھائے اور باقی چھلکے گائے کے لیے چھوڑ ے اور اس نے ایسا ہی کیا ... تمام چھلکوں کی سرخی کھاکر ہی وہ اٹھا ... اب گائے کے لیے راستہ صاف تھا ...ادھر وہ اٹھا، ادھر اس کی گود سے وہ پیکٹ نیچے گرا ... وہ یہ بھول گیا تھا کہ پیکٹ کو اس نے گود میں دبا رکھا ہے ... اب میری نظر پیکٹ پر پڑی... تو میں دھک سے رہ گیا ... میری سٹی گم ہوگئی ... ادھر اس نے پیکٹ اٹھا کر سائیکل کا ہینڈل تھاما اور اس پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا ... حالانکہ میں تو اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ بھائی ... تمھارے پاس تو چرغے کا پیکٹ ہے ... پھرتم یہ تربوز کے چھلکے کیوں کھا رہے ہو ... میں اس سے تو نہ پوچھ سکا ... کیونکہ وہ تو جا بھی چکا تھا ... البتہ میں نے اندازہ لگا یا کہ یہ نوجوان ضرور کسی مال دار گھرانے کا ملازم ہے ... انہوں نے اس سے یہ چرغہ منگوایا تھا لیکن شاید وہ اسے پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں دیتے ... وہ خود تو چرغے کھاتے ہیں لیکن ملازم کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں دیتے ... یہ میری سوچ تھی ... اندازہ تھا ... اور لکھنے والے سوچوں ہی کے تو مالک ہوتے ہیں ... یہ واقعہ بھی میں آج تک نہیں بھول سکا ... شاید اس لیے کہ ایک لکھنے والا بہت حسّاس ہوتا ہے ...

دوسروں سے سیکڑوں گنا حسّاس ...

☆☆☆

اب پبلشنگ کا دور کھل کر شروع ہوا ... کوئی روکنے والا نہیں تھا ...

کوئی ٹوکنے والا نہیں تھا، زکوٰۃ پوری پوری ادا کرنے لگا ... طلبا کو وظیفے بھیجنے لگا ... ان حالات میں نقش صاحب سے علیحدہ ہوئے ایک سال گزر گیا۔

ایک بات عمارت کے مالک کی طرف سے ہوئی ... اس نے وہ حصہ جو میں نے کرائے پر لیا ہوا تھا، نیچے ایک دکان دار کو فروخت کر دیا ... اس وقت علیحدگی کو تقریباً ڈیڑھ سال گزر چکا تھا ... عمارت کے نئے مالک منور صاحب نے آ کر مجھ سے کہا:

''یہ حصہ ہم نے اپنی ضروریات کے لئے خرید لیا ہے۔']

''بہت بہتر! جس دن آپ فرمائیں گے ... خالی کردوں گا۔''

میرا جواب سن کر منور صاحب حیران رہ گئے ... بولے:

''کمال ہے ... میرا تو خیال تھا آپ اڑ جائیں گے اور بہت مشکل سے خالی کریں گے ... آپ نے تو بہت ہی شرافت سے جواب دیا ہے ... اب میں آپ سے نہیں کہوں گا ... جب آپ آسانی سے خالی کردیں ...کر دیجیئے گا۔''

''تب پھر میں کوئی جگہ دیکھ لیتا ہوں ... جونہی ملی ... خالی کردوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ!'' انہوں نے کہا اور خوشی خوشی واپس چلے گئے۔

میں نے نئی جگہ کی تلاش شروع کر دی۔ اس بار ارادہ تھا کہ اپنی جگہ خریدی جائے۔

انہی دنوں میں ایک روز دفتر میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ ایک نوجوان دروازے پر نمودار ہوا ... لمبا قد ... چہرے پر مسکراہٹ ... آنکھوں میں شرم۔

''آپ اشتیاق احمد ہیں؟''

''جی ہاں ...تشریف لائیے ...''

وہ اندر آیا ... ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھ گیا ... اس کے ہاتھ میں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی ... وہ اس نے میز پر رکھ دی اور بولا:

''یہ میں آپ کے لئے لایا ہوں۔''

''اس میں کیا ہے ؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ایک عدد پین ...'' وہ مسکرایا۔

''اوہ !!'' میرے منہ سے نکلا۔

پین میری بہت بڑی کمزوری ہیں ... پین خریدنے کا حد درجے شوقین ہوں ... جوں ہی کائی نیا پین آیا ... خرید لیا ... کوئی تحفے میں دے تو بھی خوش ہو کر لے لیتا ہوں ... لہٰذا پیکٹ کھولا ... اس میں کوریا کا بنا ہوا ایک خوبصورت پین نکلا۔

''بہت بہت شکریہ ... آپ کا نام کیا ہے ؟''

''میرا نام طاہر ہے۔''

''کہاں رہتے ہیں ؟''

''جی ... میں لیبیا سے آیا ہوں ... ویسے گھر یہیں سانڈے میں ہے۔''

میں نے طاہر کو چائے پلوائی اور پھر وہ چلا گیا ... اس روز اس کے بارے میں کوئی خاص رائے قائم نہیں کر پایا ... بس یہی خیال تھا کہ ایک قاری قلم کا تحفہ دینے آیا تھا ... سو وہ دے کر چلا گیا ... لیکن چند دن نہیں گزرے تھے کہ طاہر پھر آیا ... اس وقت تک میں اس کا نام بھول چکا تھا ... آج وہ دروازے پر نہیں رکا ... سیدھا اندر آیا اور السلام علیکم کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا ... ساتھ ہی ایک پیکٹ میز کے کنارے پر رکھ دیا۔

''یہ کیا بھئی ؟'' میں چونکا۔

''جی ... ایک اور پین ...''

''لیکن آپ تو اس روز مجھے پین دے چکے ہیں۔''

''ایک اور سہی ...'' وہ مسکرایا۔

''یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے بھئی ...''

''کوئی بات نہیں سر ... میری خاطر رکھ لیں ... مجھے خوشی ہوگی۔''

''میں آپ کا نام بھول گیا ... ویسے یہ بات یاد ہے کہ آپ لیبیا سے

آئے ہیں اور سانڈے میں رہتے یں۔"

" جی ... میرا نام طاہر ہے۔"

میں نے پیکٹ کھولا ... آج بھی پیکٹ میں سے کوریا کا قلم برآمد ہوا ... اور یہ بھی نہایت خوب صورت تھا۔

" آپ کے والد لیبیا میں ملازمت کرتے ہیں ؟" میں نے پوچھا۔

" جی ہاں ! پہلے کرتے تھے لیکن اب واپس پاکستان آ گئے ہیں۔"

" اوہو اچھا !!"

" میں لیبیا میں اپنے عزیزوں کے ذریعے آپ کی کتابیں منگوا کر پڑھتا رہا ہوں ... جنون کی حد تک شوق ہے۔"

" ہوں ... خوشین ہوئی یہ جان کر ..."

چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد طاہر چلا گیا ... ایک ہفتے بعد پھر آیا ... آج بھی اس نے ایک پیکٹ میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔

" کیا اس میں بھی کوریا کا پین ہے ؟"

" آپ نے شاید کوریا کے پین کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔"

" جی نہیں ... بس ... لیبیا سے آتے ہوئے کئی پین خرید لیے تھے۔"

" لیکن اب آپ آئین گے تو پین ہرگز نہیں لائیں گے ... یہ ضروری نہیں کہ جب بھی آپ آئیں پین لے کر آئیں۔

" جی ... جی اچھا۔"

" اور ہاں ... اب آپ ہر ماہ کتب یہاں سے لے لیا کریں ... بازار سے نہ خریدا کریں۔" میں نے کہا۔

" یہ ... یہ تو ٹھیک نہیں ..."

" تو ... پھر یہ کوریا کے پین بھی ٹھیک نہیں ..."

" اچھا سر ... ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی ..." اس نے سر جھکا دیا۔

اس طرح طاہر کا آنا جانا شروع ہوا ...آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ طاہر ایس ملک کا ذکر ہو رہا تھا۔

انہی دنوں ایک اور صاحب ایک دن تشریف لائے ... بلکہ ایک نہیں دو صاحبان ... دوسرے تو خیر ان کے ساتھ آئے تھے ... انہوں نے اپنا نام سعید مختار بتایا ... اور میز پر ایک پیکٹ رکھ دیا۔

'' یہ کیا جناب ...؟ ''

'' آپ کے لیے شہد لایا ہوں ... امید ہے قبول فرمائیں گے۔''

'' شکریہ ... زحمت کی آپ نے۔''

ان سے معلوم ہوا ... ایم بی بی ایس کر رہے ہیں ... ساتھ میں ان کے دوست شہزاد تھے ... دونوں ناول پڑھنے کے جنون کی حد تک شوقین تھے ... سعید مختار صاحب نے تو ناولوں پر کچھ اس مہارت سے تبصرے کیے کہ میں حیران رہ گیا ... انہوں نے اوپر تلے اتنے سوالات کیے کہ میں چکرا گیا ... کافی دیر تک ان سے گفتگو ہوتی رہی ... اس طرح ان سے اکثر ملاقات ہونے لگی ... طاہر ایس ملک بھی اکثر آنے لگا۔

ان دنعوں میرے ادارے میں کتابت کا کام مہر عبدالستار صاحب کیا کرتے تھے ... ان کے ساتھ اشفاق احمد کتابت کر رہے تھے ... انہی دنوں لاہور سے اخبار جنگ شروع ہوگیا ... اخبار جنگ والوں کو بہت سے کاتبوں کی ضرورت تھی ... اشفاق احمد صاحب نے جنگ میں ملازمت اختیار کرلی اور ہمارا کام چھوڑ دیا ... ایک کاتب ایک ماہ میں چار ناول نہیں لکھ سکتا تھا ... اس لیے اشفاق احمد کی جگہ دوسرے کاتب کی تلاش ہوئی ... یہ ذمے داری مہر عبدالستار نے اٹھائی ... چند دن بعد وہ ایک خوبرو نوجوان کو ساتھ لیے دفتر میں داخل ہوئے اور بولے:

'' یہ سعید نامدار ہیں ... بہت اچھے کاتب ہیں ...آپ اشفاق احمد کی جگہ انہیں رکھ لیں۔''

میں نے ان کی کتابت کے نمونے دیکھے اور پھر انہیں کتابت کا کام دے دیا۔ اس طرح سعید نامدار صاحب نے کتابت کا کام شروع کیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ سعید نامدار ادارے کے چیف کاتب بن گئے تھے اور مہرعبدالستار کام چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ سعید نامدار ساندے میں کرائے کی جگہ لے کر رہ رہے تھے۔

جگہ تبدیل کرنے کے حوالے سے مجھے سب دوستوں نے بھی ایک ہی مشورہ دیا کہ کرائے کی جگہ کی بجائے اپنی جگہ خرید لی جائے تاکہ اس روز روز کی الجھن سے نجات ملے۔ یہ مشورہ مجھے بھی اچھا لگا ... میں نے ان سب سے کہہ دیا کہ کوئی مناسب سی جگہ دیکھنا شروع کریں۔ اس طرح ہم نے اِدھر ادھر برائے فروخت جگہیں دیکھنا شروع کیں ... اردہ بازار میں کوئی جگہ خریدنا بس سے باہر تھا ... اتنی رقم پاس نہیں تھی ... علیحدگی کے بعد ادارہ ابھی پاؤں پر کھڑا ہی ہوا تھا۔

ایک روز سعید نامدار اپنے ایک دوست قاری نذیراحمد سعیدی کو ساتھ لے کر آئے اور تعارف کے بعد بتایا کہ ساندے میں ایک مکان برائے فروخت ہے ... ان کے کسی دوست کا ہے ... اگر چل کر دیکھ لیں تو مناسب رہے گا۔

میں نے ان کے ساتھ جا کر مکان دیکھا ... پسند آ گیا ... سودا کیا ... اور مکان خرید لیا۔ اس طرح دفتر ساندے منتقل ہوگیا۔

اب چاروں ناول سعید نامدار کتابت کر رہے تھے ... ناولوں کے سرِ ورق جاوید چغتائی بنا رہے تھے۔ دفتر چونکہ ساندے میں بنایا گیا تھا اور طاہر ایس ملک بھی ساندے میں ہی رہتا تھا ... لہٰذا طاہر کا روز کا آنا جانا ہوگیا ... یہ آنا جانا اس قدر بڑھا کہ وہ دفتر کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کرنے لگا ... میں نے طاہر کو ملازمت کی پیشکش بھی کی، انہوں نے دوستی کی خاطر مفت خدمات پیش کر دیں ... ملازمت سے انکار کر دیا ... اس سے طاہر کا عمل دخل اور بڑھ گیا۔

ایک دن طاہر ایس ملک نے بچّوں کا ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا مشورہ

دیا ... میرے بہت سے قارئین بھی اس سلسلے میں اکثر خط لکھتے رہتے تھے ... طاہر نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کردیں ... پرچے کا نام چاند ستارے تجویز ہوا ... اس سلسلے میں سعید نامدار صاحب سے بھی مشورہ ہوا ... آخر چاند ستارے کے نام کے ڈیکلریشن کا مرحلہ بھی طاہر کی بھاگ دوڑ اور محنت کے سبب طے ہوگیا ... اس طرح پرچہ شروع ہوا۔

چاند ستارے ناولوں کے ساتھ تقریباً تین سال تک چلتا رہا ... یہ اشتہارات کے بغیر شائع ہوتا تھا ... اس لئے نقصان میں جا رہا تھا ... آکر میں نے محسوس کیا کہ یہ پرچہ شروع کر کے میں نے غلطی کی ہے ... اس طرح ناولوں کا کام بھی متاثر ہورہا تھا ... پرچے اشتہارات کے بغیر نہیں چل سکتے ... جب نقصان حد سے زیادہ بڑھ گیا تو اس کو بند کرنے کا فیصلہ کرنا ہوا ... یہ فیصلہ طاہر ایس ملک کو بہت ناگوار گزرا ... اس نے کہا:

"سر ... اگر آپ اس کو شائع نہیں کرنا چاہتے تو مجھے اجازت دیں ... میں سب کام اپنے طور پر کروں گا۔"

"تم بھی شوق پورا کرلو، لیکن نقصان اٹھاؤ گے۔" میں نے جواب دیا۔

"دیکھا جائے گا سر ..."

"اس طرح طاہر نے ایک الگ دفتر کرائے پر لیا ... سات ماہ تک اپنے طور پر چاند ستارے نکالتا رہا ... لیکن پھر 36 ہزار روپے کا نقصان اٹھا کر آخر میدان چھوڑ دیا۔

☆☆☆

ایک دن سوچا ... ادارے کو ٹیکس کیلئے رجسٹر کروا لینا چاہیے ... کہیں یہ لوگ پھر تنگ نہ کریں ... ایک دوست سے مشورہ کیا ... انہوں نے انکم ٹیکس کے ایک وکیل کا نام پتا بتایا اور یہ بھی کہا وہ ان کے جاننے والے ہیں ...

میں ان کے حوالے سے ملا ... انھیں بتایا کہ میں یہ کاروبار کرتا ہوں اور چاہتا ہوں ... ہر سال اپنے ادارے کا ٹیکس ادا کرتا رہوں ... وکیل صاحب میری بات سن کر مسکرائے ... ادھیڑ عمر کے سنجیدہ صورت آدمی تھے ... کہنے لگے ...

''بہت اچھی بات ہے ... اپنا کھاتہ وغیرہ مجھے دے دیں ... میں گوشوارہ تیار کر وں گا ... 30 ستمبر سے پہلے گوشوارہ بھیجنا ہوتا ہے ... ''

''جی اچھا۔''

میں نے انھیں کھاتہ وغیرہ دے دیا ... گوشوارہ جانے کے دن آئے تو انہوں نے مجھے بلایا ... کہنے لگے :

''آپ کے ادارے کا ساڑھے تین ہزار روپے ٹیکس بنا ہے۔''

''کوئی بات نہیں آپ چالان فارم بنا دیں ... میں جمع کرا دیتا ہوں۔''

''تین ہزار میری فیس کے بھی دینے ہوں گے۔'' انہوں نے کہا۔

''اچھی بات ہے ... وہ بھی دے دیتا ہوں ۔''

''اور ساڑھے تین ہزار انکم ٹیکس دفتر والوں کو دینا ہوں گے ۔''

''جی ... یہ کس چیز کے۔''

''گوشوارہ منظور کرانے کے۔''

میں نے یہ سن کر حیرت ظاہر کی : ''لیکن جناب! میں تو خود ٹیکس لگوا رہا ہوں ... ادارے کو صرف ایک سال ہوا ہے... آپ نے خود حساب کتاب دیکھ کر ٹیکس کی رقم بتائی ہے ... تو میں دفتر والوں کو کیوں دوں ... ''

''آپ کی مرضی ... چالان فارم جمع کرادیں اور رسید مجھے لادیں ۔''

میں نے ایسا ہی کیا اور اپنے کاروبار میں لگ گیا ... اب کتابیں دھڑ ادھڑ بک رہی تھیں ... پہلی دو کتابیں دو دو ہزار شائع کی تھیں ... دوسرے ماہ تین تین ہزار شائع کرنی پڑی تھیں ... چوتھے ماہ تعداد چار چار ہزار تک پہنچ چکی تھی ... اور میں حیران ہوجاتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ...

اب کاتب بھی میرے دفتر میں ہی بیٹھ کر کتابت کرتے تھے... ان کا نام اشفاق احمد تھا ... پھر دو ناولوں کی بجائے تین ناول شائع کرنے لگے، ایک ناول کامران مرزا کا اور دو ناول انسپکٹر جمشید کے ...

اب میں زیادہ تر جھنگ میں رہنے لگا۔ لاہور ہفتے میں دو دن رہتا تھا۔ کاروباری حساب کتاب چیک کرتا اور چلا جاتا ... انھی دنوں والد صاحب نے کہا ۔

''بیٹے ... بازار لوہاراں والا میں ایک دکان بک رہی ہے ... خرید لو ... کبھی کام آجائے گی۔''

میں نے ان کی بات مان لی ... دکان خرید لی ... اس طرح وہ دکان ساٹھ ہزار میں خرید لی گئی تھی ... وہ آج بھی ہمارے پاس ہے ... میرے دو بیٹے نوید احمد اور توحید احمد ہومیو ڈاکٹر ہیں اور مل کر کلینک اور اسٹور چلا رہے ہیں ...

چھٹی کے دن بچوں کو میں بدستور نئے شہر لے جاتا ، وہ پارک میں خوب جھولتے اور پھسلتے ... باقی دنوں میں جب میں نئے شہر جاتا تو وہ اسکول کا ٹائم ہوتا تھا ... اسکول جانے والے سڑک پر بسوں اور ویگنوں کے انتظار میں کھڑے ہوتے تھے ... میں ان میں سے تین چار بچوں کو بٹھا لیتا اور جب ان کا اسکول آجاتا تو انھیں اتار دیتا ...

اس سلسلے کی ایک بات بتاتا ہوں ... بہت مدت گزرنے پر ایک روز ایک نوجوان سرِ راہ مجھ سے ملا ... میں اس وقت پیدل تھا... وہ کہنے لگا : ''سر! آپ مجھے پہچانتے ہیں ۔''

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا...

''نہیں ... میں آپ کو پہچان نہیں سکا ۔''

'' سر! ہم چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے ... آپ اپنی کار میں نئے شہر کی طرف جاتے تھے ... تو ہمیں اپنی کار میں بٹھا لیتے تھے ...''

اس کی بات سن کر مجھے حد درجے خوشی ہوئی ... اس بچے نے اپنے بچپن

کی بات یاد رکھی تھی ... میں نے اس سے مصافحہ کیا، اس کے گال تھپتھپائے اور آگے بڑھ گیا ...

انکم ٹیکس کا گوشوارہ جمع کرائے آٹھ دس ماہ گزر چکے تھے کہ مجھے محکمے کی طرف سے انکم ٹیکس کا نوٹس ملا ... نوٹس میں لکھا تھا ... آپ کے خلاف یک طرفہ کارروائی کرتے ہوئے آپ کوایک لاکھ اکتالیس ہزار روپے ٹیکس لگا یا گیا ہے ... یہ فلاں تاریخ تک جمع کرا دیں۔

میں حیرت زدہ رہ گیا ... میں فوراً اپنے وکیل کے پاس گیا ... نوٹس میں لکھا تھا کہ آپ کو بار بار نوٹس بھیج کر دفتر بلایا گیا ... لیکن آپ ایک بار بھی حاضر نہیں ہوئے، اس لیے یک طرفہ کارروائی کی گئی ہے ...

اس بات پر میں بہت حیران تھا ، کیونکہ مجھے تو ایک نوٹس بھی موصول نہیں ہوا تھا... وکیل سے ملاقات ہوئی ... میں نے نوٹس اس کے سامنے رکھ دیا ...

''وکیل صاحب ؟ یہ کیا ہے۔''

اس نے نوٹس پڑھا ... پھر کہنے لگا : ''میں نے تو آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ساڑھے تین ہزار ان لوگوں کو گوشوارہ منظور کرانے کے دینے پڑیں گے ... ورنہ یہ لوگ گوشوارہ منظور نہیں کریں گے ... آپ نے میری بات نہیں مانی اور دیکھ لیں ... وہی ہوا۔''

''اب ... اب کیا ہو گا۔''

''آپ نوٹس میرے پاس چھوڑ جائیں ... میں ان سے بات کرتا ہوں۔''

اب انکم ٹیکس کے جھمیلوں سے واسطہ پڑ ... سیدھی سی بات یہ تھی کہ رشوت کے بغیر کام نہیں ہوتے ... میں بہت دل برداشتہ ہوا ... میں نے اس وکیل کو چھوڑ دیا ... دوسرا کیا ... دوسرے کے بعد تیسر اوکیل ... اس دوران پیشیاں بھگتتا رہا ... پھر انکم ٹیکس کی قسطیں ... اور آخر کار چالیس ہزار کے لگ بھگ ٹیکس جمع کرانا پڑا ... اور اس جمع کرانے کے چکر میں بھی تیس ہزار خرچ کرنے

پڑے... گویا میں نے ساڑھے تین ہزار روپے رشوت نہیں دی ... لیکن ساٹھ ستر ہزار دے ڈالے... اسے کہتے ہیں عقل مندی ...

☆☆☆

اس طرح ایک سال اور گزر گیا ... انھی دنوں یعنی 1984ء میں ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا ...

ایک روز میں جھنگ میں تھا ...ایک صاحب میرے پاس آئے ... اور کہنے لگے:

'' آپ کا لاہور سے فون آیا ہے ... آصف کتاب گھر والے آپ کو بلا رہے ہیں ۔''

آصف کتاب گھر جھنگ میں اسکول کالج کی کتابوں کی مشہور دکان تھی ... میرے ناول بھی جھنگ میں وہ منگاتے تھے ... اس لیے ان سے علیک سلیک تھی ... اور یہ زمانہ وہ تھا ... جب ٹیلیفون بہت کم گھروں میں تھے ... فون کرنے کے لیے ڈاکخانوں میں جانا پڑتا تھا ... میں فوراً آصف کتاب گھر پہنچا۔

آصف کتاب گھر کے مالک اقبال صاحب تھے ... ان سے علیک سلیک ہوئی... تب انہوں نے بتایا ...

'' روزنامہ جنگ والوں کا فون تھا ... ضیاء شاہد بات کر رہے تھے ... وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں ...میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ کو بلوا لیتے ہیں ... آپ آدھ گھنٹے بعد فون کرلیں... اب ان کا فون پھر آئے گا ... لہٰذا آپ بیٹھ جائیں۔''

''جی اچھا ... شکریہ ۔'' میں نے کہا اور بیٹھ گیا ۔

مجھے یاد آگیا۔ بے روز گاری کے دنوں میں ضیاء شاہد صاحب کے ہاں پروف ریڈر کے طور پر کام کرتا رہا ہوں ... ان دنوں وہ ہفتہ روز صحافت نکالتے

تھے ... وہ ایک سیاسی پرچہ تھا... پھر بھی میں نے اقبال صاحب سے پوچھ لیا:
'' یہ ضیاء شاہد وہی نہیں ... جو صحافت نکالتے رہے ہیں ۔''
'' بالکل وہی ... دراصل ضیاء الحق کے مارشل کے بعد سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگ گئی تھی اور سیاسی رسالوں کی مانگ تقریباً ختم ہو گئی تھی ... اس لیے انہوں نے صحافت بند کر دیا ... ادھر روزنامہ جنگ والوں نے انھیں ملازمت کی پیشکش کر دی ... اب یہ وہاں ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہیں ۔''
'' اچھا ...لیکن مجھ سے انھیں کیا کام آپڑا ۔'' میں نے حیران ہوکر کہا۔
'' یہ تو وہی بتائیں گے۔''
''ہوں !'' میں نے کہا اور سوچ میں گم ہو گیا۔''
آخر فون کی گھنٹی بجی ... پہلے اقبال صاحب نے ریسیور اٹھایا اور پھر میری طرف بڑھا دیا... ''ضیاء شاہد صاحب ۔''
'' جی شکریہ ۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور لے لیا ، کان سے لگاتے ہوئے میں نے کہا ۔
'' السلام علیکم جناب !''
''اشتیاق بھائی کہاں ہیں، آپ میں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں آپ کو ۔''
'' جی میں جھنگ میں ہوں ... پانچ دن جھنگ میں رہتا ہوں اور دو دن لاہور میں ۔''
'' اچھا خیر ... آپ سے ضروری کام ہے ... جنگ کی انتظامیہ آپ کے ساتھ ایک شام منانا چاہتی ہے ... اتوار کا پروگرام ہے ... کیونکہ اتوار کو بچوں کی اسکولوں سے چھٹی ہوتی ہے ... اتوار کے روز اخبار میں اشتہار لگا دیا جائے گا اس طرح جو بچے آپ کے ساتھ شام گزارنا چاہیں گے ... آجائیں گے، امید ہے دلچسپ پروگرام رہے گا ۔''
یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی ... میں نے ان سے بس اتنا کہا ۔

''جی اچھا ... میں پہنچ جاؤں گا۔''

''پروگرام 3 بجے شام شروع ہو جائے گا ... لہٰذا آپ ٹھیک وقت پر پہنچ جایئے گا۔''

''جی اچھا ! کیا میں اس موقعے پر اپنی طرف سے بچوں کو کوئی تحفہ دے سکتا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔

''بھلا آپ کتنے بچوں کو تحفہ دے سکیں گے ... بچے تو بڑی تعداد میں آسکتے ہیں۔''

''میں ناولوں کے بنڈل اٹھا لاؤں گا ... فی بچہ ایک ناول دوں گا۔''

''یہ تو اور اچھا پروگرام رہے گا ... لیکن ہم یہ اعلان نہیں کریں گے ... ورنہ ہوسکتا ہے ... تعداد ہم سے سنبھل نہ پائے ...''

''جیسے آپ کی مرضی ... میں حاضر ہوجاؤں گا۔''

ہفتے کے روز ہی میں اپنی گاڑی پر لاہور پہنچ گیا ... گاڑی کی ڈکی میں اور پچھلی سیٹ پر کتابوں کے جتنے بنڈل آسکے ... میں نے رکھوا لیے ... دوسرے دن صبح سویرے اخبار جنگ منگوا کر دیکھا ... اس کے رنگین صفحے پر پورے نصف صفحے کا اشتہار اس عنوان سے لگایا گیا تھا ...

بچوں کے مشہور مصنف اشتیاق احمد کے ساتھ ایک شام اشتہار دیکھ کر حیرت انگیز خوشی ہوئی ... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن جنگ والے میرے ساتھ شام منانے کا اتنا بڑا اشتہار لگا سکتے ہیں ...

اخبار میں جو وقت دیا گیا تھا ... میں اس وقت سے آدھ گھنٹا پہلے پہنچ گیا ... ضیاء شاہد صاحب کے بارے میں پوچھا ... تو مجھے ان کے دفتر لے جایا گیا ... ضیاء شاہد کمرے میں موجود نہیں تھے ... چپراسی نے مجھے اندر بیٹھنے کے لیے کہا ... خود انھیں بتانے چلا گیا ... جلد ہی ضیاء شاہد کمرے میں داخل ہوئے ... صحافت کے زمانے میں ان کے دفتر میں ملازمت کر چکا تھا ... وہاں روزآنہ ملاقات ہوتی

رہتی تھی ... اس وقت کے بعد آج ملاقات ہوئی تھی ... السلام علیکم کے بعد انہوں نے کہا۔

''کیا حال ہے بھائی۔''

''جی اللہ کا شکر ہے ... ٹھیک ہوں۔''

''اچھا آپ یہاں میرے کمرے میں بیٹھیں ... ہال میں بچوں کا بہت ہجوم ہے ... ہم لوگ انھیں بٹھا رہے ہیں ... کرسیاں کم پڑ گئیں ہیں ... مزید لگوا رہے ہیں ... اس کام میں دیر لگ جائے گی... اس لیے آپ اطمینان سے یہاں بیٹھے رہیں ...''

''جی اچھا!'' میں نے سر ہلا دیا۔

ضیاء شاہد صاحب تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئے اور آتے ہی بولے۔

''معاف کیجیے گا اشتیاق صاحب ... ہجوم کو کنٹرول کرنے اور انھیں بٹھانے میں اتنا وقت لگ گیا ... اب آپ میرے ساتھ آیئے ... اور دیکھیے کہ کتنے لوگ آپ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔''

انہوں نے میرا بازو تھام لیا اور مجھے لے کر چلنے لگے ... یہاں تک کہ ہم اس ہال کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے جس میں بچوں کو بٹھایا گیا تھا ...اس ہال میں جنگ فورم کے پروگرام ہوتے تھے ...

میں السلام علیکم کہتا ہوا درمیانی راستے سے گزرتا ہوا آخر اسٹیج پر پہنچ گیا ... اسٹیج پر ایک طرف تین لڑکے بیٹھے تھے اور دوسری طرف تین لڑکیاں ... درمیان میں دو کرسیاں خالی تھیں، ان میں سے ایک پر مجھے بٹھایا گیا اور دوسری پر ضیاء شاہد خود بیٹھے ... اب مائیک منہ کے قریب کرتے ہوئے ضیاء شاہد صاحب نے افتتاحی کلمات ادا کیے ...

بعد میں معلوم ہوا میرے دائیں بائیں جو چھ بچے بیٹھے تھے ... ان میں ضیاء شاہد اور اخبار میں دوسرے لکھنے والوں کے بچے تھے ... انہیں سوالات وغیرہ

کے لیے تیار کیا گیا تھا ... افتتاحی کلمات کے بعد ضیاء شاہد نے اعلان کیا ...

''اب بچے اپنے محبوب مصنف سے سوالات شروع کر سکتے ہیں، لیکن پہلے اسٹیج والے بچے سوالات شروع کریں گے ۔''

اس سے پہلے کہ اسٹیج والے بچے سوالات شروع کر سکتے ... مجمعے میں سے ایک بچہ کھڑا ہوا اور اس نے کہا ۔

'' میرا اشتیاق احمد سے سوال ہے ... یہ اپنے ناولوں میں وقت کی پابندی پر بہت زور دیتے ہیں ... ان کے کردار وقت کے بہت پابند ہیں ... لیکن یہ خود اس پروگرام میں آدھ گھنٹا لیٹ ہیں ... پہلے یہ میرے اس سوال کا جواب دیں ۔''

ضیاشاہد نے مسکراتے ہوئے مائیک میرے سامنے کر دیا ...میں نے کہا ۔

'' اس سوال کا جواب ضیاء شاہد دیں گے ۔''

اب انہوں نے کہا ۔

'' اشتیاق احمد وقت سے آدھ گھنٹا پہلے پہنچ گئے تھے... ہمیں آپ لوگوں کو بٹھانے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔''

اس پر سب بچوں نے تالیاں بجائیں ... پھر سوالات کا سلسلہ شروع ہوا... تابڑ توڑ سوالات کیے گئے ... سوال کرنے والے سینکڑوں تھے ... اور میں اکیلا جواب دینے والا... پھر بھی الحمد للہ! میں پرجوش انداز میں جوابات دیتا رہا... وہ تمام سوالات جنگ میں شائع کیے گئے ... بچوں کی تصاویر بھی شائع ہوئیں ... اخبار آج بھی میرے پاس محفوظ ہے ...وہ سوالات یہاں دیے جا رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

س: آپ ایک ماہ میں چار ناول لکھتے ہیں ، یہ آپ کا شوق ہے یا ضرورت۔

ج: اب یہ ضرورت بن گئی ہے ، لیکن میری نہیں آپ کی، کیونکہ بچے اب بھی یہی کہتے ہیں کہ مہینے میں چار ناولوں سے کچھ نہیں بنتا۔ ہمیں ہرروز نیا

ناول چاہیے تو میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ میں مہینے میں تیس ناول تو لکھنے سے رہا، لہٰذا آپ لوگ چار ناولوں پر ہی گزارا کیجیے۔

س: آپ کو ناول لکھتے ہوئے دس برس گزر چکے ہیں اب بھی انسپکٹر جمشید اور ان کے بچے ویسے کے ویسے ہی ہیں نہ بچے جوان ہوئے اور نہ انسپکٹر کی ترقی ہوئی ذرا اس کی وضاحت کر دیجیے۔

ج: یہ حقیقت ہے کہ وقت کسی کے لیے بھی نہیں تھم سکتا۔ میرے کردار اس کے سامنے کچھ نہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ناول چند گھنٹوں میں یا زیادہ سے زیادہ ایک رات میں مکمل ہوتا ہے تو کس طرح آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی عمر دس بارہ سال کیوں نہیں بڑھی۔

س: اگر انسپکٹر جمشید کے تعلقات اتنے وسیع ہیں کہ وزیر خارجہ انسپکٹر جمشید کے دفتر آجاتے ہیں یا انسپکٹر کو ٹیلیفون پر اپنے گھر بلا لیتے ہیں تو کیا ابھی تک وہ انسپکٹر ہی ہیں۔

ج: وہ اپنی مرضی سے ترقی نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ کام کرنا چاہتے ہیں۔

س: کیا آپ اپنے یا کسی دوسرے ملک کے ادب سے متاثر ہوکر ناول لکھتے ہیں۔

ج: متاثر ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہر آدمی کسی نہ کسی سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ میں نے کس سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا ہے میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں۔

س: آپ کے ناول کا ہیرو 40 فٹ لمبے جزیرے کو چھلانگ لگا کر پار کر لیتا ہے، جب کہ یہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔

ج: کیا آپ نے کبھی انگریزی فلمیں نہیں دیکھیں۔

س: یعنی آپ انگریزی فلموں سے متاثر ہوکر لکھتے ہیں۔

ج: جی نہیں!

س: ہزار سال کے آدمی کو خون دے کر کیسے زندہ کر دیا گیا۔

ج: سکتے کا عالم دکھایا گیا ہے۔

س: لیکن اسے تو دفن کر دیا گیا تھا۔

ج: سکتے کے عالم میں دفن کرا یا گیا تھا، یہ میڈیکل سائنس ہے جس میں ایک شخص کو کافی عرصے کے لیے سلا دیا گیا تا کہ بعد میں جب کینسر کا علاج دریافت ہو سکے اس وقت اس کا علاج کیا جائے گا۔

س: آپ کی شخصیت کی جھلک کس کتاب میں ہے۔

ج: شوکی سیریز۔

س: کیا آپ کے ناولوں کے مجرم خیالی ہوتے ہیں اور ان کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ج: ہمارے معاشرے میں اس قسم کے مجرم نہیں ملتے، اس لیے آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خیالی مجرم ہیں، لیکن یورپین معاشرے میں اس قسم کے مجرم ہوتے ہیں۔

س: انسپکٹر جمشید اتنے پھرتیلے نہیں جتنے انسپکٹر کامران مرزا ہیں۔

ج: ایسی بات نہیں، میرا خیال ہے دونوں پھرتیلے ہیں۔

س: آپ کی کہانیوں میں انسپکٹر جمشید کا کردار زیادہ کیوں ہوتا ہے۔

ج: اس لیے کہ کہانی کا اصلی پردہ انہی کو اٹھانا ہوتا ہے۔

س: آپ نے اپنا پہلا ناول کس پر لکھا۔

ج: پہلا ناول محمود، فاروق اور فرزانہ پر لکھا اور اس کا نام پیکٹ کا راز تھا۔

س: آپ نے اب تک کتنے ناول لکھے ہیں اور آپ کب تک لکھتے رہیں گے۔

ج: میں نے اب تک 350 کتابیں لکھی ہیں اور یہ میں نہیں جانتا کہ کب تک لکھتا رہوں گا، کیونکہ مستقبل کا کسی کو کوئی پتا نہیں ہوتا۔

س: شروع میں آپ نے جاسوسی ناول لکھے۔ آج سے پانچ سال قبل آپ نے اسلامی کتابیں لکھنا شروع کیں جس کا سلسلہ بعد میں بند کر دیا گیا حالانکہ اس میں آپ نے جو واقعاتی رنگ دیا وہ بچوں کے لیے بہت بہتر تھا۔

ج: میں نے تاریخ اسلام پر لکھنے کا ایک تجربہ شروع کیا تھا جس میں صحابہ کرامؓ کی باتیں شامل تھیں ، یہ کتابیں اس دعویٰ کے ساتھ شروع کی گئی تھیں کہ یہ کتابیں جاسوسی کتابوں سے زیادہ دلچسپ اور مقبول ہوں گی، لیکن پذیرائی بہت کم ہوئی اور بہت کم لوگوں نے اس طرف توجہ دی، لہٰذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جاسوسی ادب ہی میں اسلام کو شامل کر دیا جائے ۔

س: آپ جاسوسی موضوعات سے ہٹ کر تاریخی موضوع پر کیوں نہیں لکھتے۔

ج: ابھی میں نے کہا کہ جب اسلام کے موضوع پر بچوں کے لیے کتابیں لکھی جاتی ہیں تو بچے انہیں نہیں پڑھتے لہٰذا میں نے یہی محسوس کیا کہ جاسوسی ادب میں ہی اسلام اور تاریخ کو شامل کیا جائے۔

س: آپ دن میں کتنی مرتبہ کھانا کھاتے ہیں (قہقہے)

ج: اس سوال کا ناول نگاری سے کیا تعلق ہے۔

س: اس کا تعلق آپ سے تو ہے۔

س: آپ میرے سوال کا جواب دیجیے کہ آپ دن میں کتنی مرتبہ کھانا کھاتے ہیں ۔

ج: دو مرتبہ۔

س: شاہد آپ بہت کم کھاتے ہیں۔

ج: لیکن شاید سوال پوچھنے والی بیٹی لگتا ہے دن میں چار مرتبہ کھانا کھاتی ہیں (قہقہے)

س: آپ نے سب سے پہلے کون سی کہانی لکھی اس کا نام کیا تھا اور وہ کب شائع ہوئی ۔

ج: میں بتا چکا ہوں 1972ء میں ''پیکٹ کا راز'' لکھا تھا۔

س: وہ تو ناول تھا، کہانی کون سی تھی ۔

ج: پہلی مرتبہ میں نے 1961ء میں کہانی لکھی اور اس کا نام ''بڑا قد'' تھا۔اپنے چھوٹے قد پر لکھی تھی ۔(قہقہے)

س: آپ کو انسپکٹر کامران مرزا سے کیا دشمنی ہے، ان کے ناول کم اور انسپکٹر جمشید کے ناول زیادہ ہوتے ہیں ۔

ج: یہ دشمنی کی بات نہیں ، انسپکٹر جمشید سیریز پہلے شروع کی گئی تھی اور اس وقت تک ان کے پچاس سے زائد ناول بک چکے تھے۔ اب ظاہر ہے ان کے ناول ہمیشہ زیادہ ہی ہوں گے۔ اب مقبولیت کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے ، بچے انسپکٹر جمشید کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور انہی کی کتابوں کی مانگ زیادہ ہے ۔

س: کیا آپ کو بچپن ہی سے ناول لکھنے کا شوق تھا۔

ج: ناول 1972ء میں لکھنا شروع کیا۔ بچپن میں کہانیاں لکھا کرتا تھا ۔

س: آپ ناول شوق کی خاطر لکھتے ہیں یا بچوں کی خاطر۔

ج: دونوں کی خاطر۔

س: آپ ناول نگاری کے بعد کیا کریں گے۔

ج: بس ناول نگاری رہ گئی ہے۔

س: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ناول وطن عزیز کے بچوں کو اس قابل بنا رہے ہیں کہ بوقت ضرورت وہ وطن کے کام آسکیں۔

ج: جی ہاں! کیونکہ میرے ناولوں میں صرف جاسوسی ہی نہیں ہوتی بلکہ ان میں اسلامی تاریخ، ادب، مہم اور عام گھریلو مسائل بھی شامل ہوتے ہیں۔

س: اگر آپ کے ناولوں کو ٹیلی ویژن میں دکھایا جائے تو کیا آپ اسے پسند کریں گے یا نہیں۔

ج: اس میں میری پسند اور نا پسند کا سوال نہیں ہے، کچھ بچے میرے ناول ٹیلی ویژن پر دیکھنا چاہتے ہیں، کچھ بچے اس کے خلاف ہیں جو بچے اس کے خلاف ہیں وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں کرداروں کی تصویریں ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ٹیلی ویژن والے ان تصویروں کے مطابق ان کرداروں کو پیش نہ کرسکیں۔

س: آپ ایک ماہ میں چار ناول لکھتے ہیں، ہر ناول کو پڑھنے کے لیے دو دن درکار ہوتے ہیں۔ اس طرح آپ کے چار ناول پڑھنے کے لیے بچوں کو کم از کم ایک ہفتہ درکار ہوتا ہے۔ کیا آپ کا اتنا زیادہ لکھنا بچوں کی پڑھائی کو متاثر نہیں کرتا۔

ج: پہلی بات یہ ہے کہ بچے ایک ناول کو دو دن میں نہیں پڑھتے، بلکہ اسے ایک یا ڈیڑھ گھنٹے میں پڑھ لیتے ہیں۔ یہاں اتنے زیادہ بچے بیٹھے ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیجیے کہ وہ ایک ناول کتنی دیر میں پڑھتے ہیں۔

س: انسپکٹر جمشید سیریز کو پڑھ کر پتا چل جاتا ہے کہ آگے کیا ہوگا یعنی اس میں کوئی سسپنس نہیں ہوتا جب کہ شوکی سیریز میں ایسا نہیں، پوری کہانی کے مطالعے سے ہی اس کی سمجھ آتی ہے ویسے نہیں۔ اس کی وضاحت کیجیے۔

ج: ہر ناول میں ایسا نہیں ہوتا کہ مجرم کی شخصیت کو چھپا کر لکھا جائے۔ بعض ناولوں میں ہم مجرم کو ظاہر کر دیتے ہیں، لیکن اس کی گرفتاری ذرا مشکل کر دیتے ہیں۔

س: آپ بچوں کی خاطر جس مقصد کے لیے لکھ رہے ہیں کیا آپ کو اس مقصد میں کامیابی ہوئی، علاوہ ازیں آپ اس کی وضاحت کر دیجیے کہ

آپ کا اصل مقصد کیا تھا اور آپ بچوں میں کس قسم کے اوصاف پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ج: کامیابی کا ثبوت ان سب بچوں کی یہاں موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے اگر کامیابی نہ ہوتی تو اتنے زیادہ بچے نہ آتے۔ ناولوں میں حتی الوسع یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمارا اسلامی جذبہ اور رجحان ترقی پکڑے اور ہم سمجھیں کہ اسلام ہم سے کیا کہتا ہے۔

س: بعض بچے حالات سے تنگ آکر چوری اور دیگر بُری عادات کے عادی بنتے ہیں۔ کیا جاسوسی کتابیں پڑھنے سے ان کی عادتوں میں اضافہ نہیں ہو گا۔

ج: ہرناول میں اچھائی اور برائی دونوں رخ ہوتے ہیں۔ ناول میں برائی کا انجام ہمیشہ بُرا ہی دکھایا جاتا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی آدمی برائی کو اپنا لے تو میرے خیال میں لکھنے والے کا کوئی قصور نہیں ہوگا۔

س: آپ کے ناولوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے ''بچوں کے مشہور و معروف مصنف ''اشتیاق احمد'' اور اس کے ساتھ آپ کی تصویر بھی چھپی ہوتی ہے ، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ ہمیشہ اسی طرح مشہور ومعروف رہیں گے۔

ج: وہ ایک مونو گرام ہے اور بہت شروع سے چلا آرہا ہے اس لیے اب یہ مجبوری بن گیا ہے۔

س: مہینے میں آپ کے چار ناول شائع ہوتے ہیں اور چاروں بیک وقت ، لیکن اگر آپ ہر ہفتے ایک ناول نکالیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔

ج: ہر ہفتے ایک ناول شائع کرنا بڑا مسئلہ ہے۔

س: آپ نے اپنے ناولوں میں لکھا ہوا ہے کہ آپ ایک ناول چار دن میں لکھتے ہیں ، یعنی 16 دنوں میں چار ناول لکھ لیتے ہیں تو باقی دن ...؟

ج: ناول لکھنے کے علاوہ مجھے اور بھی بہت کام کرنے ہوتے ہیں۔

س: اس وقت آپ کی عمر کتنی ہے۔

ج: اس وقت میری عمر 40 سال ہے۔

س: آپ کی تعلیم کتنی ہے۔

ج: میٹرک۔

س: آپ کے ناولوں میں پاکستان کے حوالے سے ایک کردار انسپکٹر ہے۔ کیا آپ کو اس قسم کا کردار واقعی پولیس میں نظر آیا۔

ج: مجھے دکھ ہے کہ ہماری پولیس میں ایسا کوئی کردار نہیں۔

س: یعنی کوئی بھی انسپکٹر جمشید پاکستان کی پولیس میں نہیں ہے۔

ج: جی نہیں۔

س: اس قسم کے کردار کس ملک کی پولیس میں ہوتے ہیں اور آپ نے یہ کردار کہاں سے لیا۔

ج: میری خواہش ہے کہ ہماری پولیس میں ایسے انسپکٹر ہوں اور اس کردار کے جنم لینے کی بھی یہی وجہ ہے۔

س: آپ کا پہلا ناول 1972 میں منظر عام پر آیا اور اب تک بقول آپ کے آپ 350 ناول لکھ چکے ہیں۔ آپ یہ بتایئے کہ جب آپ نے اپنا پہلا ناول لکھا اور جب یہ مارکیٹ میں آیا اس وقت آپ کا ارادہ کیا تھا اور ناول لکھنے سے قبل آپ کی مصروفیات کیا تھیں؟

ج: شروع میں مجھے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ جو مختلف رسائل میں چھپی ہیں ، اس کے بعد بڑوں کے لیے افسانے لکھے جو مختلف رسائل میں چھپتے رہے بعد ازاں جب میں نے بڑوں کے لیے ایک معاشرتی ناول لکھا اور اسے شائع کرانے کی غرض سے پبلشرز کے پاس گیا تو انہوں نے کہا جناب آج کل تو رومانی ناول چھپتے ہیں، لہٰذا آپ بچوں کے لیے ناول لکھ کر لائیں۔ میں نے اپنی کوشش سے بچوں کے

لیے پہلا ناول لکھا اور پھر دوسرا، تیسرا اور یوں یہ سلسلہ جاری ہوا۔

س: اگر کوئی بچہ آپ کا ناول پڑھنے کے بعد اس کی کہانی یا کسی کردار کے بارے میں آپ کو اپنی رائے دیتا ہے کہ اسے اس طرح نہیں بلکہ اس طرح ہونا چاہیے تھا تو کیا آپ اپنے آیندہ ناولوں میں بچوں کی رائے کو مدنظر رکھتے ہیں؟

ج: مجھے بچوں کی طرف سے اکثر تجاویز ملتی رہتی ہیں اور آیندہ ناول لکھتے وقت میں ان کا خیال رکھتا ہوں اور اس سلسلے میں میری حتی الوسع کوشش ہوتی ہے کہ میرے آیندہ ناولوں میں وہ غلطی نہ ہو۔

س: اب تک آپ جاسوسی ناول لکھتے رہیں، آیندہ کے بارے میں آپ کا کیا پروگرام ہے کیا آپ مستقبل میں جاسوسی ناول ہی جاری رکھیں گے یا ان میں کوئی تبدیلی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ج: اس وقت میری تین سیریز چل رہی ہیں جو بے حد مقبول ہو ہیں۔ فی الحال میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں چاہتا۔

س: آپ نے ابھی کہا ہے کہ میری خواہش ہے کہ ہماری پولیس میں بھی انسپکٹر جمشید جیسے کردار موجود ہوں، لیکن پولیس آپ کے ناول نہیں پڑھتی۔

ج: پولیس والے میرے ناول پڑھتے ہیں، کیونکہ ان کے بھی بچے ہوتے ہیں اور جب وہ اپنے بچوں کے لیے میرے ناول خریدتے ہیں تو خود بھی اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

س: اکثر بچے جب آپ کے ناول پر آپ کی تصویر دیکھتے ہیں تو آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور آپ کا پتا بھی پوچھتے ہیں۔ آپ چونکہ لاہور نہیں بلکہ جھنگ میں رہتے ہیں اس لیے وہ بچے جو آپ سے ملنے کے خواہش مند ہوں، وہ لاہور میں آپ سے کب کہاں اور کس

جگہ مل سکتے ہیں۔

ج: حال ہی میں چھپنے والے ناولوں میں میرا پتا اور وقت درج ہے، بچے ہفتے کے دن مل سکتے ہیں اور مل بھی رہے ہیں۔

س: کسی بھی کتاب یا ناول کو بچوں میں مقبول کرنے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ''انعامی مقابلے'' شامل کیے جاتے ہیں، آپ کے اب تک 350 ناول مارکیٹ میں آچکے ہیں کیا آپ نے اس سلسلے میں کچھ سوچا۔

ج: میرے ناولوں میں ایک انعامی سلسلہ گذشتہ چار سالوں سے چل رہا ہے۔

س: انعامی سلسلہ تو جاری ہے میرا مطلب کسی نئے اور خصوصی نوعیت کے انعامی سلسلے سے تھا۔

ج: اس مرتبہ جو ناول مارکیٹ میں آئے ان میں عام انعامی مقابلے سے ہٹ کر خصوصی نوعیت کا انعامی مقابلہ شامل کیا گیا ہے، اس دفعہ ناول میں سے ایک سوال دیا گیا ہے جو بچے ناول پڑھنے کے بعد اس سوال کا جواب دے سکیں گے اور اس کا انعام پانچ ہزار روپے رکھا گیا ہے۔

س: کیا آپ کے ناول آپ کے اپنے بچے پڑھتے ہیں۔

ج: جی ہاں! میرے بچے سب ہی میرے ناول پڑھتے ہیں۔

س: آپ بچوں کے لیے ناول لکھتے ہیں، بڑوں کے لیے کیوں نہیں لکھتے۔

ج: بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا تو آپ مجھے جینے نہیں دیں گے۔

س: آپ بہت چھوٹے بچوں کے لیے کیوں نہیں لکھتے۔

ج: میں چھوٹے بچوں کے لیے آٹھ آنے اور ایک روپے والی کتابیں لکھتا ہوں۔

س: آپ اپنے ناولوں میں انسپکٹر کامران مرزا کا ذکر انسپکٹر جمشید سے کم کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے۔

ج: انسپکٹر جمشید کے دو ناول آتے ہیں اور کامران مرزا کا ایک تو ظاہر ہے ان کا ذکر زیادہ ہوگا۔

س: آپ ہر ماہ ناول لکھتے ہیں اس کی وجہ مقبولیت حاصل کرنا ہے یا دولت۔

ج: دولت بھی کمانی پڑتی ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ ساتھ با مقصد کام ہو جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔

س: آپ کی پسندیدہ شخصیت کون سی ہے۔

ج: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم۔

س: کیا آپ نماز پڑھتے ہیں۔

ج: جی ہاں۔

س: آپ اپنے ناولوں میں انسپکٹر جمشید کی دیانت دکھلاتے ہیں، اگر آپ کو پولیس میں شامل کر دیا جائے تو کیا آپ ایسا ہی کام کریں گے۔

ج: ایسی صورت میں، میں آپ کے لیے ناول نہیں لکھ سکوں گا۔

س: آپ کی امی آپ کو پیار سے کیا کہتی ہیں۔

ج: میری امی وفات پا چکی ہیں، گھر والے مجھے پیار سے شوکی کہتے ہیں۔

س: جاسوسی کتابوں سے بعض لوگوں اور بچوں کی تربیت درست نہیں ہوتی اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی مجرم سے پوچھا جائے کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو اس کا جواب ہوتا ہے کہ میں نے فلاں جاسوسی کتاب یا فلم دیکھ کر کیا، اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ج: جب ایک کہانی لکھی جاتی ہے تو اس میں اچھائی اور برائی دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں، لیکن برائی کے پہلو کو ہمیشہ شکست ہوتی ہے، اب اگر ایک شخص برائی کے پہلو کو اپناتا ہے تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے کہ لکھنے والے کی۔

س: آپ کا قد اتنا چھوٹا کیوں ہے۔ (قہقہے)

ج: اگر میں آپ سے پوچھوں کہ آپ کا قد اتنا لمبا کیوں ہے تو اس کا کیا جواب ہے؟

س: آپ ناول لکھنے کے علاوہ اور کیا کرتے ہیں۔

ج: ناول لکھنا ہی کافی ہے۔

س: آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے۔

ج: میری زندگی کی خواہش میرے ناولوں میں ہے آپ انہیں پڑھ لیجیے۔

س: آپ کی تصویر کتاب کے باہر ہوتی ہے۔ کیا آپ کو تصویریں چھپوانے کا زیادہ شوق ہے۔

ج: ہر کتاب پر صرف ایک ہی تصویر ہوتی ہے۔

س: کتابوں پر آپ کی تصویر بہت پرانی ہے، لہٰذا اب اسے بدل دیجیے، کیونکہ وہ تصویر آپ کے بچپن کی معلوم ہوتی ہے۔

ج: میں بچپن میں ایسا ہی تھا جیسا اب ہوں، شاید بڑا ہی نہیں ہوا؟

پروگرام ختم ہونے سے پہلے ضیاء شاہد نے اعلان کیا :

'' اشتیاق احمد آپ لوگوں کے لیے اپنی کتب لائے ہیں ... یہ ہر بچے کو ایک ناول دیں گے ... ہمارا عملہ یہ کتب تقسیم کرے گا... اس لیے پورے نظم وضبط کے ساتھ بیٹھے رہیں ۔''

ڈرائیور تمام کتب وہاں سے لے آیا تھا ... کتب کی تقسیم شروع ہوئی ... اور پھر کتب کم پڑ گئیں ... میں نے یہ اندازہ پہلے ہی لگا لیا تھا ... لہٰذا ڈرائیور کو پہلے ہی دفتر کی طرف بھگا دیا تھا ... ابھی کتب تقسیم ہو رہی تھیں کہ وہ مزید بنڈل لے آیا ... اور اس طرح آنے والے تمام بچوں تک کتب پہنچ گئیں ... پروگرام ختم ہوا تو جنگ کے تمام بڑے عہدے داروں نے میرے ساتھ چائے پی ... اس وقت ضیاء شاہد صاحب نے کہا:

'' آج تک اس قدر ہجوم ہمارے کسی پروگرام میں بھی نہیں ہوا ... آخر مجھے بہت باعزت طریقے سے رخصت کیا گیا۔

بعد میں پتا چلا کہ یہ پروگرام کلوز سرکٹ کیمرے کے ذریعے جنگ کے مالکان نے بھی دیکھا تھا ... اس وقت کلوز سرکٹ کیمرے عام نہیں تھے ...

جنگ جیسا ادارہ ہی لگوا سکتا تھا ...

اس انٹرویو کے بعد ایک روز پاکستان ٹیلیویژن کی طرف سے خط ملا ... اس میں لکھا تھا:

'' ہم آپ کے فنون میں شائع ہونے والے افسانے ' آخری میں ' کو پی ٹی وی پروگرام میں بھی پیش کرنا چاہتے ہیں ... آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں... ''

بھلا مجھے کیا اعتراض ہوتا ... میرے لیے تو بہت خوشی کی بات تھی ... 'آخری میں' نشر ہوا ... اور پاکستان ٹیلیویژن نے مجھے اس کا معاوضہ بھی دیا ...

کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پی ٹی وی کی طرف سے ایک صاحب نے مجھ سے ملاقات کی ... انہوں نے کہا۔

'' ہم آپ کو اپنے پروگرام فروزاں میں بلانا چاہتے ہیں ... آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔ ''

مجھے کیا اعتراض ہوتا ... میں تو بہت خوش ہوا تھا یہ سن کر ... فروزاں پروگرام نصف گھنٹے کا پروگرام تھا ... ہر ہفتے پیش کیا جاتا تھا ... اس میں ملک کے ابھرتے ہوئے ٹیلنٹ کو دعوت دی جاتی تھی ... پروگرام کی میزبان تھیں غزالہ قریشی ... خیر ان کی دعوت پر میں ٹی وی اسٹیشن گیا ... غزالہ قریشی صاحبہ سے ملا ... انہوں نے بتایا کہ پروگرام کی کیا ترتیب ہے ... کیا کچھ سوالات پوچھے جا سکتے ہیں ... چند دن تک مجھے بار بار جانا پڑا ...

آخر ریکارڈنگ کا دن آ گیا ... بھرے مجمعے کے سامنے جب میں اسٹیج پر جا کر بیٹھا تو بہت گھبراہٹ محسوس ہوئی ... ادھر غزالہ قریشی اسٹیج پر بیٹھے مہمانوں سے تعارف کرا رہی تھیں ... میرا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے کہا:

اور یہ ہیں بچوں کے مشہور و معروف مصنف اشتیاق احمد جو اب تک بے شمار ناول لکھ چکے ہیں اور یہ سلسلہ زور شور سے جاری ہے ... ویسے اشتیاق صاحب ...

آپ اب تک ناول کتنے لکھ چکے ہیں... کہانیوں اور چھوٹی کتابوں کو چھوڑ کر ...
''جی ... بس ڈیڑھ سو کے قریب ہو چکے ہیں۔''

اس پر پورے ہال نے زبردست تالیاں بجائیں ... نصف گھنٹے کے اس پروگرام میں غزالہ قریشی مجھ سے اور باقی مہمانوں سے سوال کرتی رہیں ... میرے اس پروگرام میں دو مہمان اور تھے ...

یہ میری زندگی کا پہلا ٹی وی پروگرام تھا ...

اس پروگرام کے دوران غزالہ قریشی نے مجھ سے ایک سوال یہ بھی پوچھا کہ: ''کیا کبھی آپ کو کسی سے مل کر ایسا لگا کہ آپ اپنے ہی ناولوں کے کسی کردار کو جیتی جاگتی صورت میں اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہے ہوں۔''

غزالہ قریشی کے اس سوال نے مجھے چونکا دیا ... اور پھر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا: ''ہاں ! ایسا ہوا تھا ... کراچی سے ایک لڑکا مجھ سے ملنے آیا تھا ... اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا کہ میرے ناولوں کا کردار فاروق میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہو ... اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کا نام بھی فاروق تھا۔''

یہ بات کہتے ہوئے میرا اشارہ فاروق احمد کی طرف تھا ... جی ہاں ... وہی فاروق احمد جو آج میرے ناولوں کے پبلشر اور اٹلانٹس پبلی کیشنز کے روحِ رواں ہیں۔

فروزاں مارچ 1980 کے پہلے ہفتے میں پیش کیا گیا تھا ... اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہی لڑکا 33 سال بعد میرے ناولوں کا پبلشر بننے والا ہے ...

اس کے بعد دوسرے اخبارات اور رسائل والے میری طرف متوجہ ہوئے ... انہوں نے جو انٹرویو وغیرہ لیے ان کا ذکر اپنے وقت پر آئے گا...

☆☆☆☆☆

O

نئے شہر والی جگہ پر ٹیلی فون لگ چکا تھا ... ایک دن ایک فون موصول ہوا... میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کسی نے کہا۔

” اشتیاق صاحب ! میں افتخار کھوکھر بات کر رہا ہوں ... بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد شعبہ بچوں کا ادب سے ۔“

ایک بار پھر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا ... میں نے فوراً کہا۔

” جی فرمایئے۔“

” ہم یہاں بچوں کا ادب کے سلسلے میں پروگرام کراتے رہتے ہیں ... آپ سے درخواست ہے ... کہ آپ بھی ہمارے پروگراموں میں شرکت کیا کریں... اس ماہ کے آخر میں ایک پروگرام ہو رہا ہے ... بچوں کے ادب کے حوالے سے ... آپ اس میں مقالہ پڑھیں ... یہ میری آپ سے درخواست ہے۔“

” جی ... مقالہ ۔“ میں حیرت زدہ رہ گیا ... میں نے کبھی مقالہ نہیں لکھا تھا... مجھے تو پتا بھی نہیں تھا ... کہ مقالہ کہتے کسے ہیں ... ادھر انہوں نے کہا:

” ہاں مقالہ ... پرانا اور نیا بچوں کا اردو ادب ... یہ آپ کے مقالے کا عنوان ہے ... آپ بس آنے کا وعدہ کر لیں۔“

اور میں نے پریشانی کے عالم میں وعدہ کر لیا ... مقررہ تاریخ سے پہلے مقالہ لکھ لیا ... اسے کئی بار پڑھ کر دیکھا۔ آخر وہاں ادیبوں کی محفل میں سنانا تھا۔

یہ بھی زندگی میں پہلی بار ہوا کہ ایک اجلاس میں اپنا لکھا ہوا مقالہ سنایا ... کچھ لوگوں نے مقالے کی تعریف کی ... ایک دو نے اعتراض بھی کیے ... وہ مقالہ کچھ یوں تھا :

دو روزہ سیمینار ''بچوں کا ادب'' 26,25 اپریل 1987ء اسلام آباد اس سیمینار کے شرکاء کی سفارشات کی روشنی میں مئی 1987ء کو دعوۃ اکیڈمی کے تحت ''شعبہ بچوں کا ادب'' کا قیام عمل میں آیا ... اس پروگرام میں یہ مقالہ پڑھا گیا:

بچوں کے ادب میں جدیدیت کی ضرورت اہمیت فوائد و نقصانات۔

مقالہ:

'' عنوان آپ نے ملاحظہ فرمایا، اس کے چار حصّے ہیں، ضرورت، اہمیت، فوائد اور نقصانات ... سب سے پہلے ضرورت کی بات آتی ہے ... ایک دور تھا، جب بچوں کے ارد گرد صرف جنّوں، بھوتوں، پریوں، چڑیلوں، بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں اور جادوگروں کی کہانیاں ہی نظر آتی تھیں ... یا بچہ ان میں گھرا نظر آتا تھا ...خال خال ہی کوئی کہانی معاشرتی کرداروں پر مبنی کسی بچے کو نصیب ہوجاتی تھی لیکن وہ کہانی اسے اجنبی سی لگتی، اس کہانی کو پڑھ کر اسے یوں لگتا، گویا یہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق کی کہانی ہے ...

پھر دور بدلا، تبدیلی آئی، بچوں کے ادب نے جھرجھری لی ... ایک انگڑائی لی ... نہ جانے کیوں اور کیسے یہ ہوا، اس سے بھی یہاں مقصود نہیں ...عنوان میں شامل ہوتا تو ضرور بات کی جاسکتی تھی، بلکہ سیر حاصل ہوسکتی تھی ...

بہرحال یہ ہوگیا، کہانیوں کے کردار آج کے جیتے جاگتے انسان نظر آنے لگے، وہ جنوں اور بھوتوں سے برسر پیکار نظر آنے کے بجائے زندگی کی مشکلات، روزمرہ مشکلات، روز افزوں مشکلات سے دور چار نظرآنے لگے ... پہلے جو اکیلی دکیلی کہانی اجنبی لگتی تھی ... اب اس جیسی بہت کہانیاں پڑھنے کو ملنے لگیں ،

اور جنوں، بھوتوں، پریوں، شہزادوں کی کہانیاں اجنبی لگنے لگیں، معدوم ہونے لگیں ... آج ایسی کہانیاں خال خال ہوگئیں ، اور کیوں نہ ہوتا ... سائنس کی ترقی نے جادوگروں کے کمالات سے پردہ جو اٹھا دیا تھا ... شاید سائنس نے ہی اس جدیدیت کا احساس دلایا تھا ... وقت کے دھارے نے کہانیوں کا رخ موڑ دیا تھا ... گویا کہانی میں ، میرا مطلب ہے، بچوں کے ادب میں جدیدیت کی ضرورت کا احساس کر لیا گیا ضرورت کو مان لیا گیا، اگر مان نہ لیا جاتا، تو اس وقت اس عنوان کے تحت مقالے کی بھی کیا ضرورت تھی ...

یہ تھی ضرورت کی بات ، اب اہمیت پر بات ہوجائے ... ماورائی کہانیاں بچوں کو کیا دیتی تھیں یا کیا دیتی ہیں، اس لیے کہ اب بھی کسی حدتک پرانے زمانے کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں ... میں سرے سے ان کے مخالف نہیں، جنوں، بھوتوں، پریوں اور بادشاہوں وغیرہ پر آج بھی کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں، لیکن ان میں جدیدیت کو لانا ہوگا ورنہ وہ فرسودہ ہی لگیں گی ...

ایسی کہانیوں میں جدیدیت کو کیسے لایا جا سکتا ہے ... میں یہاں اس کی چند مثالیں دے سکتا تھا ... لیکن پھر میں اپنے عنوان سے دور چلا جاؤں گا ...صرف اتنا کہوں گا کہ ایک جادوگر کے مقالے کے لیے ہم کوئی سائنس کی ایجاد کو استعمال کر کے خود اسے مبہوت کر سکتے ہیں ، یا ایک جن کو آج کے دور میں ناکام دکھا سکتے ہیں، مثلاً ایک جن کسی جادوگر کا غلام ہے ۔

وہ اسے کوئی حکم دیتا ہے ، لیکن جن سائنسی ایجادات کی وجہ سے بری طرح ناکام ہوجاتا ہے ... گویاان کہانیوں میں بھی جدید رنگ لایا جا سکتا ہے اور یہ رنگ بچوں کے لیے بہت دلفریب ہے... میں اہمیت کی بات کررہا تھا ... ماورائی کہانیاں بچوں کو خوف کا تحفہ دے جاتی ہیں ... بچہ جنوں اور بھوتوں کے خواب دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے یا پھر الہ دین کا چراغ پڑھ کر راتوں رات مالدار بن جانے کے خواب دیکھنے لگتا ہے ... وہ چاہتا ہے میں کوئی ایسا کام کروں ، میرا کام

بیٹھے بٹھائے ہو جائے ، ہینگ لگے نہ پھٹکڑی ، رنگ چوکھا آئے ... یہ خیالات بچوں کے لیے خطرناک تو ہو سکتے ہیں مفید کسی طرح نہیں۔

اس کے برعکس ، ایک جدید کہانی کا کردار زندگی کی مشکلات میں الجھتا ہے ، لیکن ڈٹا رہتا ہے یہاں تک کہ کامیابی اس کے قدم چومتی ہے ... اس قسم کی کہانی پڑھ کر اس میں حوصلہ تو پیدا ہو سکتا ہے ، مایوسی کے جراثیم نہیں ، لہٰذا جدیدیت کی ضرورت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ...

تیسرا ...فوائد ... بچے قوم کا سرمایہ ہیں ... ہم انھیں تصوراتی ادب دے کر خواب دیکھنا سکھاتے ہیں، معاشرے کی جیتی جاگتی کہانیاں دیں گے تو بچہ جان لے گا کہ وہ کس ماحول میں پرورش پا رہا ہے اور اسے کل کیا کرنا ہے، ملک وقوم اور اپنے دین کے کس کام آنا ہے ... جدید ادب ہی انھیں یہ شعور دے سکتا ہے کہ ملک دشمن عناصر سے انھیں کس طرح نبٹنا ہے، یا ان کے گرد کس قسم کے خطرات بکھرے ہوئے ہیں ، بڑی طاقتوں نے ان کے ملک کو قوم کو اور مذہب کو کن کن ہولناک مسائل سے دوچار کر دیا ہے ، یاان کے آئندہ چل کر کیا خوفناک عزائم ہیں ... اپنے معاشرے میں جو جرائم پنپ رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے انہیں کیا کرنا ہے ان کو روکنے کے لیے انہیں آئندہ زندگی میں کیا کرنا ہو گا... معاشرے میں جن خرابیوں نے جنم لیا ہے ...

رشوت ، جھوٹ ، دھوکا ، فریب اُن کے خلاف سینہ سپر ہونا ہے ... یہ سب باتیں ہمیں جدید ادب تو بتا سکتا ہے ، پرانا ادب نہیں ... جدید ادب ملک وملت کے لیے کٹ مرنے کا سبق دیتا نظر آتا ہے، جھوٹ نہ بولنے کا درس دیتا نظر آتا ہے، بلکہ برائیوں کے خلاف ڈٹ جانے کا سبق سکھاتا ہے اور پرانا ادب صرف خواب دیکھنا راتوں رات دولتمند ہونا ... جدید ادب اسلام کی اقدار سے روشناس کراتا نظر آتا ہے جب کہ پرانے ادب میں اسلام کا نام بہت کم ملتا ہے ... اس ادب میں کہانی صرف کہانی ہوتی تھی ... جدید کہانی ، کہانی کے

علاوہ بھی بہت کچھ ہوتی ہے ... بہت کچھ دے جاتی ہے کچھ لے نہیں جاتی ... جدید کہانی آئندہ آنے والی زندگی کی معاون ہے ... آدمیت کو آدمیت کا احساس دلاتی ہے، اسے جنوں، بھوتوں اور دیووں کے مقابلے میں کم نہیں دکھاتی، اسے اشرف المخلوقات ہونے کا احساس دلاتی ہے ... جدیدیت کے یہ فوائد نہیں تو اور کیا ہیں ...

اب نقصانات پر بھی بات کر لینی چاہیے ... ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں، جدید ادب کے بھی دو رخ ہیں ... یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ ازل سے یہی دو رخ چلے آرہے ہیں ایک اچھا، ایک بُرا، جدید ادب بھی اس سے محفوظ نہیں رہا... تقلید کا جنون کچھ اس طرح سوار ہوا کہ نفع اور نقصان کی تمیز کھو بیٹھے ...

ہم نے اس جدید ادب کا یہ مطلب سمجھ لیا کہ ایک غیر ملکی کہانی پڑھی اور اسے اردو میں اپنے بچوں کے لیے لکھ دیا ... ایک جاسوسی ناول انگریزی کا پڑھا اور اس کی کہانی ذہن میں رکھ کر اپنے ملک کے بچوں کے لیے ایک جاسوسی ناول یا کہانی لکھ دی، یا مہماتی کہانی کو لیں، یا پھر خوفناک کہانی کو لے لیں، غیر ملکی کہانیوں کا مزاج اور ہے ہمارے ملک کا اور، ایک غیر ملکی معاشرے کی کہانی اگر ہم اپنے بچوں کو اردو زبان میں دیں تو وہ متضاد کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے ... غیر ملکی کہانیوں کی اندھا دھند نقل کو جدید کہانی خیال کرلیا گیا ہے اور یہی سب سے بڑا ظلم ہے ...

ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم جدید دور کے تقاضوں کو سمجھیں، سائنسی معلومات سے فائدہ اٹھائیں، دوسرے ممالک میں جو جرائم ہوتے ہیں ان پر نظر رکھیں، ان ممالک سے ہمارا جو نظریاتی اور مذہبی ٹکراؤ ہے ، اس کو پیش نظر رکھیں، جو طاقتیں اسلام کے خلاف کام کررہی ہیں، ان پہلوؤں کو دیکھیں اور ان سب معاملات کو ذہن میں محفوظ رکھ کر اپنے بچوں کے لیے اپنی زبان میں، اپنے کرداروں پر مبنی کہانی لکھیں ... اس صورت میں لکھی گئی کہانی جدید تو ہوگی، نقصان دہ نہیں ہوگی

... ہمت تو دلائے گی بزدلی نہیں سکھائے گی، بڑی طاقتوں کے خوفناک منصوبوں سے ہوشیار تو کرے گی ان سے ڈرنا نہیں سکھائے گی۔

لیکن اگر ہم نے جدید کہانی کا مطلب صرف اور صرف مار دھاڑ والی کہانیاں لے لیا، قتل وخون اور غارت والی کہانیاں خیال کر لیا اور ان کہانیوں میں بھی ملکی اور ملّی جذبات کا احساس نہ کیا، ان میں صرف فیشن زدہ طبقے کی اقدار کو اجاگر کیا، ماڈرن زمانے کی صرف ماڈرن باتوں کو کہانی میں سمویا تو پھر ایسی کہانی جدید تو ہو گی صحت مند ہر گز نہیں کہلائے گی۔ جدید ادب کا یہی رخ خطرناک ہے ... جرائم کے گھناؤنے پن کو دکھانے کی بجائے جرائم کو خوبصورت بنا کر پیش کیا جائے گا یا جرم کرنے والے کو اگر ہیرو بنا دیا جائے تو ایسی جدید کہانی منفی اثرات کا باعث بنے گی۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے اپنی جدید کہانی اور اسلام کو دو الگ الگ چیزیں خیال کر لیا ہے ... جدید کہانی جو جاسوسی ہو، مہماتی ہو، یا صرف اصلاحی ہو، اگر ہم اپنے مذہب کے نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر اسے لکھیں گے تو کہانی ضرر رساں بن ہی نہیں سکے گی ... میں یہاں دو مثالیں دینے پر خود کو مجبور پاتا ہوں، اسے خود ستائی پر محمول نہ فرمایئے گا ... مقصد ہرگز یہ نہیں ... صرف یہ بتانا ہے کہ ایسا بھی کیا جا سکتا ہے یا ایسا بھی ہو سکتا ہے ...

میرے ایک ناول کا نام ''سوٹ کیس کا سفر'' ہے ... کہانی کا مختصر سا خاکہ سن لیں ... ایک بہت دولت مند آدمی کی فرم کا منیجر ایک بڑا غبن کر کے فرار ہوتا ہے اسی روز سیٹھ کا بیٹا بیرون ملک سے آتا ہے اس کے ساتھ ایک بڑا سوٹ کیس ہے جس میں وہ اپنے گھرانے کے لیے تحائف بھر کر لاتا ہے ... سوٹ کیس کھلنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ سیٹھ کو غبن اور منیجر کے فرار کی اطلاع ملتی ہے جونہی اسے یہ اطلاع ملی اس نے فوراً کہا: نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا میری فرم میں تو غبن ہو ہی نہیں سکتا ... ادھر سوٹ کیس کھولا گیا تو وہ نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا

تھا ... سوٹ کیس کسی کے سوٹ کیس سے بدل گیا تھا ... تفتیش شروع ہوئی کہ یہ سوٹ کیس کیسے بدل گیا اور سیٹھ کے بیٹے والا سوٹ کیس کہاں ہے ، آخر وہ شخص پکڑا گیا ... سوٹ کیس ایئر پورٹ پر بدلا گیا تھا جو شخص پکڑا گیا تھا ... وہ فرم کا منیجر تھا ... رقم چیک کی گئی تو وہی تھی جو غبن کی گئی تھی ... یہ سب تو ہوا، لوگ اس بات پر متحیر تھے کہ سیٹھ کو کس طرح یقین تھا کہ اس فرم میں تو بے ایمانی کی ہی نہیں جا سکتی، غبن ہو ہی نہیں سکتا ... لوگوں نے جب یہ سوال پوچھا تو اس نے فوراً کہا، مجھے یقین تھا، کیونکہ میں ہر سال اپنے تمام مال پر پوری طرح زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ جس مال پر زکوٰۃ ادا کی جائے، وہ ضائع نہیں ہو سکتا...

یہ ایک مثال تھی، دوسری مثال سنیے : ایک شخص نے خرکار کیمپ بنا رکھا ہے وہ بچوں کو اغوا کرتا ہے سارا دن ان سے پتھر تڑواتا ہے اور صرف ایک وقت کھانا دیتا ہے ... ایک بچے کے اغوا کے سلسلے میں تفتیش کا آغاز ہوتا ہے ، آخر اس کیمپ کا سراغ لگا لیا جاتا ہے ... مجرم گرفتار ہو جاتا ہے ... لیکن اس کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں، ان تعلقات نے زور مارا اور پولیس کو حکم مل گیا کہ اسے چھوڑ دیا جائے ... کہانی کا مرکزی کردار انسپکٹر بھلا ایسی باتوں کو کب خاطر میں لاتا اس نے اُسے چھوڑ نے سے انکار کر دیا ... اب بڑے لوگ اس کے سفارشی بن کر اوپر جاتے ہیں ... صدر صاحب تک پہنچ جاتے ہیں، چنانچہ صدر صاحب حکم دیتے ہیں کہ مجرم کو چھوڑ دیا جائے ... انسپکٹر فوراً ان کے پاس پہنچتا ہے اور جا کر عرض کرتا ہے، میں آپ کو ایک حدیث سنانا چاہتا ہوں ... حدیث یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ پچھلی قومیں اس لیے تباہ ہو گئیں کہ ان کے چھوٹے جب کوئی جرم کرتے، تو انھیں پکڑ لیا جاتا لیکن جب ان کے بڑے جرم کرتے تو انھیں چھوڑ دیا جاتا ... یہ الفاظ سن کر صدر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں اب چاہے کچھ ہو اس

مجرم کو نہیں چھوڑا جائے گا، بلکہ آئندہ بھی کسی مجرم کو نہیں چھوڑا جائے گا ، وہ چھوٹا ہو یا بڑا ...

یہ دو اسلامی پہلو دو ناولوں میں سموئے گئے، ان حالات میں تو جدید کہانی نقصان دہ نہیں ہوسکتی ... جدید ادب صرف اور صرف اس وقت نقصان دہ ہوگا جب اپنی معاشرتی اقدار اور دینی نقطہ نگاہ سے صرفِ نظر کر لیا جائے ... کہانی نئی ہو یا پرانی اس کو دینی اقدار سے ہم آہنگ کرنا ہوگا، ہم آہنگ نہیں کریں گے تو صرف جدید ہی نقصان دہ نہیں ہو گی، پرانی کہانی بھی بے فائدہ ثابت ہو گی ... محض وقت گزاری کا ذریعہ ہوگی ...''

اس کے علاوہ ...اپریل 1987ء میں دعوۃ اکیڈمی میں پھر ایک پروگرام ہوا ... اس میں مجھ سے سوالات وجوابات کی نشست ہوئی ... ملاحظہ فرمائیں:

'' اشتیاق احمد صاحب کا نام تو آپ سب نے سنا ہوگا، ان کا نام سنتے ہی ذہن میں خیال آتا ہے کہ حلیہ سراغ رسانوں جیسا ہو گا ... سر پر ہیٹ ہوگا اور آنکھوں پر چشمہ مگر آپ یقین جانیں وہ اس کے بالکل برعکس ہیں۔ وہ کتنی سادہ شخصیت کے مالک ہیں اس کا اندازہ آپ ملاقات پر لگا سکتے ہیں ... اب ان سے سوالات کی نشست کا آغاز کرتے ہیں جو ان سے اس نشست میں کئے گئے ...''

سوال : انکل آپ کے نام سے تو ہم واقف ہیں آپ کی تعلیم کیا ہے ؟

جواب: میٹرک۔

سوال: ہم نے تو اخبار میں پڑھا تھا کہ اشتیاق احمد فوت ہو گئے ہیں ؟

جواب: وہ کوئی اور اشتیاق احمد تھے۔

سوال: انکل کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ بھی انسپکٹر جمشید کی طرح ...؟

جواب : نہیں۔

سوال: آپ کی شادی ہو گئی ہے ؟

جواب: ہاں آپ کی عمر کا تو میرا بیٹا ہے ۔

سوال: انکل آپ خود تو آ گئے ہیں اور انسپکٹر جمشید وغیرہ کو ساتھ نہیں لائے ؟

جواب: وہ آپ ہیں ... آپ تو یہاں موجود ہیں پھر انسپکٹر جمشید وغیرہ کی بھلا کیا ضرورت ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ آپ صرف ناول وغیرہ ہی لکھتے ہیں،ختم نبوت اور دیگر اسلامی موضوعات پر کیوں نہیں لکھتے؟

جواب: میں نے ختم نبوت اور دیگر اسلامی موضوعات پر بھی لکھا ہے شاید وہ آپ کی نظر سے نہیں گزرے۔

سوال : انکل آپ کو کتابیں لکھنے کا خیال کیسے آیا؟

جواب: بچپن میں خود دوسروں کی کہانیاں پڑھا کرتا تھا انہیں دیکھ دیکھ کر ان لوگوں کا ٹائٹل پر نام کر ، ابتداء میں اپنا نام پیدا کرنے کے لیے۔

سوال: ''جاسوس کہیں کا'' میں آپ کیا محسوس کرتے ہیں ؟

جواب: یہی کہ یہ ایک کہانی ہے اور فرضی کہانی ہے ۔

سوال : انکل آپ کو بندوق چلانا آتا ہے ؟

جواب: ہاں (ہال میں بے شمار تالیاں)

سوال : محمود فاروق کبھی بڑے بھی ہوں گے کہ نہیں؟

جواب: آپ کا کیا خیال ہے ... کہ وہ بڑے نہیں ہوئے۔

سوال: ہاں آپ جب سے لکھ رہے ہیں وہ ابھی تک اسکول میں پڑھتے ہیں؟

جواب: انشاء اللہ بڑے ہوں گے۔

سوال: انکل آپ جو کتابیں لکھتے ہیں کیا ان کا انداز تبدیل ہو سکتا ہے؟یعنی ان میں اصلاحی عنصر زیادہ ہو سکتا ہے۔

جواب: ہاں بالکل ہو سکتا ہے۔

سوال : انکل بچے کلاس میں بیٹھ کر آپ کے ناول پڑھتے ہیں اور اس طرح آپ اپنی قوم کو غلط راستے پر لگا رہے ہیں ؟

جواب: نہیں میں تو ایسا نہیں کر رہا اور جو بچے کلاس میں میرے ناول پڑھتے ہیں ... ان کو آرام سے گھر میں پڑھنا چاہیے۔

اس کے علاوہ مزید پروگراموں اور ایوارڈوں کی وہ تفصیل بھی یہاں درج کر رہا ہوں ... جو اس وقت مجھے یاد آرہے ہیں:

تین روزہ سیمینار۔ بہتر کیسے لکھا جائے ... 3 تا 5 اکتوبر 1987ء
دوروزہ سیمینار۔ نئی نسل کی تربیت میں بچوں کے رسائل کا کردار۔
مدیر ماہنامہ چاند ستارے کی حیثیت سے ... 14، 15 جون 1989ء

اورینٹ دعوۃ ایوارڈ برائے بچوں کا ادب۔
2010ء بہترین ناول پر پہلا انعام 2005ء ناول پر پہلا انعام۔
2009ء بہترین ناول پر پہلا انعام
2008ء بہترین ناول پر پہلا انعام

ساتواں دعوۃ ایوارڈ 2007ء ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلّم'' پر پندرہ ہزار روپے کا ایوارڈ۔
مقالہ کہانی نویسی میں انعامات۔
2001ء۔تیسرا انعام 2004ء۔دوسرا انعام۔
2005ء۔ پہلا انعام 2009ء۔ پہلا انعام۔
دس روزہ ینگ رائٹرز کیمپ۔ 22 تا 31ء جولائی 1994ء

جولائی 1994ء میں جو مقالہ پڑھا، وہ یہ تھا:
بچوں کے ادب میں ناول کی اہمیت وافادیت ...
آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔
" صاحب صدر اور معزز سامعین :

السلام علیکم میرے مقالے کا عنوان ہے: بچوں کے ادب میں ناول کی اہمیت وافادیت ... کہانی سننے کا عمل ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے ... بہت چھوٹے بچے کو ماں سلانے کے لیے لوری سناتی ہے ... قدرے بڑا بچہ جب لوری سے نہیں سوتا تو ماں لوری کی جگہ کہانی کو دے دیتی ہے ... شاید ابتدا سے ہی انسان کہانی سنتا چلا آرہا ہے ...

کہانی کی مختلف صورتیں ہیں ... قصہ ، افسانہ ، ناول ، ڈراما، دنیا میں جب افسانہ ، ناول اور ڈرامے کا نام بھی نہیں تھا، قصہ اس وقت بھی سنا جاتا تھا ، سنایا جاتا تھا ... لیکن قصے میں ایک جمود ہوتا تھا ... اس جمود نے شاید لوگوں کو اکساہٹ میں مبتلا کیا ... اور اکساہٹ نے کہانی کو جدید صورتیں عطا کیں ... میرا موضوع ان صورتوں میں سے صرف ناول نگاری سے متعلق ہے ...

اس سے پہلے کہ میں بچوں کے ادب میں ناول نگاری پر بات کروں ... ناول نگاری کی تاریخ پر ایک مختصر سی نظر ڈالنا مناسب لگتا ہے ، اس لیے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے ...

ڈپٹی نذیر احمد غالباً اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے سب سے پہلا ناول مراۃ العروس لکھا ... گویا اردو ادب کی اس صنف کے بانی قرار پائے ... رتن ناتھ آزاد نے افسانہ آزاد لکھ کر شہرت حاصل کی ... سجاد حسین نے حاجی بغلول لکھ کر مزاحیہ ناول کی طرح ڈالی ... عبدالحکیم شرر نے تاریخی ناول لکھ کر ناول نگاری کو ایک نیا موڑ دیا ... مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا لکھا ... تو موضوعات کو مزید وسعت ملی ... منشی پریم چند نے ناول نگاری کے کام کو اور

آگے بڑھایا ... انسانوں کے استحصال اور ان کی مظلومیت کو اپنا موضوع بنایا ...

پھر شوکت تھانوی اور مرزا عظیم بیگ چغتائی میدان ادب میں اترے ... انہوں نے مزاحیہ ناول لکھے ... 1936ء میں ترقی پسند مصنفین کا آغاز ہوا... منشی پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدارت کی ...

کرشن چندر ، عصمت چغتائی، عزیز احمد ، شوکت صدیقی، ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے لیے اچھوتے وضوعات کا انتخاب کیا ... کرشن چندر کا ناول شکست، عصمت چغتائی کا ٹیڑھی کھیر اور ضدی ... عزیز احمد کا ناول گریز، ایسی بلندی ایسی پستی خصوصی نوعیت کے حامل ہیں ...شوکت صدیقی کا ناول خدا کی بستی ایک عمدہ ناول ہے ...

قیام پاکستان کے بعد ناول نگاروں کی ایک بہت بڑی تعداد نے 1947ء کے فسادات کو اپنا موضوع بنایا ... پھر تاریخی ناول لکھے گئے ... ان میں رئیس احمد جعفری ... ایم اسلم، رشید اختر ندوی، قیسی رامپوری، نسیم حجازی کے نام قابل ذکر ہیں۔نسیم حجازی کے ناولوں نے تو بہت شہرت حاصل کی ... قمر انبالوی اور اسلم راہی نے بھی نام کمایا ...

پھر خواتین ناول نگار بھی میدان میں اتریں۔قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی ، الطاف فاطمہ، اے آر خاتون، زبیدہ خاتون ، فاطمہ ثریا، اول دور کی ناول نگار خواتین ہیں ... ان سب نے عورتوں کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ...

دوسرے دور میں رضیہ بٹ، بشریٰ رحمٰن، بانو قدسیہ، فرخندہ لودھی کے نام قابل ذکر ہیں ... بیسویں صدی کے ممتاز ناول نگار، احسن فاروقی کا شام اودھ ، قرۃ العین حیدر کا آگ کا دریا ، شوکت صدیقی کا خدا کی بستی ، ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی، خدیجہ مستور کا آنگن، الطاف فاطمہ کا دستک نہ دو، عبداللہ حسین کا اداس نسلیں، راجندر سنگھ بیدی کا چادر میلی سی، نسیم حجازی کا شاہین اور خاک وخون

ناول نگاری کے اعتبار سے خاص اہمیت کے حامل ہیں ...

یہ تھی ناول نویسی کی مختصر سی تاریخ ... اب ذرا قصہ اور ناول میں فرق کا جائزہ لے لیا جائے ...

داستان ایک بیانیہ کیفیت ہے ، اس میں اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا...ڈرامائی کیفیت نہیں ہوتیں ... اس کا ماحول خالص تخیلی اور فضا طلسماتی ہے ... اس کے کردار زندگی سے قریب نہیں ہوتے جب کہ ناول کا ماحول اور فضا انسانی زندگی سے عبارت ہے ... اس کی کہانی بھی زندگی کی عکاس ہے ... کردار بھی انسان ہیں ... اور سب سے بڑی اور اہم بات جو قصے اور ناول میں امتیاز پیدا کرتی ہے... یہ کہ ناول کے تمام کردار متحرک ہوتے ہیں ... ہمارے دیکھے بھالے ہوتے ہیں ...

ناول کا ایک پلاٹ ہوتا ہے ... اس کی ایک کہانی ہوتی ہے ... ناول کے کردار اس کی کہانی کے گرد گھومتے ہیں ... مکالمے ادا کرتے ہیں ... ناول میں باقاعدہ منظر نامہ ہوتا ہے ... مرکزی خیال پر زور دیا جاتا ہے ... تجسس کو آخر تک برقرار رکھا جاتا ہے ... اس میں ایک رابطہ ہوتا ہے ... ایک تسلسل موجود ہوتا ہے ... پڑھنے والا ان تمام چیزوں کی رو میں بہہ جاتا ہے ... سب سے بڑھ کر یہ کہ کردار معاشرے کے ہی ہوتے ہیں ۔ جس طرح معاشرے میں اچھے برے ہر طرح کے کردار ہوتے ہیں ... اسی طرح ناول میں ہوتے ہیں ... ناول نگار ان کرداروں کی سیرتیں خوب اجاگر کرتا ہے ... اسی طرح انسان اچھے کرداروں سے محبت اور برے کرداروں سے نفرت محسوس کرتا ہے۔

گویا ناول کے کردار انسانوں کی ایک سچی تصویر پیش کرتے ہیں ... ناول کا ایک اہم ترین پہلو مکالمہ ہے ... کردار آپس میں بات چیت کرتے ہیں ... مکالموں کا انداز کردار کی پہچان بنتا ہے ... یوں بھی جذبات کی ترجمانی کے لیے مکالمے سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ... ڈرامائی تاثر پیدا کرنے میں بھی مکالمہ کردار ادا کرتا ہے ... ان تمام باتوں کے برعکس داستان ایک شخص کا بیان ہوتا ہے۔

اور اب بچوں کے ادب میں ناول کی اہمیت اور افادیت ... المیہ یہ ہے کہ مصنف حضرات نے بچوں کی طرف بہت کم توجہ دی ... ہم دیکھتے ہیں، بچوں کو پہلے پہل جب ناول کا نام بھی سامنے نہیں آیا ہو گا، جادوئی، جنوں، پریوں، شہزادوں شہزادیوں، چڑیلوں، بھوتوں وغیرہ کی کہانیاں سنائی جاتی تھیں ... ایسی کہانیاں لکھی جاتی ہیں ... بچے انھیں کہانیوں سے زیادہ روشناس تھے ...

لیکن جب ناول نویسی کا آغاز ہوا تو مصنفین نے جہاں بڑوں کے لیے بہت کچھ تحریر کیا، وہاں بچوں کے لیے بھی چند ناول لکھے۔

ان میں فرحت اللہ بیگ، منشی پریم چند، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، رتن ناتھ سرشار اور کرشن چندر جیسے نام سامنے آئے ہیں، لیکن ان ناولوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

بچوں کے رسائل میں کہانیاں ضرور شائع ہوتی ہیں، ان کے لیے خصوصیت سے ناولوں کا آغاز نہ ہو سکا وہ وہی ماورائی کی کہانیاں پڑھتے رہے... لیکن پھر آخر کار بچوں کے لیے میدان ہموار ہی ہو گیا... چند لکھنے والے میدان میں اترے۔

ان میں عزیز اثری، اے حمید، سلیم احمد صدیقی، جبار توقیر، یونس ادیب، ستار طاہر، آغا اشرف، مقبول جہانگیر، اختر رضوی، سعید لخت وغیرہ کے نام شامل ہیں ... اس وقت آپ کسی بک اسٹال پر چلے جائیں، بچوں کے ناول اپنی بہار دکھاتے نظر آئیں گے۔

اب افادیت اور اہمیت کی طرف آتا ہوں ... جو مقالے کا عنوان بھی ہے... ہمارے ملک میں بچوں کا ادب مختلف صورتوں میں شائع ہو رہا ہے ... بچوں کے ماہانہ رسائل اس میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں ... نمایاں نام تعلیم وتربیت، نونہال، جگنو، آنکھ مچولی، پھول اور دوست وغیرہ ہیں ... ان کے علاوہ ملک بھر سے شائع ہونے والے اخبارات ہر ہفتے بچوں کے ایڈیشن شائع کرتے ہیں ... تیسرے

چھٹے اورینٹ دعوۃ ادبی ایوارڈ برائے سال ۲۰۱۰
اشتیاق احمد (جھنگ)
عزیز اثری ایوارڈ کے حقدار قرار پائے
کیٹگری
مصنف
عنوان
دوستی کا چور
صنف
بچوں کیلئے ناول
جیوری ممبران
ڈاکٹر رشید احمد
ڈاکٹر شاہد وقیع
عامر حسن
ڈائریکٹر دعوۃ اکیڈمی
چیف ایگزیکٹو اورینٹ ایڈورٹائزنگ

Nº 2273

Roll No. 25642

BOARD OF INTERMEDIATE & SECONDARY EDUCATION, LAHORE

SECONDARY SCHOOL *Examination* 1961

This is to certify that Ishtiaq Ahmad,
son/daughter of Mushtaq Ahmad,
of the Islamia High School, Jhang Sadar,
passed the Secondary School *Examination of the Board of Intermediate and Secondary Education, Lahore, in the* First *Division.*

The candidate passed in the following Subjects:

1. *English*
2. Social Studies
3. Mathematics
4. Physics & Chemistry
5. Arabic

His/Her date of birth as recorded in the admission form is 5.6.1944
(Fifth June, *one thousand nine hundred and* forty-four)

Deputy Controller (Records)
or Secretary,
Board of Intermediate & Secondary Education, Lahore.

CP—1—4000—23-5-82

استعمال کرتے ہوئے اشتیاق احمد صاحب نے بحالت مجبوری سگریٹ کا خوانچہ لگایا

National Book Foundation
Certificate of Commendation
Awarded to
اشتیاق احمد
In recognition of his/her academic contribution producing
outstanding and creative works entitled
جیتی جاگتی تصویر
Under the project
"Promotion of Children Literature"
Managing Director
National Book Foundation

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ پاکستان کے معروف ادیب
جناب اشتیاق احمد، ملک کے رسائل و جرائد میں ''عبداللہ فارانی''
کے قلمی نام سے بھی لکھتے ہیں۔

۱۵/۹/۰۷ء

(ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر)

انچارج، شعبہ بچوں کا ادب

Head
Children Literature Department
Da'wah Academy, P.O. Box 1485,
International Islamic University, Islamabad.

دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فون ۳-۸۵۸۶۴ ،۸۵۳۱۹۵ پوسٹ بکس ۱۴۸۵، ٹیلیکس: آئی آئی یو پی کے ۵۴۰۶۸ فیکس ۲۶۱۶۳۸، تار کا پتہ: الجامعہ

نمبر پر کہانیوں کی چھوٹی بڑی کتابیں ہیں اور چوتھے نمبر پر ناول آتے ہیں ...

رسائل جن کے نام اوپر آچکے ہیں ... بچوں میں بہت مقبول ہیں، ذوق شوق سے پڑھے جاتے ہیں ... اخبارات کے ایڈیشن صرف چھوٹے بچے پسند کرتے ہیں ... کیونکہ ان میں زیادہ حصہ تصاویر کا ہوتا ہے ... تصاویر بھی رسائل کا حصہ ہیں مگر کسی تناسب میں اخبارات کے ایڈیشن میں ادب کم اور تصاویر زیادہ نظر آتی ہیں ... کہانیوں کی کتابوں میں زیادہ تر کہانیاں فرسودہ ہوتی ہیں ... ان کو بھی وہ کم عمر بچے پڑھتے نظر آتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میدان میں ناول کیا کردار ادا کر رہے ہیں جب کہ سرورق سے قطع نظر ان میں اندر کوئی تصویر عام طور پر نہیں ہوتی ... رسائل کے صفحات زیادہ اور رنگین تصاویر سے مزین ، گٹ اپ ، لے آؤٹ ، چمک دمک اور آب و تاب میں ناولوں کو بہت پیچھے چھوڑتے نظر آتے ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود ناول کیوں اس قدر ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں ... موازنہ کرنے پر یہ نقطہ سامنے آتا ہے ...

ناول ایک مسلسل رواں دواں طویل کہانی ہوتی ہے ... اس کے کردار آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ... بلکہ لکھنے والے کی گرفت اگر مضبوط ہے، تو اکثر اوقات تو قاری خود ان کرداروں کے ساتھ متحرک محسوس کرتا ہے... ناول کے پسندیدہ کردار کی جگہ خود کو عمل پیرا محسوس کرتا ہے اور اس کا جوش اور جذبہ دینا ہوتا ہے۔''

دعوۃ اکیڈمی میں اس پروگرام کے بعد، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی نے کراچی میں دو روزہ سیمینار منعقد کیا۔ یہ سیمینار کراچی کے ریجنٹ ہوٹل میں ہوا۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں تمام بڑے اور معروف لوگوں نے اس میں شرکت کی۔ اس پروگرام میں میرے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ اس شام میں محمود شام صاحب ، مسعود احمد برکاتی، ڈاکٹر طاہر مسعود، سلیم مغل اختر عباس اور ڈاکٹر محمد افتخار

کھوکھر وغیرہ نے شرکت کی۔ سلیم مغل نے تجویز پیش کی تھی کہ اس پروگرام میں اشتیاق احمد کے تمام ناول رکھے جائیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ تمام ناول کہاں سے لائے جائیں ... میرے پاس تو تھے نہیں ... پھر لاہور یا جھنگ سے کراچی لے کر جانا الگ مسئلہ تھا، اس سلسلے میں میں نے فاروق احمد صاحب سے بات کی ... انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس تمام ناول موجود ہیں ...ان سے درخواست کی گئی تو وہ اپنی کار میں تمام ناول بھر کر لے آئے ... اب یہ ناول ریجنٹ ہوٹل کے اس ہال میں رکھے گئے۔ اس وقت تک ناولوں کی تعداد غالباً چھ سو ہوچکی تھی...لوگ حیرت زدہ انداز میں ناولوں کو دیکھنے لگے... ان میں چھوٹے بڑے تمام ناول تھے... سلیم مغل نے ایسے میں کہا: ''ان ناولوں کے ساتھ اشتیاق احمد صاحب کی تصویریں کھینچی جائیں، ہم یہ تصاویر گنز بک آف ورلڈ کو بھیجیں گے۔''

اب تمام کتب کو تین ستونوں کی صورت میں رکھا گیا ... یہ تینوں قطاریں میرے قد سے اونچی ہوگئیں ... اس کی تصاویر اتاری گئیں... پھر تصاویر کا سلسلہ شروع ہوا... غرض خوب رنگا رنگ پروگرام رہا۔

کچھ مدت بعد ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر صاحب نے دعوت دی کہ وہ بچوں کے تمام مشہور لکھنے والوں کو آزاد کشمیر کی سیر کرانے لے جا رہے ہیں، آپ بھی چلیں ... میں نے ہامی بھر لی۔ اس پروگرام میں بھی سلیم مغل، ڈاکٹر طاہر مسعود، مسعود احمد برکاتی وغیرہ شامل تھے... سفر بہت خوف ناک تھا۔ پہلے پہاڑ کے اوپر ہی اوپر جانا پڑا۔ پھر پہاڑ سے نیچے کی طرف سفر شروع ہوا۔ غرض دونوں مرتبہ خوف طاری رہا ... واپسی کے سفر میں طاہر مسعود مجھ سے پوچھنے لگے: ''اشتیاق احمد! آپ کا اس وقت تک سب سے زیادہ فروخت ہونے والا ناول کون سا ہے ...اور وہ کتنی تعداد میں فروخت ہوا ہے۔''

میں نے کہا: ''جزیرے کا سمندر ... تیرہ ہزار شائع ہوا تھا۔''

'' تیرہ ہزار ... جھوٹ تو نہیں بول رہے ... '' طاہر مسعود صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

'' اس قدر خوفناک سفر میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس پر سب نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

دعوۃ اکیڈمی میں اس قسم کے اور بہت پروگرام ہوئے ...میں ان میں شرکت کرتا رہا ... ان سب پروگراموں کا اہتمام ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر صاحب کرتے رہے ہیں... حال ہی میں وہ ریٹائر ہو گئے ہیں ... چند دن پہلے ہی انہوں نے اپنی ریٹائر منٹ کی خبر سنائی تو یہ تمام پروگرام یاد آتے چلے گئے۔

7اگست 85 کے دن بچوں کا جنگ کی سالانہ تقریب میں مجھے بطور مہمانِ خصوصی بلایا گیا۔ اس روز بھی بے شمار قارئین نے سوالات کیے اور میں ان سوالات کے جوابات دیتا رہا ...بعد میں انعامات میرے ہاتھوں تقسیم کرائے گئے۔ اس تقریب کی تمام تصاویر اور تفصیل روزنامہ جنگ 22اگست 1985 میں شائع کی گئیں۔

☆☆☆

انہی دنوں دو نوجوان راولپنڈی سے ملاقات کے لئے آئے۔

میں نے انہیں احترام سے بٹھایا ... اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا ... وہ خود ہی کہنے لگے:

'' راولپنڈی میں آپ نے جس ڈیلر کو کتابیں دینا شروع کی ہیں ... وہ آپ کو یقیناً تنگ کرتا ہوگا ... اس کا طریقہ کار یہی ہے ... ہماری کمیٹی چوک اقبال روڈ پر ایک چھوٹی سی دکان ہے ... دراصل وہ آنہ لائبریری ہے ... یعنی ہم ناول کرائے پر دیتے ہیں ... ہمارے والد صاحب جلدساز ہیں ... دکان پر باہر ہی بیٹھ کر

وہ جلدیں بناتے ہیں ... آج کل جو ڈائجسٹ آرہے ہیں ہم وہ بھی فروخت بھی کرتے ہیں ... آپ کی کتابیں بھی ہم آپ کے ڈیلر سے اٹھاتے ہیں ... اگر آپ راولپنڈی کی ایجنسی ہمیں دے دیں تو ہم ان شاء اللہ بہت جلد کافی تعداد میں کتابیں اٹھانے لگیں گے ... اور آپ کو ہم سے ان شاء اللہ کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی ... بس ہماری ایک درخواست ہے۔''

''اور وہ کیا ...'' میں نے پوچھا۔

''ہم نصف رقم آپ کو ایڈوانس دے دیا کریں گے ... یعنی اپنے آرڈر کی ... اور نصف مال وصول ہوتے ہی بھیج دیا کریں گے۔''

میں نے ان کی طرف دیکھا ... دونوں بھلے نوجوان نظر آئے ... انہوں نے دکان کا نام اشرف بک ایجنسی بتایا تھا ... آخر میں نے انہیں ایجنسی دے دی۔

انہوں نے معاہدے کے مطابق نصف رقم ایڈوانس ارسال کر دی ... کتابیں ملیں تو بقیہ بل بھی بھیج دیا ... دوسرے ماہ کتابوں کی تعداد بھی بڑھا دی ... اس طرح اشرف بک ایجنسی ہماری کرابوں کے اعتبار سے ایک مشہور ادارہ بن گیا ... وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اور میرے تعلقات بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے ... کتابوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی چلی گئی ... ان حضرات نے بھی میرے ساتھ ایک شام منائی ... اس میں انہوں نے اس وقت کے ایک وزیر کو بھی بلایا ... اس شام کی روداد کسی ناول کے آخر میں شائع ہوئی تھی ... یہ بتانا بھول گیا ... دونوں بھائیوں کے نام فیاض اور اعجاز تھے۔

اس طرح ایک روز سائیکل پر ایک صاحب آئے ... ان کی صورت جانی پہچانی لگی ...میں نے چھوٹتے ہی کہا :

”شاید میں آپ کو کہیں دیکھ چکا ہوں۔“

وہ یہ سن کر مسکرائے ... پھر کہنے لگے:

” ہفت روزہ صحافت میں آپ پروف ریڈنگ کیا کرتے تھے ...“

” ہاں ہاں ...“ میں نے کہا۔

”میں ضیا شاہد صاحب کے اس رسالے کا لاہور ایجنسی ہولڈر تھا۔“

”اوہ ہاں ! اب یاد آ گیا ... آپ تو وہاں روز ہی آتے تھے۔“

” جب سے صحافت بند ہوا ہے ... میرے پاس کوئی رسالہ نہیں ہے ... اخبار مارکیٹ میں میرا دفتر ہے ... اگر آپ اپنے ناولوں کی ایجنسی لاہور کے لئے مجھے دے دیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی ... میں آپ کو بل پیشگی دیا کروں گا ... یعنی جتنی کتاب اٹھاؤں گا ... ساتھ ہی رقم بھی ادا کر دیا کروں گا۔“

اس پر میں نے کہا؛

” اردو بازار میں تو محبوب بک ڈپو کو ناول دیتا ہوں۔“

” چلیے ! اردو بازار کی حد تک آپ انہیں دیتے رہیے ... باقی شہر کے لیے مجھے دے دیں ... کیونکہ بہرحال اردو بازار میں دوسرے شہروں کے گاہک بھی آتے ہیں۔“

” اچھی بات ہے ... یونہی سہی۔“

” اس طرح رفیق مغل کو لاہور کی ایجنسی دے دی گئی ... وہ بیچارے سارے دنِ سائیکل پر پھرِ کر ناول اسٹالوں پر پہنچاتے اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے واقعی ناولوں کے لئے بہت محنت کی ... دور دراز کے اسٹالوں تک ناول پہنچائے۔ اس طرح چند ماہ گزر گئے ... ایک روز وہ کہنے لگے:

'' اشتیاق صاحب ! آپ سے ایک درخواست ہے ... اگر آپ مان لیں تو اس میں میرا تو خیر فائدہ ہے ہی ... آپ کو بھی فائدہ پہنچے گا۔''

'' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ...''

'' میرے پاس بائیسکل ہے ... چلا چلا کر تھک جاتا ہوں ... اسٹال بہت دور دور ہیں ... آپ خود دیکھ لیں ... یہاں سے گلبرگ تک جانا پڑتا ہے ... اسی طرح کینٹ تک جاتا ہوں ... اگر آپ مجھے ایک موٹرسائیکل دلوا دیں تو بہت ہی اچھا ہوجائے گا ... میں اس کی قیمت آپ کو ایک ایک ہزار روپے ماہوار قسطوں میں ادا کردوں گا۔''

'' موٹرسائیکل کتنے کی آتی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

'' ہنڈا 70 آج کل نئی اٹھارہ ہزار کی مل جاتی ہے ...''

'' اچھی بات ہے ... آپ اٹھارہ ہزار روپے لے لیں اور موٹرسائیکل خرید لیں ... ایک ہزار روپے ماہوار اتارتے رہیں۔''

وہ خوش ہوگئے ... اب وہ موٹرسائیکل پر کتابیں پورے شہر میں پہنچانے لگے ... اس طرح واقعی کتابوں کی نکاسی بہت بڑھ گئی ... وہ دھڑادھڑ کتابیں فروخت کر رہے تھے ... اس طرح واقعی مجھے بھی بہت فائدہ پہنچا ... میں جس روز لاہور میں ہوتا، اس روز رفیق مغل، سعید نامدار، طاہر ایس ملک، دفتر کے تینوں ملازم اور ملاقات کیلئے آنے والے حضرات سب مل کر وہیں صحن میں کھانا کھاتے ، ظہر کی نماز باجماعت ادا کرتے۔

یہ معمول سالہاسال رہا ... یہاں تک کہ حالات نے پلٹا کھایا۔

☆☆☆☆☆

O

شدید سردی کے دن تھے اور مہینا تھا دسمبر کا ... اور یہ بات ہے، 1985ء کی...رات کے ساڑھے تین بجے میرے گھر کے دروازے پر زور دار دستک ہوئی ...

یہ بتانا بھول گیا کہ یہ وہ مکان نہیں تھا ...جس میں میں نے والد صاحب کے ساتھ زندگی کے دن گزارے تھے ... بلکہ مکان میں جگہ کم پڑنے لگی تھی تو والد صاحب نے کہا:

''بیٹا ... یہ ساتھ والا مکان بک رہا ہے ... یہ خرید لو ... تمہارے بھی بچے بڑے ہو رہے ہیں... اور باقی بھائیوں کے بھی ... لہٰذا مکان چھوٹا پڑ جائے گا ... اس سے پہلے ہی ساتھ والا مکان خرید لو ... اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اکٹھے ہی رہیں گے۔''

''جی اچھا۔''

وہ مکان میں نے ایک لاکھ میں خریدا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس میں رہائش اختیار کرلی ... درمیان میں ایک دروازہ کھول لیا گیا ... اس کے ذریعے ہم پرانے مکان میں آجا سکتے تھے ... ہاں تو اس مکان کے دروازے کو رات کے ساڑھے تین بجے زور سے کھٹکھٹایا گیا ...سب سے پہلے میرے بیٹے نوید کی آنکھ کھلی ... وہ اس وقت میٹرک میں تھا ... کچھ مدت پہلے جوبازار میں دکان خریدی تھی، اسے ہم ہومیو پیتھک اسٹور اور کلینک بنا چکے تھے اور میں دن میں وہاں

بیٹھ کر مریضوں کو دیکھتا تھا ... یعنی ان دنوں میں یہ کام بھی کر رہا تھا ... یہ میرا شوق تھا ... شوقیہ ہی یہ کام سیکھا تھا ...

نوید نے دروازے پر جا کر پوچھا: ''کون ہے۔''

باہر سے جواب ملا: ''پولیس دروازہ کھول دو ... ورنہ توڑ دیں گے۔''

نوید گھبرا گیا ... اس نے واپس آکر مجھے جگایا ... اور بتایا۔

''باہر پولیس آئی ہے ... وہ کہہ رہے ہیں ... دروازہ کھولو ...ورنہ ہم توڑ دیں گے۔''

''وہ کیوں دروازہ توڑ دیں گے ... ہم نے کیا کیا ہے ... چلو ... میں دیکھتا ہوں۔''

اس وقت تک گھر کے تمام افراد جاگ چکے تھے ... میں نے دروازہ کھول دیا اور پوچھا:

''ہاں جی! کیا بات ہے۔''

باہر گلی میں آٹھ دس پولیس مین کھڑے تھے ... عین دروازے پر دو تھے ان میں سے ایک نے کہا۔

''تمھارا نام نوید ہے۔''

''میرا نام نوید نہیں ...نوید یہ ہے میرا بیٹا ... بات کیا ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا ... فوراً نوید کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور اسے باہر کھینچ لیا...

''ارے ارے ... یہ کیا کر رہے ہیں ... کیا کیا ہے اس نے۔''

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا ... نوید کو گھسیٹتے ہوئے لے چلے... وہ اس وقت تھا بھی ایک قمیص میں ... اور شدید سردی کے دن تھے ... میں نے بوکھلا کر ایک گرم چادر اٹھائی اور ان کے پیچھے دوڑا ...ساتھ ہی چلاّیا ...

''اسے یہ چادر تو لے لینے دو ... شدید سردی ہے۔''

میں نے تیز دوڑ کر چادر نوید کو تھما دی ... پھر بولا ۔
''کچھ بتائیں تو۔''

انہوں نے کچھ نہ بتایا اور گلی سے نکل کر باہر سڑک پر آگئے ... وہاں پولیس کی گاڑی کھڑی تھی ... اور باہر کافی پولیس موجود تھی ...یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بہت بڑے مجرم کو پکڑنے کے لیے آئے ہوئے ہیں ... میرے دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے نوید کو گاڑی میں ڈالا اور لے گئے ...

مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا ... گھر آیا تو سب کے سب رو رہے تھے ... میں نے ان سے کچھ نہ کہا ... کہتا کیا ... میں تو خود رو رہا تھا ... گھر میں اس وقت فون لگ چکا تھا ... میں نے اس سے ایڈیشنل کمشنر صاحب کے نمبر ملائے... اس وقت میاں کمال الدین صاحب ایڈیشنل کمشنر تھے اور مجھے اس لحاظ سے اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے بچے میرے ناول پڑھتے تھے ... میں کئی بار ان کی کوٹھی پر جا کر ان سے ملاقات بھی کر چکا تھا اور وہ مجھے بہت اچھا خیال کرتے تھے ... ملتے بھی اچھی طرح تھے ...

دوسری طرف فون کی گھنٹی بجتی رہی ... لیکن کسی نے فون کا ریسیور نہ اٹھایا ... انہوں نے غالباً پن نکالی ہوئی تھی ... یہ بات بھی مجھے اسی روز معلوم ہوئی کہ آفیسر حضرات رات کو فون نہیں سنتے... بند رکھتے ہیں ...اب فون پر کوشش فضول تھی ... میں نے سوچا صبح ہوتے ہی خود ان کے پاس جاؤں گا :..

وہ چار گھنٹے ہم نے روتے گزارے ... صبح سب نے فجر کی نماز ادا کی اور میں کچھ دیر بعد گاڑی میں میاں صاحب کی طرف روانہ ہوا ... یہ بھی خیال تھا کہ وہ ابھی سو رہے ہوں گے... ویسے میاں صاحب نماز پڑھتے تھے ... اس لیے یہ خیال بھی تھا کہ سوتے نہیں ملیں گے ... بہرحال غرض مند دیوانہ ... میں نے ان کے دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجائی ...ملازم نے دروازہ کھولا... وہ مجھے جانتا تھا ... اسے دیکھتے ہی میں نے کہا ۔

''میرے ساتھ ایک مسئلہ پیش آ گیا ہے ... مجھے میاں صاحب سے فوری ملنا ہے۔''

''آپ اندر آ جائیں... میں انھیں اطلاع دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

اس پر کچھ حوصلہ ہوا ... کہ چلو جاگ رہے ہیں ... میں گراؤنڈ میں بچھی کرسیوں کی طرف بڑھ گیا ... ملازم اندر چلا گیا ... جلد ہی میاں صاحب آ گئے آتے ہی بولے:

''السلام علیکم ... خیر تو ہے اشتیاق صاحب۔''

''نہیں سر ... خیر نہیں... رات ساڑھے تین بجے پولیس میرے گھر سے میرے بیٹے نوید کو پکڑ کر لے گئی۔''

''کیوں لے گئی پولیس ... '' انہوں نے حیران ہوکر کہا۔

''جی انہوں نے کچھ نہیں بتایا ... میں نے بار بار پوچھا ... لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا...''

''اچھی بات ہے ... آپ میرے پاس آٹھ بجے آئیں ...میں اس وقت تک معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''جی اچھا۔''

میں گھر آیا تو وہاں موت کا سناٹا تھا ... سب آنسو بہا رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی بولے۔ ''کیا رہا۔''

''اے سی صاحب سے ملاقات ہوگئی ہے ... انھوں نے آٹھ بجے بلایا ہے ... اور کہا ہے ... وہ معلوم کرکے بتائیں گے ... نوید کہاں ہے اور اسے کیوں پکڑا گیا ہے ...''

''ہوں۔'' سب چپ ہو گئے ... اس روز ہم میں سے کسی کا بھی ناشتا کرنے کو جی نہ چاہا ... میں ساڑھے سات بجے ہی گھر سے نکل گیا اور آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب میں نے میاں کمال الدین صاحب کی کوٹھی کی گھنٹی

بجادی ... ملازم نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر لے گیا ... میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ میاں صاحب آ گئے ... میں اٹھ کھڑا ہوا ...وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے ...ان کے چہرے پر گہرے فکر کے آثار تھے ... کہنے لگے :

'' اشتیاق صاحب ! آپ کے بیٹے کو صادق گنجی قتل کیس میں گرفتار کیا گیا ہے اور اسے اسی وقت لاہور لے گئے ہیں ... لاہور سے ہی ٹیم آئی تھی ... یہاں کی پولیس نے تو بس گرفتاری کے سلسلے میں مدد کی ہے ... اور گرفتار کر کے ان کے حوالے کر دیا ہے ۔''

میری تو جان نکل گئی ... مردہ آواز میں، میں نے کہا ۔

'' صادق گنجی کیس ... سر بھلا ہمارا اس معاملے سے کیا تعلق ۔''

'' یہ تو بعد کی بات ہے ... پہلے تو آپ یہ بتائیں ... آپ کے پاس لاہور میں کوئی بڑی سفارش ہے ... ''

'' روزنامہ پاکستان کے چیف ایڈیٹر ضیاء شاہد صاحب سے میری اچھی علیک سلیک ہے ... یہ آپ دیکھ لیں کہ وہ یہ کام کر سکیں گے یا نہیں۔''

'' وہ یہ کام کرا لیں گے ... اخبارات کے چیف ایڈیٹر کی بہت پہنچ ہوتی ہے ... اگر کامیابی نہ ہو سکے تو پھر آپ مجھے فون کیجیے گا۔''

'' جی اچھا۔''

'' آپ اسی وقت لاہور چلے جائیں ... آپ کے بچے کو اچھرہ تھانے میں رکھا گیا ہے۔''

'' آپ کا یہ بہت احسان ہے مجھ پر ... ورنہ ہمیں تو پتا بھی نہ چلتا کہ بچہ ہے کہاں۔''

'' آپ بس لاہور پہنچنے کی کریں ۔''

میں گھر آیا ... ساری تفصیل گھر والوں کو سنائی تو ان کے رنگ بالکل فق ہو گئے ... کسی قتل کیس کے بارے میں تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ... اور نہ

اس معاملے سے ہمارا کوئی تعلق تھا۔

میں نے دو دن پہلے اخبار میں صادق گنجی کے قتل کی خبر پڑھی تھی ... صادق گنجی پاکستان میں ایران کا سفیر تھا ... وہ اس روز شام کو کسی ہوٹل سے چائے وغیرہ پی کر باہر نکل رہا تھا کہ اسے کسی نے گولی مار دی ...ایک موٹر سائیکل کو وہاں سے بلا کی رفتار سے جاتے ہوئے دیکھا گیا ... لیکن اس وقت کوئی اس موٹر سائیکل کا تعاقب بھی نہ کر سکا ... دونوں موٹر سائیکل سوار اڑے جا رہے تھے ... مال روڈ سے وہ کوئنز روڈ کی طرف مڑے تھے ... ان میں سے پچھلے کے پاس کلاشن کوف تھی ... اللہ کا حکم کہ اس کا ٹریگر دب گیا اور کلاشن کوف کی گولی پچھلے سوار کا جبڑہ توڑتی ہوئی نکل گئی ... موٹر سائیکل گر گئی ... دوسرا نوجوان وہاں سے رفو چکر ہو گیا ... زخمی کو لوگوں نے ہسپتال پہنچا دیا ... اس وقت تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دونوں صادق گنجی کو قتل کر کے بھاگے ہیں ...ادھر پولیس صادق گنجی کے قتل کے سلسلے میں سرگرداں تھی ... ایک سفیر کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی ... ایرانی حکومت کو بھی خبر مل چکی تھی اور ایرنی صدر بہت طیش میں تھے... وہ بار بار حکمرانوں کو فون کر رہے تھے ... اس لیے انتظامیہ اس وقت سخت مشکل میں تھی...

یہ تمام تفصیلات ہمیں اخبارات سے معلوم ہوئی تھیں ... اور پھر پولیس کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئنز روڈ پر زخمی حالت میں ملنے والا حق نواز نامی شخص ہی صادق گنجی کا قاتل ہے ... اس کے ذریعے اس کے تین ساتھیوں کو بھی گرفتار کرلیا گیا ... ان چاروں کو اچھرہ تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا ... یہاں سے ایک ٹیم جھنگ بھیجی گئی تھی ... جو میرے بیٹے کو گرفتار کر کے لے آئی تھی ...

اب آپ خود سوچیں ... اس معاملے سے ہمارا تو دور کا بھی تعلق نہیں تھا ... پھر میرے بیٹے کو کیوں گرفتار کیا گیا تھا ... یہ بعد میں معلوم ہوا ...

میں نے چھوٹے بھائی آفتاب احمد کو ساتھ لیا اور لاہور پہنچ گیا ... روانہ

ہونے سے پہلے میں نے رفیق مغل نیوز ایجنسی کے مالک رفیق مغل کو فون کر دیا تھا ... کیونکہ وہ اس وقت ضیاء شاہد کے خاص آدمی بن چکے تھے ... انھیں ہمارے لاہور پہنچنے سے پہلے سارے حالات بتا سکتے تھے اور فوری ملاقات کرا سکتے تھے... اس لیے میں نے انھیں چلنے سے پہلے فون کر دیا تھا ... اور انہوں نے جواب میں کہا تھا: ''ٹھیک ہے ... آپ آجائیں۔''

ہم لاہور پہنچے ... رفیق مغل میرے ناولوں کے لاہور کے ڈیلر تھے ... میں نے رفیق مغل کو فون کیا: '' میں لاہور پہنچ گیا ہوں ... اور روزنامہ پاکستان کے دفتر آرہا ہوں ... آپ بھی وہاں پہنچ جائیں۔''

انہوں نے کہا: ''ٹھیک ہے ... آپ آجائیں۔''

میں نے آفتاب کو تو گھر میں ہی چھوڑ دیا ... کیونکہ ضیاء شاہد سے ملاقات کے سلسلے میں اس کی ضرورت نہیں تھی ...اور خود روزنامہ پاکستان پہنچ گیا ... اس زمانے میں موبائل تو شروع نہیں ہوئے تھے ... وہاں جب رفیق مغل نظر نہ آئے تو پبلک فون بوتھ سے انھیں فون کیا ... انہوں نے کہا۔

'' بس میں تھوڑی دیر تک پہنچ رہا ہوں۔''

مجھ سے تو ایک ایک پل نہیں گزر رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچے ہوئے ہوں گے ... لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا ... مجھے رہ رہ کر رفیق مغل صاحب پر غصّہ آنے لگا ... انتظار کرنا پہاڑ سر کرنے سے بھی مشکل محسوس ہو رہا تھا ... آخر خدا خدا کرکے کوئی ایک گھنٹے بعد رفیق مغل آتے نظر آئے ... میں نے شکایت بھرے لہجے میں ان سے کہا۔

'' آپ نے بہت دیر لگائی ... یہ تو سوچ لیتے کہ میں کس قدر پریشان ہوں گا۔''

'' بس کیا بتاؤں ... آپ آئیں میرے ساتھ۔''

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور لے چلے اندر کی طرف ... جلد ہی ہم

ضیاء شاہد کے دفتر میں داخل ہوئے ... وہ اندر ایک لیڈی رپورٹر پر برس رہے تھے، اس کی نالائقیوں پر سیخ پا ہور ہے تھے... ہمیں دیکھ کر اس سے بولے ...

''جاؤ ... چلی جاؤ ...'' یہ الفاظ انہوں نے انتہائی طیش میں کہے تھے ...میں یہ دیکھ کر فکر مند ہو گیا ... کہ اس حالت میں یہ ہماری کیا بات سنیں گے ... لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا ... انہوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا ...

''کیا حال ہے اشتیاق بھائی۔''

''آپ کو معلوم نہیں ... مغل صاحب نے آپ کو بتایا نہیں ابھی تک۔''

''کیا ہوا ... خیر تو ہے۔'' انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

اس کا مطلب تھا، رفیق مغل انھیں ابھی تک کچھ نہیں بتا سکے... مجھے ایک بار پھر ان پر غصہ آ گیا ... لیکن وہ وقت غصّے کا تو تھا ہی نہیں ... اب میں نے ضیاء شاہد صاحب سے کہا: ''پولیس میرے بیٹے کو پکڑ کر لاہور لائی ہے۔''

''ارے ... وہ کیوں۔''

''میں نے جھنگ میں اپنے طور پر معلوم کرایا ہے کہ ... صادق گنجی کیس میں اسے گرفتار کیا گیا ہے۔''

''ارے باپ رے۔'' انہوں نے بوکھلا کر کہا۔

''لیکن ضیاء شاہد صاحب ... میرے بیٹے کا اس معاملے سے دور کا بھی تعلق نہیں ... یہ میں آپ کو گارنٹی سے کہتا ہوں ... پوری طرح ذمّے دار ہوں میں اس بات کا۔''

''اچھا دیکھتے ہیں۔''

اب انہوں نے اپنے ماتحت سے کہا۔ ''رانا مقبول کا نمبر ملاؤ۔''

وہ دور نواز شریف کا دور تھا ... اور رانا مقبول ان دنوں لاہور کے ایس ایس پی تھے ... اور یہ وہی رانا مقبول ہیں ... کہ جب پرویز مشرف نے نواز شریف حکومت کا تختہ الٹا تھا ... تو ان کے ساتھ رانا مقبول صاحب کو بھی قید کیا

گیا تھا... کیونکہ وہ اس وقت آئی جی بن چکے تھے ...

ماتحت نے بار بار رانا مقبول صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ... لیکن کامیابی نہ ہوسکی ... چندلمحوں تک ضیاء شاہد نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سوچا ... آخر انہوں نے انٹرکام پر کسی سے کہا۔'' ذرا آپ اوپر آئیں۔''

انہوں نے ایک کرائم رپورٹر کو بلایا تھا ... جب وہ آگئے تو انہوں نے میرا تعارف ان سے کرایا اور بولے۔'' آپ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں ... اور رانا مقبول صاحب سے برابر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر تے رہیں ... رابطہ ہو جائے تو ان کی بات مجھ سے کرائیں، ٹھیک!''

'' بہت بہتر سر۔''

کرائم رپورٹر کا نام میں اس وقت بھول گیا ... وہ بہت اچھے آدمی تھے ... اپنے دفتر میں آکر وہ کوشش کرتے رہے لیکن رابطہ نہ ہو سکا ... آخر تنگ آکر انہوں نے کہا۔''آپ مجھے بتائیں ... بات کیا ہے۔''

میں نے انہیں ساری تفصیل سنا دی ... انہوں نے فوراً کہا۔

'' آیئے میرے ساتھ ! میں آپ کو ایک اور آدمی کے پاس لے چلتا ہوں ... وہ آپ کا کام کرا دیں گے ۔''

اس وقت مجھے مایوسی ہوئی کہ ضیاء شاہد نے مجھے ان کے حوالے کر دیا اور یہ کسی اور کے پاس لے جارہے ہیں ...اس طرح بھلا کیسے کام بن سکے گا ...لیکن میں اس وقت کیا کر سکتا تھا ... ان کے ساتھ چل پڑا ... ان کے پاس موٹر سائیکل تھی ... انہوں نے مجھے اپنے پیچھے بٹھایا ... ضلع کچہری کے ساتھ پولیس کا ایک دفتر ہے ... وہ مجھے اس میں لے آئے اور ایک دفتر میں داخل ہوئے ... وہاں ایک صاحب بیٹھے تھے ... دوتین ملاقاتی بھی موجود تھے ... وہ ان سے باتیں کر رہے تھے ... کرائم رپورٹر پر نظر پڑتے ہی ان کا نام لے کر کہنے لگے ...

'' آیئے آیئے ...''

اندر داخل ہوتے ہی کرائم رپورٹر نے ان صاحب سے کہا۔
'' آغا صاحب !ضیاء شاہد صاحب نے انھیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔''
''ضیاء شاہد نے ... خیریت تو ہے۔'' انھوں نے کہا۔
میری کہانی پڑھنے والے میرے قارئین ... اب اس مقام پر دیکھیے ... تقدیر کیا کام دکھاتی ہے ... کیا بات سامنے آتی ہے ... مجھے ساتھ لانے والے کرائم رپورٹر صاحب نے ان سے کہا۔''یہ اشتیاق احمد ہیں ... ناول نگار۔''
ابھی وہ یہاں تک کہہ پائے تھے کہ وہ آفیسر بول اٹھے:
'' وہی اشتیاق احمد تو نہیں ... جو محمود، فاروق اور فرزانہ کے ناول لکھتے ہیں۔''
سچ پوچھیے تو اس وقت ان کے منہ سے یہ جملہ مجھے ایسا لگا جیسے... میں اپنی کیفیت بتا ہی نہیں سکتا ... کہ کیا تھی ... ادھر کرائم رپورٹر صاحب کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کیا لکھتا ہوں ... ضیاء شاہد صاحب نے جو انھیں بتایا تھا ... وہی انھوں نے آگے کہہ دیا ... اب میں نے سوچا، یہ تو کچھ بتا نہیں پائیں گے ... لہٰذا مجھے ہی منہ کھولنا چاہیے ...چنانچہ فوراً بولا:
'' جی ہاں ! میں وہی اشتیاق احمد ہوں۔''
اب وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے ... گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور کہنے:
'' بھئی واہ! یہ تو بہت محبِّ وطن ہیں ... غضب کے ناول لکھتے ہیں۔''
یہ سن کر میرا حوصلہ بڑھ گیا ... ادھر کرائم رپورٹر صاحب نے انہیں بتایا:
'' لیکن یہ بے چارے اس وقت بہت پریشانی میں مبتلا ہیں ... پولیس ان کے بیٹے کو گرفتار کر کے لاہور لائی ہے اور وہ اس وقت تھانہ اچھرہ میں ہے۔''
'' کیا مطلب ... پولیس نے بھلاکس سلسلے میں گرفتار کیا ہے ان کے بیٹے کو۔'' ان آفیسر نے پوچھا... جلد ہی بات چیت کے دوران ان کا نام معلوم ہو گیا ... وہ آغا اسلم تھے۔

'' انھیں کچھ معلوم نہیں ۔''

'' میں پتا کرتا ہوں ۔''

انہوں نے فون کا ریسیور اٹھایا ... اور اچھرہ تھانے کا نمبر ڈائل کیا ... سلسلہ ملنے پر وہ بولے۔

'' شفقات صاحب ! آغا اسلم بات کر رہا ہوں ... کیا آپ نے جھنگ کے کسی نوجوان کو گرفتار کر ایا ہے اور وہ اس وقت آپ کے تھانے میں ہے۔''

اب وہ دوسری طرف کی بات سننے لگے ... سنتے رہے ... آخر ریسیور رکھ کر میری طرف متوجہ ہوئے: '' آپ کے بیٹے کو غلط فہمی کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا ... جو چار ملزم اس قتل کے سلسلے میں پکڑے گئے ہیں ... انہوں نے بتایا ہے کہ وہ جھنگ کے رہنے والے ہیں اور اس قتل کے سلسلے میں انہوں نے پلاننگ جس نوجوان کے گھر میں کی تھی ...اس کا نام نوید ہے ... ان لوگوں نے نہ تو ولدیت پوچھی نہ کوئی اور اتا پتا پوچھا ... بس معلومات حاصل کرنے کے نتیجے میں انھیں یہ پتا چلا کہ نوید نامی لڑکا فلاں محلے میں رہتا ہے ... اب وہاں رہتے ہیں آپ ... پولیس والوں کی بے وقوفی ... کہ آپ کے بیٹے کو اٹھا کر لے آئے... انسپکٹر شفقات نے خود مجھ سے کہا ہے کہ یہ بچہ بے گناہ ہے ... لیکن افسوس ہم اس وقت اسے چھوڑ نہیں سکتے ... کیونکہ ایران کی ٹیم تھانے میں آئی بیٹھی ہے ... اور ان کے سامنے اگر ہم اس نوجوان کو چھوڑتے ہیں تو وہ بہت شور مچائیں گے ... اور بات صدر صاحب تک پہنچے گی ... کیونکہ معاملہ ہے ایک سفیر کے قتل کا ... لہٰذا آپ کو انتظار کرنا پڑے گا ... آپ کل شام میرے پاس آئیں ... اس وقت تک ہم صورتِ حال دیکھ کر فیصلہ کر لیں گے ۔''

'' جی ... جی اچھا ۔''

'' ویسے آپ پریشان نہ ہوں ... آپ اپنا بیٹا مجھ سے لیجیے گا۔''

'' جی ... بہت بہت شکریہ ... آپ کا احسان مند ہوں ۔''

''نہیں نہیں ... میں خود بھی آپ کے ناول بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور میرے بیوی بچے بھی پڑھتے ہیں ...'' یہ کہہ کر انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

ہم باہر نکل آئے ... اب اس حد تک تو اطمینان ہو چکا تھا کہ میرے بیٹے کو غلط پکڑا گیا تھا ... جسے انہیں گرفتار کرنا تھا ... وہ کوئی اور نوید تھا ... لیکن جب تک بیٹا حوالات میں تھا، اس وقت تک مجھے چین کہاں ... میرا دل تو پھر بھی بیٹھا جا رہا تھا ... کسی کل چین نہیں تھا ... ادھر جھنگ سے فون آ گیا ... میں نے گھر والوں کو تفصیل سنائی ... لیکن جب تک نوید حوالات سے باہر نہ آ جاتا ... سکون کا سانس کیسے لے سکتا تھا۔

وہ رات بہت بے چینی کے عالم میں گزری ... اس وقت مجھے خیال آیا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے ... صدقہ بلاؤں اور مصیبتوں کو ٹالتا ہے۔ میں نے فوراً نفل شروع کر دیئے ... بہت دیر تک نفل پڑھتا رہا ... پھر رو رو کر دعا کرنے لگا کہ اے اللہ میرا بیٹا چھوٹ جائے ... اسے رہائی نصیب فرما دے ... پھر میں نے سوچا ... میں بیٹے کی طرف سے کیا صدقہ کروں ... سوچتا رہا... سوچتا رہا ... آخر جی میں آئی ... نئے شہر والا مکان مسجد کے لیے وقف کر دوں ... یا وہ جگہ مسجد کے لیے دے دی جائے ... وہاں مکان کی بجائے مسجد بنالی جائے ... یہ بات دل کو لگی اور میں نے نیت کر لی... دعا کی:

'' اے اللہ ! میرے بچے کو رہائی نصیب فرما ... میں اپنے لکھنے کی جگہ مسجد کے لیے وقف کرتا ہوں۔''

میں نے یہ دعا بار بار کی ... آخر صبح ہو گئی ...

صبح سویرے مولانا عزیز الرحمٰن ناظم اعلیٰ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کا فون آ گیا ... وہ کہہ رہے تھے :

''آپ کے بیٹے کی گرفتاری کی خبر مجھ تک پہنچی ہے ... مولانا اللہ وسایا

صاحب کو لاہور روانہ کر رہا ہوں ... ان سے مل لیں ... ہم جو مدد کر سکتے ہیں کریں گے ... اور اللہ سے دعا بھی کررہے ہیں ...''

دل کو اطمینان ہوا ... خوشی ہوئی کہ ختم نبوت کی جماعت مصیبت میں کام آنے والی جماعت ہے۔

پھر جب مولانا اللہ وسایا پہنچ گئے تو انھوں نے فون کیا:

'' میں لاہور پہنچ گیا ہوں ...اکبری دروازے میں ختم نبوت کا دفتر ہے ... میں یہاں موجود ہوں۔''

'' جی میں حاضر ہوتا ہوں ۔''

میں اسی وقت آفتاب کو ساتھ لیے وہاں پہنچا ... مولانا اللہ وسایا مصلّے پر دونوں ہاتھ پھیلائے بیٹھے تھے ... کافی دیر بعد انہوں نے ہاتھ چہرے پر پھیرے اور کہنے لگے :

'' آپ کے بیٹے کے لیے دعا کر رہا تھا ... سنائیں ... کیا پیش رفت ہوئی ہے۔''

میں نے اب تک کی کارگزاری سنا دی ... تب انھوں نے کہا۔

'' اگر آپ کو اطمینان ہے کہ کام ہوجائے گا ... تب تو ٹھیک ہے ... ورنہ ہمارے ادارے سے منسلک ... قومی اسمبلی کے ایک ممبر ہیں ... ان سے بات کی جاسکتی ہے۔''

اب چونکہ مجھے آغا اسلم صاحب اطمینان دلا چکے تھے ... تو اس صورت میں میں نے کسی دوسری طرف کوشش کرنا مناسب نہ سمجھا ... اس لیے میں نے ان سے کہا: ''پہلے اسلم آغا کی کوشش کو دیکھ لیتے ہیں۔''

'' ٹھیک ہے ... بہرحال میں یہاں موجود ہوں ... برابر دعا کرتا رہوں گا اور جب تک آپ کا بچہ باہر نہیں آجاتا ، اس وقت تک یہیں رہوں گا ... اللہ بہتر کرے گا۔''

ہم ان سے رخصت ہوکر گھر آ گئے ... وہاں سعید نامدار آئے بیٹھے تھے ... اشفاق احمد بھی وہیں موجود تھے ... سب چپ چاپ تھے ... اس وقت سعید نامدار نے کہا۔

'' میرے ایک پولیس انسپکٹر واقف ہیں ... میں نے ان سے ذکر کیا تھا ... وہ کہہ رہے تھے ... میں تھانے ساتھ جا کر بچے کی ان کے والد سے ملاقات کرا سکتا ہوں اور بس ... فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا ... کیونکہ معاملہ ایرانی سفیر کے قتل کا ہے ... اور اس وقت ایرانی صدر نے ہماری پوری حکومت کو ہلایا ہوا ہے۔''

میں نے ان کی بات سن کر کہا۔

'' میں تو اسے حوالات میں دیکھ کر برداشت نہیں کر سکوں گا ... آپ آفتاب احمد کو ساتھ لے جائیں ... آپ کے دوست آفتاب کی بچے سے ملاقات کروا دیں ... تاکہ یہ اسے تسلّی دے سکیں کہ ہم زبردست کوشش کر رہے ہیں اور رہائی کے امکانات اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے روشن ہیں ... چلو اس طرح وہ قدرے بے فکر ہو جائے گا ... ورنہ مارے فکر کے وہ تو ہلکان ہو رہا ہوگا۔''

'' ٹھیک ہے ... ایسا کر لیتے ہیں۔''

سعید نامدار آفتاب کو لے کر چلے گئے ... دو گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی ... میں نے چھوٹتے ہی پوچھا:

'' کیا رہا ... ملاقات ہوئی یا نہیں۔''

'' بہت سخت معاملہ ہے ... کڑی نگرانی ہو رہی ہے، بس دور سے نوید کو دکھایا گیا ... میں نے ہاتھ ہلا کر اسے تسلّی دی اور بس۔'' آفتاب نے بتایا۔

'' چلیے ... یہ بھی بہت ہے ... اسے پتا تو چل گیا ہے کہ ہم آئے ہوئے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے ...''

پھر مغرب کے بعد میں آفتاب اور اشفاق احمد اسلم آغا صاحب سے ملنے

کے لیے روانہ ہوئے ... میں نے ناولوں کا ایک پورا بنڈل ساتھ لے لیا ... سوچا تھا ... آغا صاحب کو دوں گا...

آغا صاحب اپنے دفتر میں موجود تھے ... اور تھے بھی تنہا ... دیکھتے ہی کہنے لگے: ''آیئے آیئے ... اشتیاق صاحب ۔''

ہم نے السلام علیکم کہا اور ان کے سامنے بیٹھ گئے ... ساتھ ہی میں نے ناولوں کا بنڈل ان کے سامنے رکھ دیا ۔

''یہ کیا بھئی ۔''

'' آپ کے گھر والوں کے لیے ... تھوڑے سے ناول ... اور بھی پہنچاؤں گا۔''

'' ہوں ... لیکن ایسے نہیں ۔'' وہ مسکرائے ۔

'' جی ... کیسے نہیں ۔''

''آپ ان تمام کتب پر اپنے دستخط کردیں ... بلکہ دوچار پر آٹو گراف بھی دے دیں۔''

میں نے بنڈل کھولا اور کتب پر دستخط کرنے لگا ... ادھر انہوں نے اچھرہ تھانے کے نمبر ملائے ... سلسلہ ملنے پر وہ انسپکٹر صاحب سے بات کرنے لگے ... پھر انہوں نے ریسیور رکھ دیا... جب میں دستخط کر چکا تو انہوں نے کہا ۔

'' شفقات صاحب سے بات ہوئی ہے ... اس وقت وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ... کیونکہ ایرانی ٹیم اس وقت بھی تھانے میں آئی ہوئی ہے ... لہٰذا اب بات کل پر گئی۔''

'' اوہ !'' میں دھک سے رہ گیا ... مجھے تو زبردست امید تھی کہ آج ہم نوید کے ساتھ گھر جائیں گے ... میں نے ان کی طرف بے قرار نگاہوں سے دیکھا ... پھر پوچھا :

'' تو پھر ! اب میں کل کب آؤں ۔''

''کل جمعہ ہے ... دفتر سے میں جلد گھر چلا جاؤں گا، آپ ایسا کریں کہ کل میرے گھر آجائیں ... پھر جو بھی صورتِ حال ہوگی میں بتا دوں گا۔''

''جی ... جی اچھا۔'' میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا ... انہوں نے میری کیفیت بھانپ لی ... کہنے لگے۔

''آپ فکر نہ کریں ... میں کہہ چکا ہوں آپ کا بچہ جلد باہر آجائے گا ... ان شاء اللہ!''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے کہا اور پھر ہم اٹھ کھڑے ہوئے ... اب وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

وہ رات بھی ہم نے بہت زیادہ بے قراری کے عالم میں گزاری ...

ادھر جھنگ سے بار بار فون آرہا تھا ... میری بڑی بیٹی فرحت فون پر بس یہ جملہ پوچھتی تھی: ''بابو جی ... کیا بنا۔''

گھر میں مجھے بچپن میں بابو کہا جانے لگا تھا ... آج بھی بابو جی ہی کہتے ہیں ... میں نے فرحت کو ساری صورتِ حال بتائی اور دعا پر زور دینے کے لیے کہا ... یہ بھی بتا دیا کہ اب ہم جمعے کے وقت آغا اسلم کے گھر جائیں گے۔

دوسرے دن میں اور آفتاب آغا صاحب کے گھر پہنچ گئے ... اس روز اشفاق ساتھ نہیں آسکا تھا ... آغا صاحب سے ملاقات ہوئی ... وہ اپنی کوٹھی کے پائیں باغ میں بیٹھے تھے ... علیک سلیک کے بعد کہنے لگے:

''آپ لوگ جمعہ پڑھ چکے ہیں۔''

''جی نہیں ... ہم نے سوچا تھا ... یہیں پڑھ لیں گے ... جب ہم گھر سے چلے ہیں تو وقت نہیں ہوا تھا۔''

''ٹھیک ہے ... آپ جمعہ پڑھ لیں ... میں شفقات صاحب سے صورتِ حال معلوم کرتا ہوں۔''

میں اور آفتاب مسجد میں چلے آئے ... مسجد ان کے گھر کے نزدیک ہی

تھی ... اور آغا صاحب کی کوٹھی شاد باغ میں تھی ... ان دنوں بات چیت کے دوران آغا صاحب نے وضاحت کر دی تھی کہ ان کے نام سے کہیں ہم دھوکا نہ کھائیں ... وہ اہلِ سنت والجماعت سے تعلق رکھتے ہیں ... کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کہیں ہم انھیں شیعہ نہ سمجھ لیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہ بات ہمارے دماغوں میں گردش کر رہی تھی... انہوں نے اچھا کیا، بتا دیا ...

ہم جمعہ پڑھ کر آئے تو آغا صاحب بات کر چکے تھے ... انہوں نے پر سکون آواز میں کہا۔

''وہاں تھوڑا سا مسئلہ ہے ... آپ کل شام میرے دفتر آئیں ۔''

ہمیں پھر اپنے دل ڈوبتے ہوئے محسوس ہوئے ... تین دن ہو گئے تھے اور کام نہیں بن رہا تھا لیکن ہم کر ہی کیا سکتے تھے ... ان حالات میں آغا صاحب کے بجائے کسی اور سے اس سلسلے میں مدد لینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا ... کیونکہ جب سے انہوں نے یہ بتایا تھا کہ ان کا تو سارا گھرانہ ہی آپ کے ناولوں کا شیدائی ہے ... تو میرے ذہن میں یہ بات جم گئی تھی کہ اس صورتِ حال کے لیے آغا صاحب ہی بہتر ہیں ...

وہ رات پھر بے قراری میں گزری ... ان دنوں بھوک پیاس بالکل اڑ گئی تھی ... نہ کچھ کھانے کو جی چاہتا تھا نہ پینے کو ... بس دعاؤں پر زور تھا... آخر خدا خدا کر کے رات گزرگئی ... اب شام کا انتظار شروع ہوا... اشفاق احمد برابر ہمیں دلاسہ دیتے رہے تھے ...اور آخر ہم عصر کی نماز کے بعد گھر سے روانہ ہوئے، اسی وقت بارش شروع ہوگئی ... ہم بہت فکر مند ہوئے۔

خیر آغا صاحب کے دفتر پہنچے ... وہ اکیلے تھے ... انہوں نے ہاتھ ملایا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا ... پھر فون پر نمبر ڈائل کرنے کے بعد بات کرنے لگے ...ہم نے جان لیا ... نوید کے بارے میں ہی بات ہو رہی تھی ... لیکن دوسری طرف سے کیا کہا جار ہا تھا ... یہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا... پھر انہوں نے ریسیور رکھ دیا

... انہوں نے ہم سے کچھ نہ کہا تو ہمارے دل بیٹھنے لگے ...

انہوں نے میز پر رکھے ایک ننھے سے پیڈ سے ایک کاغذ لیا ... اس پر اوپر کی طرف نوید لکھا ... نوید کے نام سے بالکل نیچے سے ایک لکیر کاغذ سے نچلے حصّے کی طرف کھینچتے ہوئے لائے اور لکیر کے سرے پر اپنے دستخط کیے ... دستخط کرنے کے بعد انہوں نے وہ چٹ مجھے دے دی ... کہنے لگے :

'' اچھرہ تھانے میں یہ چٹ دکھا کر اپنا بچہ لے لیں ... وہاں شفقات صاحب موجود ہیں۔''

ان کا یہ کہنا کہ اپنا بچہ لے لیں، اس وقت اس قدر پر کیف تھا کہ میں آج تک اس کے مزے کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکا ... اور نہ کبھی کر سکوں گا ... بس میں نے چٹ سنبھالی ... گرم جوشی سے ان سے ہاتھ ملایا ... شکریہ کہا اور باہر نکل آیا ... آفتاب اور اشفاق بھی میرے ساتھ پیچھے باہر آگئے ...

برآمدے میں آئے تو بارش موسلا دھار ہو رہی تھی ... ہم پریشان ہو گئے ... چٹ میں نے جیب میں رکھ لی تھی ... ہمارے پاس کوئی سواری نہیں تھی ... یہاں تک بھی رکشے پر آئے تھے ... اس واقعے سے دو تین ماہ پہلے کار فروخت کر دی تھی ... بچے چاہتے تھے اسے فروخت کر کے کوئی اور خرید لی جائے۔

'' اب کیا کریں ۔'' آفتاب نے کہا۔

''کرنا کیا ہے ... اچھرہ تھانے جائیں گے ... جیسے بھی ہو ... اللہ نے چاہا تو کوئی رکشہ مل ہی جائے گا۔''

ہم دفتر کی عمارت سے بھیگتے ہوئے باہر نکلے ... دائیں بائیں نظر دوڑائی ... کافی دور ایک رکشہ پانی میں کھڑا نظر آیا ... میں نے چیخ کر کہا ۔

'' بھاگو اس کی طرف ... کہیں یہ چل نہ دے۔''

ہم بے تحاشہ بھاگنے لگے ... اور مکمل طور پر بھیگ گئے ... میرے ہاتھ جیب کے اوپر تھے ... کیونکہ جیب میں وہ چٹ تھی ... اور مجھے یہ فکر کھائے جا رہی

تھی کہ چٹ بھیگ گئی تو ہم انھیں کیا دیں گے ... اس صورت میں یہ الفاظ تو مٹ جائیں گے ... اگر چہ آغا صاحب نے لکھا کچھ بھی نہیں تھا... لیکن شاید یہ کوئی کوڈ طریقہ تھا ... بہرحال بے تحاشہ دوڑتے ہوئے ہم رکشے تک پہنچے ... رکشہ دراصل پانی کی وجہ سے رک گیا تھا ... اور دھکیلنے کے باوجود آگے نہیں سرک رہا تھا ... میں نے بے قراری کے عالم میں کہا۔

''بھائی ... ہمیں اچھرہ تھانے تک لے چلو۔''

''جی نہیں ! موسلا دھار بارش کی وجہ سے وہاں جانا ممکن نہیں ... راستے میں جگہ جگہ پانی کھڑا ہے ... اور میرا رکشہ تو پہلے ہی پانی میں پھنسا ہوا ہے۔''

''پانی میں سے اسے ہم نکلوادیتے ہیں ... پہلے ہماری بات سن لیں کہ ہم اچھرہ تھانے جا کیوں رہے ہیں ... پھر جو آپ کی مرضی بنے، وہ کر لیجیے گا۔'' میں نے درد بھری آواز میں کہا۔

''اچھا کہیے ... کیا کہتے ہیں۔'' رکشے والا نرم آواز میں بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ ہمارے پاس ایک بچے کی رہائی کا حکم ہے ... وہ حوالات میں بند ہے ... اگر آپ ہمیں نہ لے گئے تو بھی ہمیں تو جانا پڑے گا، چاہے یہاں سے چلتے ہوئے پیدل جانا پڑے ... یہ آپ دیکھ لیں کہ کتنا فاصلہ ہے، یہاں سے تھانے کا۔''

ہم اس وقت کچہری کے پاس کھڑے تھے ... آخر رکشے والے کو ہم پر رحم آ گیا... اس نے کہا۔

''اچھا پہلے دھکا لگائیں ... پھر بیٹھ جائیں۔''

رکشہ ایک گڑھے کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا ... اب ہم نے پہلے اسے پیچھے کیا ... پھر رخ تبدیل کر کے آگے بڑھا دیا ... اس طرح رکشہ وہاں سے نکل آیا ... ہم اس وقت تک پانی میں شرابور ہو چکے تھے ... البتہ میرا ایک ہاتھ بدستور میری جیب پر تھا ... اپنا ہاتھ میں نے ایک پل کے لیے بھی جیب سے نہیں

ہٹایا تھا ...

ہم بسم اللہ کر کے رکشے میں بیٹھ گئے اور وہ روانہ ہوا ... اس وقت میری اور آفتاب کی کیا کیفیت تھی ... وہ بھی بیان سے باہر ہے ... البتہ اشفاق احمد بہت پر سکون نظر آرہے تھے... شاید اس لیے کہ نوید ان کا بیٹا یا بھتیجا نہیں تھا ... تاہم وہ اس مشکل وقت میں ساتھ تو تھے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

بارش کی وجہ سے رکشہ بہت آہستہ چل رہا تھا جب کہ ہم چاہتے تھے کہ رکشہ بلا کی رفتار سے چلتا ہوا جلد ازجلد تھانے تک پہنچ جائے ...

اس وقت ہمارے دل بہت تیزی سے دھڑک رہے تھے ... یہ دھڑکنیں خوش گوار تھیں ... لیکن ساتھ ہی دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ تھانے میں کہیں اور مسئلہ نہ پیش آجائے ... شفقات صاحب یہ نہ کہہ دیں ... ہم اس وقت بچے کو رہا نہیں کر سکتے ... کل آجائیں ...

اس قسم کی باتیں دماغ میں گردش کرتی رہیں ... سفر تھا کہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا ... یوں لگ رہا تھا جیسے اچھرہ آج کہیں بہت دور چلا گیا ہے... اور وہ آتے آتے ہی آئے گا ...

آخر خدا خدا کر کے رکشہ رکا اور ڈرائیور نے کہا ۔

'' لیجیے جناب ... تھانہ آگیا ہے ۔''

'' بہت بہت شکریہ ! آپ ٹھہریں ... ہمیں واپس بھی تو جانا ہوگا۔''

'' اچھی بات ہے ۔''

اور ہم رکشے سے اتر کر تیزی سے قدم اٹھاتے اندر کی طرف بڑھے ...

اندر داخل ہوئے تو بائیں ہاتھ ایک کمرہ نظر آیا، اس کے باہر ایک کانسٹیبل بیٹھا تھا... لیکن کمرہ خالی تھا ... میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور پوچھا :

'' شفقات صاحب ؟''

'' کیا کام ہے ۔'' اس نے پولیس کے روایتی اکھڑ لہجے میں کہا۔

"ہمیں آغا اسلم صاحب نے بھیجا ہے۔"

اسی وقت ایک صحت مند سے انسان وہاں آ گئے ... وہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔

"کیا بات ہے؟"

"جی ... ہمیں اسلم آغا صاحب نے بھیجا ہے۔"

"کون آغا اسلم۔" انھوں نے کہا اور ہم دھک سے رہ گئے ... یہاں تو کہا جا رہا تھا ... کون اسلم آغا ... گویا یہاں کوئی انھیں جانتا ہی نہیں تھا ... مجھے اور تو کچھ نہ سوجھی، چٹ جیب سے نکال کر انھیں دے دی ... چٹ دیکھ کر انہوں نے اس کانسٹیبل کی طرف دیکھا ... پھر ہماری طرف دیکھا ...اور پھر گویا ہوئے ...

"یہ کیا ہے۔" انداز ایسا تھا جیسے اس چٹ کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

"ہمیں تو انہوں نے یہی چٹ دی تھی ... اور کہا تھا ... جاؤ ... تھانے سے اپنا بیٹا لے لو ...ہم نوید کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

"میں نے انھیں پہلے دن ہی کہہ دیا تھا۔" وہ شریر انداز میں مسکرائے۔

"جی ... کیا کہہ دیا تھا۔"

"یہ کہ ... یہ لڑکا تو غلط لے آئے ... لیکن کیا کریں ... یہاں ایرانیوں کا بہت زور شور تھا ... اسے فوری طور پر رہا نہیں کر سکتے تھے ... جاؤ بھئی نوید کو لے آؤ۔"

ان کا یہ جملہ سن کر آن کی آن میں ساری پریشانی ایسے غائب ہو گئی جیسے میں پریشان تھا ہی نہیں ... اس وقت معلوم ہوا...دراصل وہ مذاق کر رہے تھے ... اب انہوں نے کہا۔

"پکڑ لانا تھا ... کسی اور نوید کو ... وہ لوگ لے آئے اس بے چارے کو۔"

وہ وہیں صحن میں ہی کرسی پر بیٹھ گئے ... ہم کھڑے رہے، صحن میں

کوئی اور کرسی نہیں تھی ... نہ انہوں نے ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا ... ظاہر ہے ہمیں وہاں بیٹھ کر کرنا بھی کیا تھا ... ان لوگوں کو حوالات کا تالا کھول کر نوید کو باہر لانا تھا اور ہمیں وہاں سے روانہ ہو جانا تھا ... اسی وقت ہم نے نوید کو آتے دیکھا ... میں لپک کر اس کے گلے سے لگ گیا ... پھر آفتاب نے اسے گلے سے لگایا اور اس کے بعد اشفاق احمد نے ... پورے چار دن کی شدید ترین پریشانی کے بعد ہم نوید کو دیکھ رہے تھے ... ایسے میں شفقات صاحب نے کانسٹیبل سے کہا۔

''رجسٹر اٹھا کر لے آؤ۔''

وہ رجسٹر لے آیا ...شفقات صاحب نے اس پر میرے دستخط لیے اور پھر انہوں نے کہا۔

''جائیں ... اپنے بیٹے کو لے جائیں۔''

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا ... ہاتھ ملائے اور تھانے سے نکل آئے ... بارش رک چکی تھی ... طوفان گویا تھم چکا تھا ... اور رکشے والا ہمارا انتظار کر رہا تھا ... ہم چاروں رکشے میں بیٹھ گئے ...

''چلو بھائی ... ساندے چلنا ہے۔''

''جی اچھا۔''

راستے میں ہم نوید سے تفصیلات پوچھتے رہے ...اس نے بتانا شروع کیا:

''بازار لوہاراں سے ہی مجھے کار میں بٹھا کر یہ لوگ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے تھے ... میرے ایک طرف ایک کانسٹیبل بیٹھا تھا اور دوسری طرف دوسرا ... یا ان کا عہدہ کچھ اور ہوگا ... اور ایک پولیس والا کار چلا رہا تھا ... بس یہ تین آدمی تھے ... میں نے راستے میں ان سے کچھ نہیں پوچھا ... نہ انہوں نے بتایا ... جب یہ لوگ اچھرہ تھانے میں لے آئے تو شفقات صاحب نے مجھے دیکھا ... پھر انہوں نے کہا: ''ان چاروں کو لے آؤ۔''

ان کا مطلب تھا ... صادق گنجی کیس کے سلسلے میں جن چار لوگوں کو

پکڑا گیا تھا... وہ انھیں لانے کے لیے کہہ رہے تھے ... جلد ہی ان چاروں کو لے آیا گیا ... شفقات صاحب نے ان سے پوچھا:

''یہی ہے وہ ... جن کے ساتھ مل کر تم نے جھنگ میں منصوبہ بندی کی تھی۔ اور اس کا نام نوید ہے۔''

''ارے ... یہ آپ لوگ کسے لے آئے ... وہ یہ نہیں ہے۔''

''لاحول ولا قوۃ۔'' شفقات صاحب نے بھنّا کر کہا ... پھر بولے۔

''لیکن فی الحال اسے حوالات میں تو رکھنا پڑے گا ... اس کے لواحقین وغیرہ آئیں گے تو ان کے حوالے کریں گے ... اس وقت مجھے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ غلط فہمی کی بنیاد پر مجھے لے آئے ہیں اور رہا کر دیں گے ... لیکن پھر بھی حوالات میں ایک ایک پل گزارنا بہت مشکل تھا ... دوسرا یہ کہ رکھا بھی گیا ان چاروں کے ساتھ... وہاں میں نے ان سے صادق گنجی کے قتل کی تفصیلات سنیں ... قاتل وہی چاروں ہی تھے ...''

ہم راستے میں اللہ کا شکر ادا کرتے رہے ...بس یہی کہتے رہے ...

''یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ... یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

آخر گھر پہنچے ... سب سے پہلے میں نے گھر فون کیا ... فون فرحت نے اٹھایا اور بے تابانہ انداز میں بولی: ''بھائی مل گیا۔''

''ہاں فرحت ... اللہ کی مہربانی سے ہم تمھارے بھائی کو لے آئے ہیں ... لو ...تم خود اس سے بات کر لو۔''

نوید سب گھر والوں سے باری باری بات کرنے لگا ... ان حالات میں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے ... پھر آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے ... یہ آنسو بھی عجیب چیز ہیں ... خوشی کے موقعے پر بھی آ جاتے ہیں ...رنج غم اور مصیبت کے وقت تو خیر آتے ہی ہیں ...

اب میں نے گھر والوں کو بتایا: ''اب تو رات ہو گئی ہے ... ہم کل

جھنگ آئیں گے ... یہاں ان لوگوں سے ملنا بھی تو ہے...جن لوگوں نے رہائی کے سلسلے میں کوشش کی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' گھر والوں نے کہا ... اب فکر رنج غم اور پریشانی کی بات تو ختم ہوگئی تھی... لہٰذا وہ کیوں کہتے کہ نہیں ابھی لے کر روانہ ہوں۔

دوسرے دن سب سے پہلے میں نوید کو مولانا اللہ وسایا صاحب کے پاس لے گیا...فون پر میں نے انھیں رات ہی کہہ دیا تھا کہ نوید کو رہائی مل گئی ہے ...ہم صبح آپ کے پاس آئیں گے۔

مولانا اللہ وسایا گرم جوشی سے ملے ... میں نے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا ... انہوں نے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا ...

وہاں سے ہم آغا اسلم صاحب کے گھر گئے ... ان کا بھی شکریہ ادا کیا ... وہ بہت خوش ہوئے ۔

پھر ہم کرائم رپورٹر صاحب کے گھر گئے... ان کا گھر میں اس دوران دیکھ چکا تھا ... ان کے لیے تو ہم خاص طور پر دو کلو مٹھائی کا ایک ڈبہ لے کر گئے... کیونکہ نوید کی رہائی کے سلسلے میں وہی ہمیں آغا اسلم کے پاس لے گئے تھے۔

ان کے بعد ضیاء شاہد صاحب کے پاس گئے ... ان کا بھی شکریہ ادا کیا ... اِن ہی کے ذریعے ہمیں وہ نیک کرائم رپورٹر ملے تھے ... ضیاء شاہد نے ہمیں محبت بھرے انداز میں رخصت کیا ... اب ہم جھنگ جانے کے لیے فارغ تھے۔

جب میں نے کار خرید لی تھی ... تو گاڑی چلانے کے لیے اپنے محلے کے ایک ڈرائیور کو بھی رکھ لیا تھا ... لیکن کچھ مدت بعد ہی اس نے جھنگ تا لاہور کی ایک گاڑی کی ملازمت شروع کر دی تھی... اس کا نام ریاض تھا ...میں نے ریاض کو پہلے ہی پیغام دے دیا تھا کہ ہمیں نوید کو لے کر لاہور سے جھنگ جانا ہے ... چنانچہ وہ گاڑی لے آیا تھا ... اب ہم اس میں بیٹھے اور گھر کی طرف روانہ ہوئے ...سب ہی اس قدر خوش تھے کہ زندگی میں پہلے کیا خوش ہوئے

ہوں گے ... راستے میں ہم اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہتے رہے ...چہکتے رہے... باتیں کرتے رہے ...سچ پوچھیں تو وہ دن میری زندگی کا بہت ہی زیادہ خوشگوار دن تھا ... آخر ہم گھر پہنچ گئے ... چلنے سے پہلے میں گھر والوں کو فون کر چکا تھا ... انہوں نے بھی سب رشتے داروں اور عزیزوں کو بتا دیا تھا ... لہذا جب ہم گھر پہنچے تو پورا گھر مردوں اور عورتوں سے بھراپڑا تھا ... سب لوگ نوید کو گلے سے لگانے لگے ... دراصل ہم نے ایسی پریشانی پہلے کب دیکھی تھی۔

دوسرے دن میں نئے شہر گیا ... وہاں نماز مولانا محمد الیاس بالا کوٹی صاحب کی مسجد عثمانیہ میں پڑھتا رہا تھا ... لہٰذا سیدھا مولانا محمد الیاس بالا کوٹی کی خدمت میں حاضر ہوا ... میں نے ساری تفصیل سنائی اور بتایا کہ میں نئے شہر والے گھر کے بارے میں کیا نیت کر چکا ہوں ... اب میں نے ان سے کہا ...

'' وہ گھر اب میں اللہ کے راستے میں دے چکا ہوں ... لہٰذا اب اسے اپنے استعمال میں نہیں رکھ سکتا ...اس کی چابی آپ لے لیں ... یا تو وہاں مسجد بنا لیں، یا اسے بیچ کر مسجد کے لیے کوئی جگہ خرید لیں ... میری بات سن کر انہوں نے کہا: '' فی الحال ہم اسے کرائے پر دے دیتے ہیں ... کرائے کے پیسے جمع کرتے رہیں گے ... کچھ مدت بعد اس جگہ پر مسجد بنا لیں گے۔''

'' جی بالکل ٹھیک۔''

میں انھیں چابی دے کر چلا آیا۔ اگلا اتوار آیا تو بچوں نے مجھ سے کہا۔

'' آج نئے شہر جانے کا دن ہے ۔''

میں نے سب گھر والوں کی طرف دیکھا: '' نہیں ...اب ہم اس گھر میں نہیں جائیں گے۔''

'' جی ... کیا مطلب۔'' ان سب نے حیران ہو کر کہا ...

'' وہ گھر اب ہمارا نہیں رہا ... اللہ کو دے دیا اب وہاں مسجد بنے گی۔''

'' جی ... کیا مطلب؟''

میں نے انھیں تفصیل سنائی ... تو وہ سب چپ ... سب مجھے حیرت زدہ انداز میں دیکھ رہے تھے ... انھیں میرا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا ... سوائے نوید کے ... نوید کے سلسلے ہی میں تو وہ دیا گیا تھا ... آخر میں نے ان سے کہا۔

'' جو چیز اللہ کے راستے میں دے دی ... وہ دے دی ... اللہ تعالیٰ ہمیں اور دیں گے ... میں تم لوگوں کے لیے کوئی اور جگہ خریدلوں گا۔''

وہ کیا کہتے ... چپ ہوگئے ... یہاں میں اس مکان کی بات مکمل کر لوں ... ایک مدت تک وہ کرائے پر چڑھا رہا ... کرائے کے پیسے مولانا محمد الیاس بالاکوٹی صاحب جمع کرتے رہے ... کئی پروگرام بنے ... آخر اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ اسے گرا کر مسجد کا کام شروع کیا جا سکتا تھا ... لیکن وہاں مسجد بنانے کا ذکر شروع ہوا تو اس مکان کے آس پاس کے لوگوں نے شدید مخالفت شروع کر دی ... وہاں زیادہ تر لوگ مسجد بنانے کے خلاف تھے ... آخر میں نے مولانا سے کہا...

'' آپ اسے بیچ دیں ... ہم مسجد کے لیے کوئی اور جگہ خرید لیتے ہیں ... وہاں مسجد بنالیں گے۔''

'' ٹھیک ہے۔''

انہوں نے اسے فروخت کرنے کی کوشش شروع کردی ... اس میں کافی مدت گزر گئی ... نہ وہ فروخت ہوا نہ وہاں مسجد بن سکی ... اب اس کے بارے میں لوگ میرے پاس آنے لگے... ہر کوئی چاہتا تھا ... میں مکان اسے دے دوں اور وہ وہاں مسجد بنا لے گا ... لیکن میں اس پر تیار نہ ہوا... اطمینان ہی نہیں ہورہا تھا ... آخر کئی سال گزر گئے ... پھر مولانا نے ایک دن کہا ...

'' مکان کا ایک گاہک مل رہا ہے ... آپ کہیں تو بیچ دیں۔''

'' ضرور بیچ دیں ... بات کسی کنارے تو لگے گی۔''

اس طرح وہ مکان جو میں نے پچاس ہزار میں خریدا تھا ... تقریباً سات لاکھ میں فروخت ہوا ... اب جب یار لوگوں کو پتا چلا کہ ہم نے وہ مکان

فروخت کر دیا ہے اور اس رقم سے مسجد کے لیے جگہ خریدی جائے گی تو ادھر ادھر سے لوگ آنے لگے۔

ہر آنے والا چاہتا تھا ... میں سات لاکھ روپے اسے دے دوں... یا جگہ خرید کر اس کے حوالے کر دوں ... کئی لوگوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جا کر کچھ جگہیں بھی دکھائیں کہ یہ بک رہی ہیں ... یہ خرید لیں ... یہاں مسجد مناسب رہے گی، لیکن میں اس قسم کی کسی بات سے مطمئن نہیں ہوا ... آخر اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایک بات ڈالی ...

وہ بات یہ تھی کہ ختم نبوت کی برکت سے میں دین کی طرف متوجہ ہوا تھا ... تو کیوں نہ یہ رقم میں ختم نبوت کے حوالے کر دوں ... اور وہ چناب نگر والی مسجد میں اس رقم کو لگا دیں ... اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے مولانا عزیزالرحمٰن ناظمِ اعلیٰ صاحب کو فون کیا ... صورتِ حال بتائی اور اپنا ارادہ بتایا ... انہوں نے فرمایا ...

"بہت اچھا ارادہ ہے ... آپ رقم بھیج دیں۔"

میں نے چیک لکھا ... اور انھیں پوسٹ کر دیا ... اس طرح اس مکان کا جھگڑا حل ہوا جس نے مجھے کئی سال تک پریشان کیے رکھا تھا ... ختم نبوت کو وہ چیک 14/3/2009 کو بھیجا گیا... الحمد للہ !

☆☆☆☆☆

O

اب ہم واپس چلتے ہیں ... اب دفتر میں سعید نامدار صاحب مستقل طور پر کتابت کرنے لگے ... اشفاق احمد جنگ میں چلے گئے ...

طاہر ایس ملک نے دفتر کے بہت سے کام اپنے ذمے لے لیے ... ایک طرح سے وہ بے تنخواہ ملازم تھا... بس سرورق بنانے کے پیسے لیتا تھا ...

انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کے ساتھ ساتھ وادی مرجان سے ڈیڑھ دو سال پہلے شوکی برادرز سیریز بھی شروع ہو چکی تھی اور اس طرح اب ہر ماہ چار ناول شائع ہو رہے تھے ... اور تقریباً سات آٹھ ہزار فی ناول شائع ہو رہے تھے ... پاکستان کی اشاعتی تاریخ میں یہ ایک ریکارڈ تھا ... کم از کم بچوں کے ناولوں کی حد تک میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی ادارے نے اتنی تعداد میں ہر ماہ باقاعدگی سے ناول نہیں شائع کیے تھے ... وہ بھی ایک مقررہ تاریخ پر ... ہر ماہ کی بیس تاریخ کو ناول اسٹال پر آجاتے تھے ...

ان حالات میں ایک روز کراچی سے ایک ڈیلر محمد حسین برادرز کے مالکان تشریف لائے ... انہوں نے کہا۔

" آپ کراچی کے لیے ایجنسی ہمیں دے دیں ... ہم آپ کو 70 ہزار روپے ایڈوانس جمع کرا دیتے ہیں ... یہ ہمارے آپ کے پاس بطور ضمانت جمع رہیں گے ... ہر ماہ کی کتابیں آنے پر ہم ان کا بل بھیجتے رہیں گے ...

میں سوچ میں پڑ گیا ... ان سے پہلے احمد برادرز کو ایجنسی دی ہوئی تھی

... شاید میں نام بھول رہا ہوں ... احمد برادرز کی بجائے نام کوئی اور ہو سکتا ہے ... وہ بہت اچھے ایجنسی ہولڈر ثابت ہوئے تھے ... لیکن پھر انہوں نے ایک پلازہ بنا لیا تھا اور ان کی توجہ کتابوں والے کام کی طرف بہت کم ہو گئی تھی ...

اس بنیاد پر میں نے محمد حسین برادرز کو ایجنسی دینے کا فیصلہ کر لیا اور آخر انھیں ایجنسی دے دی ... لاہور میں رفیق مغل نیوز ایجنسی اور راولپنڈی میں اشرف بک ایجنسی والے ہمارے ڈیلر تھے ... فیصل آباد میں شمع بک اسٹال والے ناول منگواتے تھے ... اس ایجنسی کے مالک حاتم بھٹی (عبدالحمید بھٹی) تھے ... ان سے بہت دوستانہ ہوگیا ... گھروں میں آجانا بھی ہونے لگا ... میں جب لاہور جاتا تھا تو صبح سویرے ان کے اسٹال پر رکتا ... ان سے اخبار لیتا... اور بل بھی وصول کرتا ... یہ تھیں بڑے شہروں کی ایجنسیاں ... باقی شہروں میں ایجنسیاں نہیں دی گئی تھیں ...اسٹالوں والے اپنی تعداد کے مطابق کتب منگواتے تھے... اب پورے پاکستان میں ناول جا رہے تھے ... اور خوب جا رہے تھے ... اور میں سوچا کرتا تھا ... قدرت کا نظام بھی خوب ہے ... یعنی انسان سوچ بھی نہیں سکتا ... کیا میں نے کبھی سوچا تھا کہ اس طرح ایک وقت آئے گا... ہر ماہ چار چار ناول لکھوں گا اور شائع ہوں گے ... اور خوب فروخت ہوں گے ... بڑا قد کے عنوان سے ایک چھوٹی سی کہانی سے ابتدا کرنے والا آج کہاں کھڑا تھا ...

ان حالات میں میرے چھوٹے بھائی آفتاب احمد نے بھی ناول لکھنا شروع کر دیئے ... ایک روز میرے سامنے انہوں نے 80 صفحات کا ایک ناول رکھ دیا ... ناول فیروز سنز نے شائع کیا تھا اور اسے آفتاب احمد نے لکھا تھا ... میں چونک گیا ... اس نے مجھے بتایا تک نہیں تھا کہ اس نے کوئی ناول لکھ کر فیروز سنز کو دیا ہے ... میں ناول دیکھ کر بہت خوش ہوا ... اس نے کہا۔

'' اگر فیروز سنز میرا ناول شائع کر سکتا ہے تو آپ کیوں نہیں کر سکتے۔''

بات معقول تھی ... چنانچہ میں نے کہا: '' ٹھیک ہے ... تم ناول لکھ

کر دے دیا کرو ... میں اپنے ناولوں کے ساتھ تمہارا بھی ایک ناول شائع کیا کروں گا۔''

آفتاب خوش ہو گیا ... اب میرے چار نالوں کے ساتھ ایک ناول آفتاب کا بھی شائع ہونے لگا ...

آفتاب احمد نے پہلا ناول ہر قدم پر موت لکھ کر دیا ... یہ ناول غریب ہیرے، بدنصیب ہوٹل کے ساتھ شائع ہوا ...

اس سے پہلے جب انسپکٹر کامران مرزا کے ناول شروع کیے تھے تو ان کا پہلا ناول ہزار سال کا آدمی تھا ... شوکی سیریز شروع ہوئی تو ان کا پہلا ناول نیا کارنامہ تھا ... نیا کارنامہ جنوری 1983 میں شائع ہوا تھا اور اس کے ساتھ ناول چوکور ستارہ ، ہیروں کا بکس شائع ہوئے تھے ... آفتاب احمد نے جو ناول فیروز سنز کو دیا تھا ، اس کا نام ''نیا جادوگر پرانا جن'' تھا ... یہ اکتوبر 1985 میں انہوں نے شائع کیا تھا...

ان دنوں مجھ سے میرے قارئین اس قسم کی فرمائش کرتے تھے ... کہ اور بڑا خاص نمبر لکھیں ... اس وقت تک جو خاص نمبر چھپ چکے تھے وہ یہ تھے ... جیرال کا منصوبہ (یہ سب سے پہلا خاص نمبر تھا اور اس نے بہت دھوم مچائی تھی ... یہ ہم نے چھ ہزار کی تعداد میں شائع کیا تھا اور یہ پہلے روز ہی ختم ہو گیا تھا ... مجھے اچھی طرح یاد ہے ... فیصل آباد کے حاتم بھٹی صاحب رات کے وقت لاہور آئے تھے ... انہوں نے کہا تھا ...

'' جیرال کا منصوبہ ختم ہو گیا ہے ، اور دے دیں ۔''

میں نے انھیں بتایا تھا ... کہ ناول ختم ہو گیا ہے۔

تو یہ صورتِ حال تھی اس وقت ... بہرحال جیرال کا منصوبہ کے بعد یہ خاص نمبر شائع ہو چکے تھے:

ملاشا کا زلزلہ ، وادی دہشت ، کالا شیطان ، شیطان کے پجاری ،

پراسرار اغوا، جھیل کی موت، سلاٹر کی واپسی اور دنیا کے قیدی۔

اوراب قارئین کا مطالبہ یہ تھا کہ دنیا کے قیدی سے بھی بڑا ناول لکھیں ... معمول اس وقت یہ تھا کہ سال میں دو خاص نمبر شائع کیے جاتے تھے ... ایک گرمیوں کی چھٹیوں میں دوسرا دسمبر کی چھٹیوں میں ... ان حالات میں میں نے خاص نمبر جزیرے کا سمندر لکھنا شروع کیا ... اس کا اعلان لگایا کہ اب شائع ہونے والا خاص نمبر پہلے تمام میں سب سے ضخیم خاص نمبر ہوگا۔

اس کے آرڈر دھڑا دھڑ آنے لگے ... اس وقت ہم ہر ناول تقریباً آٹھ آٹھ ہزار شائع کررہے تھے ...

یعنی جمشید سیریز آٹھ ہزار، کامران مرزا سات ہزار اور شوکی برادرز سیریز چھ ہزار ... اب مسئلہ تھا جزیرے کا سمندر کا ... غور کیا گیا ... کتنی تعداد میں شائع کیا جائے ... تمام آرڈر کا حساب لگا یا گیا ... تعداد تقریباً دس ہزار بنی ... ہم نے فیصلہ کیا کہ دس ہزار شائع کر لیتے ہیں ... آخر ناول پریس میں دے دیا گیا ... شائع ہوا تو بائنڈنگ والے کو خبر دار کر دیا گیا کہ وقت پر کتاب تیار کر دیں ... کیونکہ ناول 866 صفحات کا ہے ... بائنڈر نے کہا:

''آپ فکر نہ کریں۔''

اس نے کہنے کو کہہ دیا تھا کہ فکر نہ کریں، لیکن میں فکر مند تھا ... میرا خیال تھا کہ اگر اس نے پھرتی نہ دکھائی تو وہ وقت پر ساری کتاب تیار نہیں کر سکے گا اور ایسا نہ ہو کہ جزیرے کا سمندر 20 تاریخ کو تمام اسٹالوں پر نہ پہنچ سکے ... اس طرح بہت بدنامی ہوتی اور قارئین غصہ جھاڑتے ... چنانچہ دوسرے دن میں صبح سویرے بائنڈر کے پاس پہنچ گیا ... اس کی جگہ بھائی دروازے کے باہر تھی ... میں نے دیکھا، کتاب کی بائنڈنگ تو شروع تھی ... لیکن ابھی بہت تھوڑی کتاب تیار ہوئی تھی ... یہ سب دیکھ کر میں نے ان سے کہا:

''لگتا ہے ... ہم اس مرتبہ وقت پر کتاب مارکیٹ میں نہیں دے سکیں

گے اور قارئین غصہ ہم پر اتاریں گے۔''

''صاحب! آپ فکر نہ کریں ... ابھی ہمارے پاس تین دن ہیں۔''

میں خاموش ہو گیا ... لیکن مجھے دھڑکا لگا رہا... اب مجھے کام کا اتنا تجربہ تو ہو ہی گیا تھا کہ بالکل درست اندازے لگا لیتا تھا ... آخر تین دن بعد جب ہم کتاب اٹھانے گئے تو دیکھا صرف نصف کتاب تیار ہوئی تھی ... میں نے بائنڈر سے کہا۔

''یہ کیا جناب! آپ نے تو کہا تھا کہ ...''

''کیا بتائیں جناب! ہمارے سارے اندازے غلط ہو گئے۔''

''لیکن میں درست اندازہ لگا چکا تھا ... خیر ... اب بھی آپ تیزی دکھائیں ... ہم اس مرتبہ لاہور میں کتاب سب سے آخر میں دیں گے ... باقی شہروں کو پہلے پوسٹ کر دیں گے ... کیونکہ لاہور میں اگر 19 تاریخ کو دی جائے ... تب بھی کوئی حرج نہیں۔''

''میں کام میں اور تیزی لے آتا ہوں ... دوسروں کے آرڈر کو چھوڑ کر باقی ساری کتاب میں آپ کی تیار کر دیتا ہوں۔''

''چلیے ٹھیک ہے۔''

اور پھر بہت ہی مشکل سے اس نے سولہ تاریخ کو لاہور کے علاوہ باقی ساری کتاب دے دی ... ہم نے دھڑا دھڑا بنڈل بنانے شروع کیے ... اس وقت تک ادارے کے لیے سب سے زیادہ تعداد میں یہ ناول شائع ہوا تھا اور تھا بھی اس وقت کا سب سے بڑا ناول ... لاہور کو بھی 19 تاریخ کو ناول دے دیئے گئے ... اس طرح ہم 20 تاریخ کو تمام اسٹالوں پر کتاب پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ... لیکن فوراً ہی ایک نئی اور حیرت انگیز صورتِ حال سامنے آئی ... ہر طرف سے آرڈر آنے لگے ...

''کتاب ختم ہے ... اتنی تعداد میں فوراً اور روانہ کر دیں۔''

ان ہی حالات میں کراچی سے محمد حسین برادرز کا فون آیا...انھیں کتاب ان کے آرڈر کے مطابق ارسال کی تھی ... لیکن اب وہ کہہ رہے تھے ...

''کتاب بالکل ختم ہوچکی ہے ... دو ہزار اور ارسال کر دیں ۔''

میں نے فوراً حساب لگایا اور پریس کے مالک کو فون کیا ... ان کا نام زاہد تھا ... زاہد بشیر ... میں نے فون پر ان سے کہا ۔

'' فوری طور پر تین ہزار کتاب اور شائع کر دیں ۔''

'' اچھا جی ۔'' انہوں نے جواب دیا ۔

ساتھ ہی میں نے بائنڈر سے کہا: ''کتاب اسٹالوں پر بالکل ختم ہوچکی ہے ... تین ہزار اور شائع ہو رہی ہے ... آپ ساتھ ساتھ فرمے اٹھاتے رہیں ... تاکہ جلد ازجلد تیار ہو جائے۔''

'' جی اچھا۔''

تین ہزار کتاب تیار کرکے میں نے وہ بھی بھیج دی ...

جزیرے کا سمندر کا ریکارڈ پھرکوئی کتاب نہ توڑ سکی ... یعنی تیرہ ہزار کتاب کوئی اور شائع نہیں ہو سکی ... آٹھ، نو اور دس ہزار تک ہی تعداد رہی ... لیکن یہ تعداد بھی اس وقت مارکیٹ کے حساب سے ایک بڑا ریکارڈ تھی ... اس سے پہلے بچوں کے ناول اس حساب سے کبھی بھی نہیں چھپے تھے اور نہ آج تک چھپ سکے ہیں ... یہ میں اپنے ملک کی بات کر رہا ہوں ...

ایک روز طاہر ایس ملک نے مشورہ دیا ...

'' سر! ہمیں بچوں کا ایک ماہنامہ بھی شروع کرنا چاہیے۔''

یہ مطالبہ میرے پڑھنے والے اکثر مجھ سے کرتے رہتے تھے... اب طاہر نے کہا تو میں نے سوچا ... اس میں جو زائد محنت ہو گی ... اس کے سلسلے میں طاہر سے کام لیں گے ... سو میں نے اس سے کہا :

'' تب پھر تم دفتر میں ملازمت اختیار کرلو ۔''

’’جی نہیں سر ... میں دفتر کے لیے ہر وہ کام کروں گا ... جس کے لیے آپ مجھے کہیں گے ... لیکن میں ملازمت نہیں کروں گا ... میرا مطلب ہے میں بے تنخواہ ملازم ہوں گا۔‘‘

میں نے اس کی بات مان لی اور ماہنامہ رسالہ شروع کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں ... اس سلسلے میں سب سے پہلے ڈیکلریشن کے لیے درخواست دی گئی ... میں اور طاہر سیکرٹریٹ گئے اور درخواست دے کر چلے آئے، اس سلسلے میں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی ... سفارش کرانی پڑی... تب کہیں جا کر چھ ماہ بعد ڈیکلریشن منظور ہوا... رسالے کا نام ہم نے چاند ستارے رکھا تھا ... ناولوں میں اس کا اشتہار شروع ہوا ... آرٹسٹ رکھا گیا ... شمارہ پیسٹ کرنے والا رکھا گیا ... کتابت کے لیے بھی ایک اور آدمی رکھا گیا ...

اس طرح نومبر 1988 میں چاند ستارے شروع ہوا ... اس کا مدیر اعلیٰ میں تھا، مدیر طاہر ایس ملک تھے ... رسالے کے لیے ہم نے بہت دوڑ دھوپ کی ... لیکن ہم اس کے لیے اشتہارات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے ... ہمیں یہ فن آتا ہی نہیں تھا ... اس طرح رسالہ نقصان میں چلتا رہا۔

تقریباً تین یا ساڑھے تین سال تک ہم جیسے تیسے چاند ستارے نکالتے ... مواد کے اعتبار سے رسالہ بہت اچھا مانا گیا ... بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی بچوں کا ادب کے ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر صاحب نے اس کے مواد کی ہمیشہ تعریف کی ... اور بھی لوگوں نے ہماری کوششوں کو سراہا ...

لیکن... رسائل اور اخبارات اشتہارات کے بغیر چھپ ہی نہیں سکتے ... کیونکہ ان پر خرچ بہت ہوتا ہے...اور آخر تین سال بعد میں نے چاند ستارے بند کرنے کی ٹھان لی ... کیونکہ ناولوں کا اچھا بھلا منافع چاند ستارے پر لگ رہا تھا ... بند کرنے کی صورت میں ناولوں کا منافع تو محفوظ رہتا... میں نے طاہر سے کہا۔

''میں چاند ستارے بند کر رہا ہوں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر ... چاند ستارے بند نہ کریں۔''

''طاہر ... چاند ستارے کی وجہ سے میرا ناولوں کا کام بہت متاثر ہو رہا ہے ... اگر میں نے چاند ستارے بند نہ کیا تو کہیں ناول نہ بند کرنے پڑ جائیں ... اور ناول بند ہو گئے تو چاند ستارے خود بخود بند جائے گا۔''

''سر! میں تو یہی کہوں گا ... آپ چاند ستارے بند نہ کریں۔''

''نہیں طاہر! میں فیصلہ کر چکا ہوں۔''

''اچھی بات ہے ... جیسے آپ کی مرضی ... پھر آپ مجھے اجازت دیں ... چاند ستارے اب میں جاری رکھوں گا۔''

''تم بھی نقصان اٹھاؤ گے ... لہٰذا میں تو یہی کہوں گا، یہ کام نہ کرو۔''

''سر! مجھے کوشش کرنے دیں۔''

''بے وقوف نہ بنو طاہر ... جب میں اس سے کچھ نہیں کما سکا تو تم کیسے کما لو گے۔''

''سر! مجھے قسمت آزما لینے دیں۔'' اس نے التجا کی۔

''اچھا طاہر ... تمہاری مرضی ... لیکن اس بات کو بھولنا نہیں کہ میں نے تمھیں ہر طرح روکنے کی کوشش کی ہے۔''

''میں یہ بات یاد رکھوں گا۔''

اس طرح طاہر نے اردو بازار کے آس پاس بالائی منزل پر ایک الگ دفتر کرائے پر لیا ... اس پر چاند ستارے کا بورڈ لگوایا اور شمارہ شائع کرنا شروع کر دیا ... اس نے سات ماہ تک چاند ستارے نکالا اور آخر 36 ہزار نقصان اٹھانے کے بعد بند کرنے پر مجبور ہو گیا ...

چاند ستارے کے دوران میں نے منی خاص نمبر شروع کیے ... یعنی سو سوا سو صفحات کے چار ناولوں کی بجائے دو سوا دو سو صفحات کے دو ناول شروع ہوئے

... کچھ عرصہ تک یہ سلسلہ بھی کامیابی سے چلتا رہا پھر ایسا ہوا کہ چار ناولوں جتنی ضخامت کا ایک ہی ناول لکھا گیا ... اس ناول کو میڈیم خاص نمبر کا نام دیا گیا ... اب خاص نمبروں کی مانگ زیادہ ہونے لگی ... قارئین مجھ سے کہتے تھے:

'' آپ اپنا ریکارڈ خود ہی توڑ دیں ... کوئی اور تو شاید توڑے گا نہیں ... مثلاً میں نے جب جزیرے کا سمندر لکھا تھا اور وہ آٹھ سو صفحات کا تھا تو قارئین نے کہنا شروع کہا:

'' اب آپ اس سے بھی بڑا ناول لکھیں ... یعنی ہزار صفحات کا۔''

میں قارئین کی خواہشات پڑھ کر ہنس پڑتا تھا ... ان دنوں ڈاک کا کیا حال تھا ... اس کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو ...

میں اسی روز جھنگ سے اپنی کار پر لاہور پہنچا تھا ... ٹیوٹا فروخت کر کے میں نے شیراڈ خرید لی تھی اور اب اس پر لاہور آنے جانے لگا تھا ...

شیراڈ دفتر کے باہر یعنی گلی میں کھڑی تھی ... میں سعید نامدار صاحب سے باہر ہی کھڑا کوئی بات کر رہا تھا کہ اتنے میں ڈاکیا آتا نظر آیا ... اس کے ہاتھ میں ڈاک کے دو تھیلے تھے ... ایک تھیلہ چھوٹا تھا اور دوسرا بڑا ... ڈاکیے نے نزدیک آکر کہا۔

'' اپنی ڈاک لے لیں ...ایک تھیلے میں صرف آپ کی ڈاک ہے ... دوسرے میں پورے ساندے کی۔''

اس کی بات سن کر میں نے خیال کیا کہ چھوٹا تھیلا ہمارا ہے ... کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ پورے ساندے کی ڈاک اشتیاق پبلی کیشنز کی ڈاک سے کم ہو ... لیکن یہ میرا خیال تھا ... اور غلط خیال تھا ... کیونکہ ڈاکیے نے بڑا تھیلا کار کی ڈکی پر الٹ دیا تھا ... وہ تمام خطوط اشتیاق پبلی کیشنز کے تھے اور چھوٹے تھیلے میں پورے ساندے کی ڈاک تھی ... یہ دیکھ کر میں اور سعید نامدار ہنسنے لگے ... میں نے ڈاکیے کو کچھ انعام بھی دیا ... کھانے کی دعوت تو اسے اکثر دی جاتی تھی ... اور وقت

ہونے کی صورت میں وہ کھانے میں شامل بھی ہو جاتا تھا...

ہم سب لوگ مل کر کھانا کھاتے تھے ... یعنی میں ... سعید نامدار ... طاہر ... تینوں ملازم اور رفیق مغل ... جس روز میں لاہور آتا تھا ، اس روز رفیق مغل بھی ملنے کے لیے ضرور آتے تھے ... ہم اکٹھے کھانا کھاتے اور ظہر کی نماز ادا کرتے ...

یہ معمول جاری رہا... ناول چونکہ پورے ملک میں جار ہے تھے اور ان میں ہماری سوچ کے مطابق صحیح عقیدے کی بات بھی ہوتی تھی، اس لیے پورے ملک سے مخالف فرقوں کے خطوط آنے لگے ...یہ خطوط مناظرانہ قسم کے ہوتے تھے ... ان کے جوابات دینے کا سلسلہ شروع ہوا ... اس لیے مجھے ہر موضوع پر کتابیں خریدنا پڑیں ... اس وقت مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ مستقبل میں یہ کتب میرے کس طرح کام آئیں گی ... میں نے احادیث کی مشہور کتب کے سیٹ خرید لیے، تفاسیر بھی خرید لیں ... سیرت پر کتب خریدلیں، خلفائے راشدین پر بھی کتب جمع کر لیں ... اس طرح آہستہ آہستہ میرا کمرہ لائبریری نظر آنے لگا ... لیکن میں نے پھر بھی کتب کی خریداری کا سلسلہ بند نہیں کیاا ور ابھی بھی یہ سلسلہ بند نہیں ہوا جاری ہے ... ضرورت کی کتب خریدنا رہتا ہوں ...

اب میرے تین سیریز پر مشتمل ناولوں کے ساتھ آفتاب احمد کا بھی ایک ناول باقاعدہ شائع ہوتا ... میں آفتاب کو بھی ناول کا باقاعدہ معاوضہ ادا کرتا رہا...

نقش محمد صاحب کی شراکت میں میں نے جو معاہدہ کیا تھا ... ان سے الگ ہونے کے بعد میں نے وہ سارے کام شروع کیے ... یعنی ملازمین کو ہر عید پر ڈبل تنخواہ دیتا تھا ... غریب طالب علموں کو وظیفے بھیجتا تھا ... زکوٰۃ کا پورا پورا حساب کتاب کرتا تھا اور اس میں کوئی کمی کرنے کی بالکل کوشش نہیں کرتا تھا ... پھر ناولوں میں سوالات شروع کیے ، ان کے درست جوابات پر انعامات بھی جاری کیے جاتے تھے ...

☆☆☆☆☆

O

ایک روز ایک خاتون کا فون موصول ہوا ... کہہ رہی تھیں :

'' اشتیاق صاحب ! میں روزنامہ ڈان کراچی سے بات کر رہی ہوں ... لاہور میں ان کی نامہ نگار ہوں ... نائلہ داؤد نام ہے ... ڈان کی انتظامیہ آپ سے انٹرویو کرنا چاہتی ہے ... آپ میرے گھر آنا پسند کریں گے یا میں آپ کے ہاں آؤں۔''

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی ... ڈان ملک کا مشہور و معروف انگریزی اخبار ہے... آخر میں نے ان سے کہا ۔

'' جیسے آپ کی مرضی ۔''

'' تو پھر کل دوپہر میرے ہاں آجائیں ... یہیں آرام سے انٹرویو کرلیں گے۔''

'' جی بہتر ... پتا لکھوا دیں ۔''

انہوں نے پتا لکھوا دیا ... پتے تلاش کرنے کا فن مجھے نہیں آتا... میں نے طاہر سے کہا: '' یار تم میرے ساتھ چلنا ...ایک تو تم گھر آسانی سے تلاش کر لو گے ... دوسرے تم ساتھ ہو گے تو ذرا میں اچھے انداز میں سوالات کے جوابات دے سکوں گا، ورنہ گھبراؤں گا۔''

دوسرے دن ہم نائلہ داؤد صاحبہ کی کوٹھی پہنچ گئے ... وہ بہت پر اخلاق انداز سے ملیں ... اپنے پر تکلف ڈرائنگ روم میں ہمیں بٹھایا ... پہلے کھانا کھایا گیا

... پھرانٹرویو کی باری آئی...

اب نائلہ داؤد نے سوالات شروع کیے ... میرے لیے چونکہ یہ پہلا موقع نہیں تھا ... جنگ میں ایک شام منانے کے موقع پر سوالات کے جوابات دے چکا تھا ...ٹی وی پروگرام میں ٹی وی میزبان غزالہ قریشی کا سامنا کرچکا تھا ... اور بھی کئی لوگ انٹرویو کر چکے تھے ... اس لیے بے تکلفی سے سوالات کے جوابات دیتا چلا گیا ... انٹرویو کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا ... آخر جب انہوں نے تمام سوالات کر لیے اور کرنے کے لیے اور کوئی سوال نہیں رہ گیا ... تو انہوں نے کہا۔

''بس ٹھیک ہے ... ہر اتوار ہمارا میگزین شائع ہوتا ہے ... یہ اس میں شائع ہو گا ... جس اتوار کو شائع ہو گا ... میں آپ کو فون کر دوں گی۔''

''جی شکریہ۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ انٹرویو 19 فروری 1996 کو شائع ہوا ... دو صفحات پر مشتمل تھا ... انہوں نے میری پورے صفحے کی تصویر بھی لگائی ...

غرض ان حالات میں ادارہ زبردست چل رہا تھا ...اور اللہ کی مہربانی سے ناول خوب فروخت ہو رہے تھے ... میں ان دنوں بھی اکثر سوچا کرتا تھا... ایک شخص جسے کچھ بھی نہیں آتا تھا ... جو ریلوے میں اور پھر میونسپل کارپوریشن میں 66روپے ماہوار کی ملازمت کرتا تھا ... وہ کیسے اس مقام تک پہنچا ... میں خود ہی جواب دیتا: ''یہ سب اللہ تعالیٰ کے کام ہیں ... وہ جو چاہے عطا کردے۔''

اور پھر غیر محسوس طور پر ایک عالمی تبدیلی آئی ... اس تبدیلی نے سب ہی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ... خاص طور پر مطالعے کا شوق اس تبدیلی کی زد میں آیا ... لیکن میں اس تبدیلی کو فوری طور پرمحسوس نہ کر سکا ... میں اپنے آپ میں مگن رہا ... لوگوں نے بار بار مجھے مشورے دیے ... آپ ساتھ میں یہ کاروبار کر لیں ، وہ کاروبار کر لیں ... کم ازکم ایک پریس ہی لگا لیں ... جگہ تو آپ کے پاس ہے ... لیکن میں جواب میں یہی کہتا رہا :

''مجھے کیا ضرورت ہے ادھر ادھر ٹانگیں پھنسانے کی ...میرے ناول برابر فروخت ہو رہے ہیں۔''

دراصل میرا ذہن کاروباری نہیں تھا ... میں اس رجحان کو سمجھ نہ سکا ... اپنے آپ میں مگن رہا تھا اور ایک دن نتیجہ میرے سامنے آ کر رہا ...

تبدیلی کی یہ لہر 1994ء کے بعد محسوس ہونے لگی تھی... معاملہ تو اس سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن مجھے اس وقت پتا چلا جب اشاعت کمی کی طرف گامزن ہوئی ... اس کی وضاحت یہ ہے۔

عالمی سطح پر سینماؤں میں فلم دیکھنا ایک تفریح تھی ... گھروں میں فلم کا دیکھا جانا کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا ... یہاں میری مراد اپنے ملک کی حد تک ہے ... یورپ میں یہ تبدیلی اس سے کہیں پہلے شروع ہوئی ہوگی ... میرا مطلب وی سی آر سے ہے ... وی سی آر ملک میں شروع ہوا، انڈین فلموں کی قانونی یا غیر قانونی آمد شروع ہوئی ... مجھے یاد ہے ... شروع شروع میں لوگ بہت چھپ چھپا کر وی سی آر کی کیسٹ لاتے تھے ... وی سی آر کی دکان سے کیسٹ آسانی سے نہیں ملتی تھی ... لوگ راز داری سے دیتے تھے ...ڈرا کرتے تھے... پھر یہ چیز بالکل عام ہو گئی ... انڈیا کی فلموں کی کیسٹیں کھلے عام ملنے لگیں ... آہستہ آہستہ پڑھنے کا رجحان کم ہونے لگا ... تعداد اشاعت کم ہونے لگی ... کتابوں کی لائبریریوں کی جگہ کیسٹوں کی لائبریریوں نے لے لیں ... جن ریکوں میں پہلے کتابیں رکھی جاتی تھیں، ان میں کیسٹیں نظر آنے لگیں ... ان تمام حالات کے باوجود پڑھنے والے بالکل ہی کم نہیں ہوگئے تھے ... شیدائی قسم کے لوگ اب بھی ناولوں کے قاری تھے... اور وہ باقاعدگی سے ناول خریدتے تھے ... لیکن ظاہر ہے ... ایجنسی ہولڈرز اب پہلے جیسی توجہ نہیں دیتے تھے ... ان کے رویوں میں بھی روکھا پن آ گیا ... جو رفیق مغل خود چل کر دفتر آیا کرتے تھے ... جنھوں نے لاہور کی ایجنسی کی درد بھرے انداز میں درخواست کی تھی ... وہ ملنے

سے بھی گئے... بس فون کر دیتے تھے: ''اتنی اتنی کتب اخبار مارکیٹ بھیج دیں۔''

ملازم وہاں کتب لے جاتا اور ان سے پیسے لے آتا ...اب کبھی مہینوں میں بھی ان کی شکل دیکھنے میں نہیں آتی تھی ... جب کہ پہلے وہ بلا ناغہ روزانہ آیا کرتے تھے ... ہم ساتھ کھاتے پیتے تھے ... لیکن وہ معمول گویا اب اڑنچھو ہوتا جا رہا تھا۔

راولپنڈی کے ڈیلر اشرف بک ایجنسی والے ...جو کبھی یہ درخواست لے کر آئے تھے کہ نصف بل ہم ایڈوانس دیا کریں گے اور نصف ایک ماہ بعد ... وہ بھی بھول گئے ... کراچی کے ڈیلر محمد حسین اینڈ برادرز کے روّیے میں بھی تکلیف دہ تبدیلی آ گئی ... اب میں اس درد کو محسوس کرنے لگا ... شدید احساس ہونے لگا ... کہ یہ دنیا کیا ہے ... اس دنیا میں رکھا کیا ہے ... یہ دنیا اور دنیا کی چیزیں تو کچھ بھی نہیں ...

ان حالات میں ایک بہت بڑا دکھ میری زندگی میں آیا ... مجھے اس دکھ نے ہلکان کر دیا ...

1967 میں شادی ہوئی تھی ... 1994ء تک میرے ہاں گیارہ بچے ہو چکے تھے... سب سے پہلا بچہ 6ماہ کی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔ 1990ء کے آس پاس ایک بچی پیدا ہوئی ... اس کے دل میں سوراخ تھا ... بہت علاج کرائے لیکن وہ ڈیڑھ سال کی عمر میں فوت ہو گئی ... لیکن یہ غم بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔

بڑا غم اس وقت آیا جب ایک روز میری اٹھارہ سال کی بیٹی راحت کی طبیعت اچانک خراب رہنے لگی ... پھر اسے بخار نے آلیا ... میں ان دنوں اس کے جہیز کا سامان جمع کرنے میں لگا ہوا تھا...اس کے لیے بازار سے بہت ہی پیاری چیزیں خرید کر لاتا تھا ... کراکری والا میرا دوست تھا ... میں نے اس سے کہہ رکھا تھا... جو بھی غیر ملکی بہترین چیز آیا کرے ... پہلے مجھے دکھایا کرو ... اور وہ ایسا ہی کرتا تھا ... میں وہ چیز فوراً راحت کے لیے خرید لیتا تھا ... اور ہم

اس کا رشتہ طے کر دینے کی فکر میں تھے ... بڑی بیٹی فرحت کی شادی کر چکا تھا ... بڑے بیٹے نوید اور راحت کی شادی کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

راحت کو ڈاکٹروں سے چیک کرایا گیا... انہوں نے کوئی دماغی مسئلہ بتایا ... بقرعید سے دو دن پہلے بخار شروع ہوا ... عید والے دن اس نے نہا کر کپڑے پہنے ... دوسرے بچوں کے ساتھ چچاؤں کے گھر گئی ... شام کو اس کا بخار تیز ہو گیا ... ڈاکٹر کے پاس لے گئے ... اس نے دو گولیاں دیں کہ رات کو یہ دے دیں ... صبح تک بخار اتر جائے گا ...

ہم بچی کو لے آئے ... گولیاں کھا کر وہ سو گئی ... رات کو تین بجے کے قریب اس نے مجھے جگایا ... کہنے لگی :

'' میں بہت گھبراہٹ محسوس کر رہی ہوں ۔''

میں نے اس کی پیشانی چھو کر دیکھی ... بخار بہت ہی معمولی سا رہ گیا تھا ... میں نے اطمینان محسوس کیا ... اور اس سے کہا۔

'' بخار تو بہت کم ہو گیا ہے راحت ... اللہ مہربانی فرمائیں گے ... سو جاؤ صبح ڈاکٹر کے پاس جائیں گے ۔''

'' اچھا !'' اس نے کہا اور لیٹ گئی ... جلد ہی وہ سو چکی تھی ... میں بے فکر ہو گیا ... صبح اذان سن کر اٹھا ... وضو کیا اور نماز کے لیے چلا گیا ... میری عادت ہے ... مسجد میں نماز کے بعد اشراق کے وقت تک ٹھہرتا ہوں ... نماز کے بعد مسجد میں ہی تھا کہ نوید وہاں آ گیا ... اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

'' راحت کی طبیعت بہت خراب ہے ۔''

میں اس کے ساتھ تیز تیز چلتا گھر پہنچا ... راحت کا سانس اکھڑ رہا تھا... اس کے منہ سے جھاگ بے تحاشہ نکل رہے تھے اور میرا چھوٹا بیٹا آصف ٹشو پیپر سے بار بار جھاگ صاف کر رہا تھا... پھر میرے دیکھتے دیکھتے بچی نے دم توڑ دیا ...

یہ ایسا صدمہ تھا کہ ایسا صدمہ میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا ... نوید کو جب لاہور کی پولیس پکڑ کر لے گئی تھی، اس وقت بھی میں بہت زیادہ گھبرایا تھا ... لیکن بہرحال وہ اس قدر بڑا صدمہ نہیں تھا ...پھر اس وقت نوید کی رہائی کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا ... اور یہ امید تھی کہ نوید جلد چھوٹ جائے گا ... کیونکہ وہ بالکل بے قصور تھا ... لیکن یہ صدمہ بہت بڑا صدمہ تھا ...

ہمارے ہاں قربانی بھی اسی روز ہونی تھی ... بڑا جانور خریدا ہوا تھا ... قصاب کو وقت دیا ہوا تھا ... اور ہم بچی کے کفن دفن میں لگے تھے ... میں نے اپنے سالوں سے کہہ دیا ...

"تم لوگ قربانی کرا کے تمام گوشت محلے داروں اور رشتے داروں میں تقسیم کر دو۔"

اسی شام ... یعنی عید کے دوسرے دن راحت قبرستان پہنچ گئی...اور ہمیں روتا چھوڑ گئی ... ہم چھ ماہ تک روتے رہے ... چھ ماہ بعد کچھ سنبھل سکے۔

آج بھی جب میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں ...تو یہ لکھنا میرے لیے بہت ہی مشکل ہو رہا ہے ... لیکن یہ زندگی ہے ... زندگی میں دکھ سکھ ساتھ چلتے ہیں ...انسان بے بس ہے ... اللہ جو چاہتے ہیں، کرتے ہیں ... اب مجھے اپنے گھر میں خوشگواری لانے کے لیے یہ بات سوجھی کہ نوید کا رشتہ کر دیتے ہیں۔

گھر میں دلہن آجائے گی...ماحول تبدیل ہوگا اور ہمارا دھیان بٹے گا ... میں نے نوید کا رشتہ ایک جگہ طے کیا ہوا تھا ...میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا ...اور کہا کہ ابھی وہ دو سال تک شادی نہیں کر سکتے ... میں نے ان سے کہا : " آپ ہمارے گھر کے حالات کو دیکھیں ... ہماری پریشانی کو دیکھیں ... ہم سب کے سب غم کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں ... اس سے ہمارے گھر میں تبدیلی آجائے گی۔"

"نہیں ... ہم ابھی نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے سخت رویہ اختیار کیا ... تو مجھے کو غصّہ آگیا ...میں نے ان سے کہا: ''تب پھر ہم کہیں اور رشتہ دیکھ لیتے ہیں ۔''

''آپ کی مرضی ۔'' انہوں نے بھی روکھا جواب دیا ۔

میں بھنا کر گھر چلا آیا ... اور گھر والوں سے کہا :

'' وہ تو ابھی شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ... اب تم لوگ کہیں اور رشتہ تلاش کرنا شروع کر دو ... ہم انشاء اللہ جلد نوید کی شادی کر دیں گے۔''

☆☆☆☆☆

O

ان دنوں میں بازار لوہاراں والی دکان پر کچھ وقت کے لیے بیٹھنے لگا تھا ... اور ایسا ایک دوست کے مشورے پر کیا تھا ... اس کا پس منظر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا ... چند سال پہلے مجھے ہومیو پیتھی کی ایک کتاب کہیں سے ملی تھی ... میں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا ... پھر اور کتابیں خریدیں اور ان کو بھی پڑھا ... اس طرح ہومیو پیتھک دواؤں سے واقفیت ہونے لگی ... وہ دوائیں خریدنے لگا ... گھر والوں کا علاج ان دواؤں سے کرنے لگا ... پھر محلے کے لوگ بھی میرے پاس آنے لگے ... میں انھیں مفت دوا دیتا تھا ... کسی کے بچے کو بخار ہوتا، نزلہ زکام ہوتا یا کھانسی ہو جاتی ... دست لگ جاتے ... پیٹ درد ہو جاتا تو میرے پاس آجاتا ... میں دوا دے دیتا ... اس طرح آہستہ آہستہ میں مشہور ہونے لگا... پھر دور دور سے لوگ آنے لگے... اس معاملے میں کئی حیرت انگیز کامیابیاں ہونے لگیں ... لوگ بھی حیران ہوتے تھے اور میں بھی ... اب گھر میں بہت سی دوائیں جمع ہو گئی تھیں ... جب کہ بازار لوہاراں والی دکان بے کار پڑی تھی۔ دکان والد صاحب کے کہنے پر خرید لی تھی ... انہوں نے کہا تھا۔

''کبھی کام آجائے گی۔''

ایک دوست نے ایک دن کہا:

'' اب آپ کے پاس اچھے بھلے مریض آنے لگ گئے ہیں ... ان سے آپ کچھ لیتے نہیں ... مفت دوا دے دیتے ہیں ... اگر یہی دوائیں اس دکان

میں رکھ لیں اور دوا کے کچھ پیسے لے لیا کریں تو کیا حرج ہے۔"

اس پر میں نے کہا : "لیکن میں کوئی باقاعدہ ڈاکٹر نہیں ہوں ... میرے پاس کوئی سند نہیں ہے ... "

اس کے جواب میں انھوں نے کہا۔

" ہومیو پیتھک دواؤں کے بارے میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ وہ بے ضرر ہیں ... پھر آپ کو اچھا بھلا تجربہ ہو چکا ہے ... میرے خیال میں تو اس میں کوئی حرج نہیں ... آپ کسی ہومیو کالج میں داخلہ لے سکتے ہیں ... اس طرح ڈپلومہ آپ کو بعد میں ملتا رہے گا۔"

مجھے ان کا مشورہ اچھا لگا ... دکان میں ریک لگوائے اور دوائیں ان میں سیٹ کر دیں ... ڈسپنسری بنائی گئی ... میز کرسی اور مریضوں کے لیے کرسیاں سیٹ کی گئیں ... اس طرح ہمارا کلینک شروع ہوا ... پہلے روز تین مریض آئے ... چار دن کی دوا کے ان سے چھ روپے وصول کیے ... گویا پہلے دن 18 روپے کی گاہکی ہوئی ... کچھ لوگ مجھ پر ہنستے تھے کہ دیکھو ... ناول لکھتے لکھتے اسے کیا سوجھی ... لیکن میں نے پروانہ کی ... کیونکہ جب میں نے پبلشنگ کا ادارہ قائم کیا تھا ... لوگ تو اس وقت بھی ہنستے تھے۔

شام کا وقت تھا ... میں کلینک پر بیٹھا تھا اور مریضوں کو چیک کر رہا تھا ... نوید نسخے بنا رہا تھا ، ایسے میں ایک خاتون اندر داخل ہوئیں ... وہ پردے میں تھیں ... اندر آ کر وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں جب فارغ ہوا تو اس کی طرف دیکھا:

" ہاں ... آپ فرمائیں۔"

" آپ اشتیاق احمد ہیں۔"

" جی ہاں ! فرمایئے ... کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

اب اس نے کہا: " کراچی سے آئی ہوں ... اور واپس جانے کے لئے

نہیں آئی ... آپ کے ناولوں کی شیدائی ہوں۔''

اس کا جملہ میری سمجھ میں نہ آیا... میں نے کہا:

'' میں سمجھا نہیں ... آپ نے کیا کہا۔''

'' کراچی سے آئی ہوں اور واپس جانے کے لئے نہیں آئی۔''

'' میں اب بھی نہیں سمجھا ...''

'' تو پھر سن لیں ... اپنے گھر سے بھاگ آئی ہوں اور سیدھی آپ کے پاس چلی آرہی ہوں ... پہلے لاہور گئی تھی آپ کے دفتر ... وہاں بتایا گیا کہ آپ جھنگ میں ہیں ... ان سے پتا لیا اور یہاں آگئی اور اب اپنے گھر بھی نہیں جاؤں گی ... ہاں ! اگر آپ نے سہارا نہ دیا تو یہاں سے نکل کر جدھر منہ اٹھا ادھر چلی جاؤں گی ... ظاہر ہے غلط ہاتھوں میں پڑوں گی ، اس کا گناہ آپ کے سر ہوگا۔''

اب ساری بات سمجھ میں آچکی تھی ... میں اور نوید سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے ... دوسری طرف میری سٹی گم ہو چکی تھی ... کیونکہ ایک نوجوان لڑکی گھر سے بھاگ کر سیدھی میرے کلینک میں آگئی تھی ... اور دھمکی دے رہی تھی ... مجھے اپنا دماغ گھومتا محسوس ہورہا تھا ...میں سوچ رہا تھا ... اسے بھلا میں اپنے گھر میں کیسے رکھ سکتا ہوں ...

دوسری بات ... یہ میرے خلاف کوئی چکر بھی ہوسکتا تھا ...کوئی سازش ہو سکتی تھی ،کوئی مرزائی جال بھی ہوسکتا تھا ... ان دنوں مرزائی بھی میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے ...غرض سو طرح کے خیالات مجھے گھیرے میں لے چکے تھے۔

ایک احساس یہ بھی تھا کہ اگر میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں کرتا اور کہہ دیتا ہوں کہ تم میرے کلینک سے چلی جاؤ ، میں تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تو ظاہر ہے یہ چلی تو جائے گی ...لیکن اگر یہ واقعی غلط ہاتھوں میں پڑ گئی تو ...

یہ سوال سب سے زیادہ پریشان کن تھا ...سوچ سوچ کر ایک بات ذہن میں آئی ... میرے بالکل پڑوس میں ایک سی آئی ڈی والے رہتے تھے ... ان کا نام

عبدالرحمٰن تھا ... میں نے نوید کو بھیج کر انہیں بلایا ... اور ساری بات بتائی ... کیونکہ میں خود ڈر رہا تھا کہ کہیں مجھ پر پولیس کیس نہ بن جائے۔ لڑکی کے گھر والے مجھ پر اغوا کا مقدمہ بھی بنا سکتے تھے ... عبدالرحمٰن صاحب نے اس سے بہت سے سوالات پوچھے ... اس کے گھر کے افراد کے بارے میں پوچھا ... کراچی کا اس کے گھر کا فون نمبر پوچھا ... پھر وہاں فون کیا ... ان سے گول مول انداز میں پوچھا ... مبین صاحبہ کہاں ہیں ... اس خاتون کا نام مبین تھا۔ گھر والوں نے بتایا کہ وہ دو دن سے غائب ہے ... نہ جانے کہاں چلی گئی ہے ... ہم نے اتنا سن کر فون بند کر دیا ... اب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ لڑکی کسی سازش کے تحت میرے پاس نہیں آئی ... اب عبدالرحمٰن سے مشورہ کیا کہ کیا کریں ... انہوں نے کہا:

''رات تو انہیں اپنے گھر میں رکھیں ... صبح سوچیں گے۔''

اس طرح وہ اس رات ہمارے گھر میں ہی رہی۔

اس دوران میں نے اپنے دوستوں سے بھی مشورہ کیا ... ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اسے کسی عورتوں کے مدرسے میں داخل کرا دیں ... وہاں دوسری لڑکیوں کے ساتھ قرآن کی تعلیم حاصل کرے گی ... یہ بات دل کو لگی ... میرے پاس ہر رمضان میں بچیوں کے ایک مدرسے کے مہتمم چندے کے لئے آیا کرتے تھے ... میں ان کے پاس گیا ... صورتحال انہیں بتائی ... انہوں نے بھی یہی کہا:

''آپ فکر نہ کریں ... لڑکی کو یہاں لے آئیں۔''

اس طرح ہم نے اسے مدرسے میں چھوڑ دیا ... انہیں دنوں رمضان شروع ہوگیا ... وہ ایک ماہ مدرسے میں رہی ... رمضان کی آخری تاریخوں میں، میں مدرسہ گیا ... مہتمم صاحب سے ملا ... میں نے ان سے کہا:

''عید پر تمام بچیاں اپنے گھر چلی جائیں گی ... یہ کس طرح اکیلی یہاں رہے گی ... یہ عید کے دن ہمارے گھر میں گزارے گی۔''

انہوں نے کہا: ''ٹھیک ہے۔''

اس طرح ہم اسے گھر لے آئے۔ اس روز میرا سالا محمد سلیم (مرحوم) میرے پاس آیا ... وہ دودھ کا کروبار کرتا تھا ... اس نے آتے ہی مجھ سے کہا:

”میں نے سنا ہے ... آپ کے پاس اس طرح اس طرح ایک لڑکی آئی ہے ... میرا ایک دودھ کا بیوپاری ہے ... دیہاتوں سے دودھ لاتا ہے ... اس نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہے ... اور اب وہ کہیں شادی کرنا چاہتا ہے۔“

میں نے مبین سے پوچھا تو اس نے کہا:

”ٹھیک ہے ... میں اس شخص کو دیکھ لوں ... پھر جواب دوں گی۔“

دوسرے دن میں نے اس شخص کو بلا لیا۔ اس کا نام منظور احمد تھا ... میں نے دونوں کو آمنے سامنے کردیا ... منضور کو ساری صورتِ حال بتا دی ... تاکہ وہ پھر کوئی کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ کرے۔

دونوں شادی کے لئے تیار ہوگئے۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ لڑکی کے ماں باپ موجود نہیں تھے ... لہٰذا یہ شادی عدالت میں ہوسکتی تھی ... اس طرح وکیل کی خدمات حاصل کی گئیں اور یہ شادی ہوگئی۔

ہم نے اپنے گھر پر اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی تقریب بھی کی ... اپنے طور پر بھی مولوی صاحب کو بلوایا ... انہوں نے نکاح پڑھایا ... کھانا کھایا گیا ... اور پھر عزت سے مبین کو رخصت کر دیا۔

شادی کے بعد وہ مہینے دو مہینے میں ایک چکر لگا لیتی تھی ... ایک دو بار ہم بھی اس کے شوہر کے دیہات گئے۔ مبین اب چار بچوں کی ماں ہے اور منظور احمد کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہی ہے ... اب جب وہ ملنے کے لئے آتی ہے تو اس کے بچے مجھے نانا کہتے ہیں۔

یہ معاملہ بھی ناولوں کے سلسلے میں پیش آیا ... وہ جنون کی حد تک میرے ناولوں کی شیدائی تھی ... غصے کی حالت میں جب وہ گھر سے نکل آئی تھی تو اسے بس یہ یقین تھا کہ پاکستان میں میری کوئی مدد کرسکتا ہے تو وہ ہے اشتیاق احمد بس اللہ کا

اس لڑکے کو میں حافظ فیض صاحب کی دکان پر اکثر دیکھتا تھا۔

'' جی ہاں ! '' اس نے کہا۔

'' اور حافظ صاحب رائے ونڈ گئے ہوئے ہیں۔''

'' جی ہاں ! کل آجائیں گے۔''

'' اچھی بات ہے ... یہ دوائیں لے جائیں اور بچی کو دیتے رہیں۔''

میں نے اسے طریقہ بتایا اور وہ چلا گیا ... دوسرے دن میں حافظ فیض صاحب کے پاس چلا گیا ... میں نے ابھی گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا ... حافظ صاحب مجھے جانتے تھے ... میرے والد صاحب کو بھی جانتے تھے اور ہمارے کاروبار وغیرہ کو بھی اچھی طرح جانتے تھے ... میں نے انھیں سلام کیا ... انہوں نے خوش اخلاقی سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا ...

اب میں الجھن میں پڑ گیا کہ بات کس طرح شروع کروں ... برادری کے تو تھے نہیں ... بس علیک سلیک تھی ... آخر میں نے کہا۔

'' کل آپ کی پوتی بے ہوش ہوگئی تھیں ... آپ کے پوتے مجھے گھر لے گئے تھے ... دوا دی تو وہ ہوش میں آگئی تھی۔''

'' ہاں بچے نے بتایا تھا ... آپ کا شکریہ ... ہم میں سے کوئی بھی گھر میں نہیں تھا۔''

'' کوئی بات نہیں ... بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک بات کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں ... بات کچھ ایسی ہی ہے کہ آپ کو ناگوار بھی گزر سکتی ہے۔ اس لیے میں پہلے ہی بتا رہا ہوں ... مہربانی فرما کر برا نہ مانیے گا ... ہاں بات منظور نہ ہو تو بے دھڑک کہہ دیجیے گا ... یہ نہیں ہوسکتا۔''

'' کوئی بات نہیں ... آپ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں ... آپ بات کریں۔''

'' بات یہ ہے کہ ہم ان دنوں نوید کے لیے رشتے کی تلاش میں ہیں ...

حکم تھا ... ایسا ہوگیا۔

اب بھی جب آتی ہے تو تمام نئے ناول سمیٹ کر لے جاتی ہے اور آتے ہوئے پرانے پڑھے ہوئے ناول واپس لے آتی ہے۔

یہ زندگی واقعی بہت عجیب ہے۔

☆☆☆

نوید کو دکان پر بطور کمپاؤنڈر رکھا گیا ... اسے نسخہ بنانا آتا تھا، گھر میں اس سے یہ کام لیتا رہتا تھا ... خیال تھا، تعلیم سے فارغ ہوگا تو ہومیو میڈیکل کالج میں داخلہ دلوا دوں گا۔

کلینک پر بیٹھا ناول لکھ رہا تھا کہ ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا گھبرایا ہوا سا اندر داخل ہوا ... وہ جانا پہچانا تھا ... راستے میں علیک سلیک ہوتی رہتی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب ... میری بہن بے ہوش گئی ہے ... مہربانی فرما کر آپ چل کر دیکھ لیں۔''

''اچھی بات ہے۔''

میں نے ہوش میں لانے والی ایک دو دوائیں اٹھائیں اور اس کے ساتھ چل پڑا... وہ گھر زیادہ دور نہیں تھا ... پانچ منٹ بعد میں اس کے ساتھ گھر میں داخل ہوا ... بیرونی کمرے میں بستر پر ایک لڑکی آنکھیں بند کیے لیٹی تھی ... جونہی میں نے اس لڑکی کو دیکھا ... میرے جی میں آئی ... کیوں نہ نوید کے لیے اس لڑکی کا رشتہ مانگا جائے ...

میں نے دوا سنگھائی تو وہ ہوش میں آگئی ... میں کلینک واپس آگیا ... اس کا بھائی ساتھ آیا تھا ... کیونکہ کلینک سے دوائیں بنا کر دینی تھیں ... ابھی نوید نہیں آیا تھا ... دوا بنانے کے دوران میں نے اس کے بھائی سے کہا۔

''یہ بچی فیض صاحب کی پوتی ہے نا۔'' یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ

اس لڑکے کو میں حافظ فیض صاحب کی دکان پر اکثر دیکھتا تھا۔

"جی ہاں!" اس نے کہا۔

"اور حافظ صاحب رائے ونڈ گئے ہوئے ہیں۔"

"جی ہاں! کل آجائیں گے۔"

"اچھی بات ہے ... یہ دوائیں لے جائیں اور بچی کو دیتے رہیں۔"

میں نے اسے طریقہ بتایا اور وہ چلا گیا ... دوسرے دن میں حافظ فیض صاحب کے پاس چلا گیا ... میں نے ابھی گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا ... حافظ صاحب مجھے جانتے تھے ... میرے والد صاحب کو بھی جانتے تھے اور ہمارے کاروبار وغیرہ کو بھی اچھی طرح جانتے تھے ... میں نے انھیں سلام کیا ... انہوں نے خوش اخلاقی سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا ...

اب میں الجھن میں پڑ گیا کہ بات کس طرح شروع کروں ... برادری کے تو تھے نہیں ... بس علیک سلیک تھی ... آخر میں نے کہا۔

"کل آپ کی پوتی بے ہوش ہوگئی تھیں ... آپ کے پوتے مجھے گھر لے گئے تھے ... دوا دی تو وہ ہوش میں آگئی تھی۔"

"ہاں بچے نے بتایا تھا ... آپ کا شکریہ ... ہم میں سے کوئی بھی گھر میں نہیں تھا۔"

"کوئی بات نہیں ... بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک بات کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں ... بات کچھ ایسی ہی ہے کہ آپ کو ناگوار بھی گزر سکتی ہے۔ اس لیے میں پہلے ہی بتا رہا ہوں ... مہربانی فرما کر برا نہ مانیے گا ... ہاں بات منظور نہ ہو تو بے دھڑک کہہ دیجیے گا ... یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کوئی بات نہیں ... آپ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں ... آپ بات کریں۔"

"بات یہ ہے کہ ہم ان دنوں نوید کے لیے رشتے کی تلاش میں ہیں ...

آپ نے نوید کو دیکھا ہوا ہے نا ... کلینک پر ہوتا ہے ... پڑھ بھی رہا ہے۔''

''جی ہاں ! میں نے دیکھا ہوا ہے ... بہت اچھا بچہ ہے ماشاء اللہ !''

''بس تو میں اسی کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

اب وہ بات سمجھ گئے ... ان کے چہرے پر کوئی ناگواری نظر نہ آئی ... بلکہ انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔

''میں اپنے گھر والوں سے بات کروں گا ... پھر آپ کو بتاؤں گا ... آپ ایک دو دن بعد آیئے گا۔''

''جی بہت بہت شکریہ !'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دو دن بعد میں پھر ان کے پاس گیا ... انہوں نے اچھی طرح ہاتھ ملایا اور کہنے لگے:

''ہمارے گھر کی خواتین آج آپ کے گھر آئیں گی۔''

ان کی بات سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا ... اگرچہ میں خود امید لے کر گیا تھا ... لیکن مجھے اس رشتے کے ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا ... لیکن جب انہوں نے یہ بات کہی تو امید بندھنے لگی ...

میں نے گھر آکر بیگم اور بچوں سے کہا : ''نوید کے رشتے کے لیے میں نے ایک جگہ بات کی تھی ... ان کی خواتین آج شام ہمارے گھر آئیں گی۔''

'' ارے واہ بھئی واہ... یہ آپ نے کیا چپکے چپکے کام دکھادیا ... ہمیں بتایا تک نہیں۔'' بیگم بولیں ۔

'' دراصل امید نہیں تھی کہ یہ بات طے ہوجائے گی ... اب جب کہ انہوں نے آنے کا پروگرام بنا لیا ... تو مجھے بتانا پڑا۔''

اس روز حافظ صاحب کے گھر کی خواتین آئیں ... گھر دیکھ کر اور نوید کو دیکھ کر وہ چلی گئیں ... میں پھر تین چار دن کے بعد حافظ صاحب کے پاس گیا ... علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا۔

'' آپ آج اپنے گھر کی خواتین کو ہمارے گھر بھیجیں ... تاکہ وہ بھی بچی کو دیکھ لیں ... ابھی تک تو صرف آپ نے ہی دیکھا ہے نا اسے ... وہ بھی اتفاقیہ۔''

'' جی ہاں ! یہ تو ہے ... اچھی بات ہے ... میں خواتین کو بھیج دوں گا۔''

گھر والے وہاں گئے ... انھیں لڑکی اچھی لگی ... میں نے حافظ صاحب سے پھر ملاقات کی ... انھیں بتایا :

'' میرے گھر والوں کو بچی بہت پسند آئی ہے ... اب آپ فرمائیں۔''

'' اور میرے گھر والوں کو نوید پسند آگیا ہے ... لہٰذا آپ بتائیں ... آپ کب تک شادی چاہتے ہیں۔''

'' جی ... بس ہم تو تین چار ماہ میں چاہتے ہیں۔''

'' اچھی بات ہے ... ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ رشتہ مل جائے تو پھر دیر نہیں کرنی چاہیے... میں گھر مشورہ کر کے بتا دوں گا کہ ہم کب تک کر سکیں گے۔''

'' جی اچھا ! بہت بہت شکریہ ۔''

اس طرح راحت کے فوت ہونے کے صرف چھ ماہ بعد نوید کی شادی ہو گئی ... اس کے جلد ہی بعد ہومیو کالجوں کے داخلے شروع ہو گئے ... میرے مشورے پر اس نے اور پھر اس سے چھوٹے بیٹے توحید نے داخلہ لے لیا ...

آج یہ دونوں ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں ... بازار لوہاراں میں ہمارا کلینک اور اسٹور ہے ... ان کے ڈاکٹر بن جانے کے بعد میں نے کلینک میں جانا چھوڑ دیا ... اور اپنے ناولوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

O

ادھر جزیرے کا سمندر کے بعد بیگال مشن، سی مون کی واپسی ، باطل قیامت اور سنہری چٹان جیسے ضخیم ناول شائع ہو چکے تھے ... اور ہر قسم کے سنگین حالات کے باوجود میرے شیدائی لوگ اب اور بڑا اور بڑا خاص نمبر کی گردان کرنے لگے تھے ... یہاں تک کہ یوڈا پر حملہ لکھا گیا ... اغوا کی ملکہ لکھا گیا ... درمیان میں منی خاص نمبر شائع ہوتے رہے ... پھر خاص قسم کا خاص نمبر برف کے اس پار شائع ہوا اور اس ناول کے بعداور زیادہ ضخیم ناول لکھنے کا مطالبہ ہونے لگا ... خاص نمبر بہرحال پھر اسی ترتیب سے شائع ہو رہے تھے ... یعنی ہر چھ ماہ بعد ایک خاص نمبر ... اس سے آگے پیچھے نہیں... درمیان میں منی خاص نمبر جاری رہے۔

ان حالات میں خاص نمبر دلدل کا سمندر شائع ہوا ... اس نے پسندیدگی کے ریکارڈ قائم کیے ... لیکن پھر اس کے بعد شائع ہونے والا خاص نمبر قیامت کے باغی اس سے بھی زیادہ پسند کیا گیا ...

دائرے کا سمندر 1500 صفحات کا ناول تھا اور اپنے وقت کی یہ ضخامت ریکارڈ ضخامت تھی ... لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ سے مطالبہ شروع ہو گیا کہ اب آپ دو ہزار صفحات کا خاص نمبر لکھ ماریں ... میں خوفزدہ ہو گیا ... کہ اتنے صفحات کا ناول اگر لکھ بھی دیا تو کیا فروخت ہو جائے گا ... کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ قیمت کی وجہ سے فروخت نہ ہو سکے ... اور میرا سارا سرمایہ ڈوب

جائے ... ادھر قارئین کا مطالبہ بڑھتا چلا گیا۔

آخر میں نے اعلان کر دیا کہ آئندہ خاص نمبر دوہزار صفحات کا ہوگا ... اس وقت تک دنیا کے اس پار اور بلیک ہول جیسے خاص نمبر شائع ہو چکے تھے ... 2000 صفحات کا خاص نمبر لکھنے کے لیے میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔

میں ایک خاص وجہ سے بہت خوف زدہ تھا ... میری عادت تھی ... جہاں ناول کا باب ختم ہوتا ہے ... اسے کسی نہ کسی سسپنس بھرے موڑ پر ختم کرتا ہوں ... اب سو دوسو صفحات والے ناول میں تو یہ کام آسان ہے ... لیکن ناول اگر سات آٹھ سو صفحات کا ہوتو یہ کام کافی مشکل ہو جاتا ہے ... جب کہ میں 16 سو صفحات کا ناول دائرے کا سمندر لکھ چکا تھا اور اپنی اس کوشش میں، میں کامیاب بھی رہا تھا... اب مرحلہ تھا 2000 صفحات کے ناول میں سسپنس کے موڑ پر ہر باب کو ختم کرنا... میں نے اللہ کا نام لے کر ناول شروع کر دیا ... اور اللہ کی مہربانی سے تمام ابواب سسپنس پر ہی ختم ہوتے چلے گئے ... یہاں تک کہ 2000 صفحات کا ناول تیار ہو گیا۔

اب دوسرا خوف یہ تھا ... کہ کہیں ناول فروخت نہ ہو سکے ... کیونکہ اس کی قیمت 250 روپے رکھنے کا پروگرام تھا ... اور یہ بات ہے ... اس زمانے کی جب کہ عام ناول یعنی سو صفحات کا ناول 18 روپے سے زیادہ کا نہیں تھا ... اور دوسو صفحات کا ناول بھی 30 روپے کا شائع کیا کرتا تھا ... میڈیم خاص نمبر کی قیمت 60 روپے رکھی جاتی تھی ... غار کا سمندر سے پہلے سب سے بڑے ناول دائرے کے سمندر کی قیمت بھی 150 روپے رکھی گئی تھی۔

لیکن اب غار کا سمندر کی قیمت 250 روپے رکھنی پڑ رہی تھی ... خیر اللہ کا نام لے کر کتاب شائع کر دی گئی ... غار کا سمندر بہت بارعب اور دھوم دھام انداز میں اسٹالوں پر نظر آیا اور میرے خوف کے خلاف ایک کاپی بھی کسی اسٹال پر نہ بچ سکی ... اس وقت میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

غار کا سمندر اس وقت لکھا گیا جب طالبان کی حکومت افغانستان میں قائم ہو چکی تھی ... میں نے اپنے اس ضخیم ترین ناول کا انتساب ان کے نام کر دیا ... دو باتیں میں ان کا بھرپور تذکرہ کیا ...

اس کے کچھ مدت بعد جب کہ ناول جاری وساری تھے، اگرچہ تعداد اشاعت کافی کم ہوگئی تھی اور میں فکر مند رہنے لگا تھا ... ایک مسئلہ اور سامنے آیا ... نوید کی شادی کے لیے میں نے ایک کمرہ چھت پر بنوایا تھا ... لیکن پھر اس کے باوجود مکان ہمیں بہت تنگ اور چھوٹا محسوس ہونے لگا ... آٹھ بچوں اور ایک بہو کے ساتھ تین چھوٹے چھوٹے کمروں میں گزارا کرنا کافی مشکل ہو رہا تھا ... آخر سب گھر والوں نے مل کر مجھ سے مطالبہ کیا ...

''ہمیں اب کوئی بڑا مکان خریدنا چاہیے۔''

اب مکان کی تلاش شروع ہوئی ... ان دنوں میں نے اپنی شیراڈ کار بیچ کر سوزوکی وین لے لی تھی ... کیونکہ کار میں اب تمام بچے نہیں آتے تھے ... سوزوکی وین میں بچے پورے آجاتے تھے ... نوید ٹیوٹا کے زمانے میں ہی ڈرائیونگ سیکھ چکا تھا ... لہٰذا وہ گاڑی پر بچوں کو اسکول لے جاتا تھا اور اسکول سے گھر لاتا تھا...

ہم لوگ ادھر ادھر مکان تلاش کرتے پھر رہے تھے ... ایسے میں ایک دن مجھے ایک بہت خوب صورت لفافے میں ایک خوب صورت لیٹر پیڈ پر خط ملا... خط میں صرف ڈیڑھ سطر کمپوز کی گئی تھی ... لکھا تھا:

''اشتیاق احمد صاحب ! میں یہ خط آپ کو دارالسلام سے لکھ رہا ہوں... آپ کو اس ادارے کے لیے بھی لکھنا چاہیے ... اگر آپ ملاقات کے لیے آئیں تو ہمیں بہت خوشی ہو گی...''

خط ملنے پر حیرت سی ہوئی ... کیونکہ جب سے میں نے اپنا ادارہ شروع کیا تھا ، اس وقت سے اس قسم کی پیش کشیں آنا بند ہو گئی تھیں ... کیونکہ میں نے

ناولوں کی دو باتیں میں اسی بات کا اظہار کیا تھا کہ اب میں صرف اپنے ادارے کے لیے لکھا کروں گا ... اب یہ خط ایسے وقت میں آیا جب وی سی آر اور ڈش اینٹینا جیسی تبدیلیوں کی گرفت روز بروز مضبوط ہو رہی تھی اور میں یہ سوچنے لگا تھا کہ شاید مستقبل میں مجھے ناول بند کرنے پڑیں ... اگرچہ بعد میں یہ خیال غلط ثابت ہوا ... تاہم اسی وقت میں نے یہی محسوس کیا تھا۔

چنانچہ میں ادارہ دارالسلام کے دفتر جا پہنچا... اس زمانے میں ان کا دفتر اور شو روم ایم اے کالج کے نزدیک تھا ... میں نے استقبالیہ پر جا کر مطلوبہ آدمی کا نام لیا ... جواب ملا ...

"بیٹھیں ... انھیں یہیں بلا دیتے ہیں۔"

جلد ہی وہ صاحب آ گئے۔ میں نے انھیں ان کا خط دیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئے ... اب انہوں نے مجھے جن صاحب سے ملوایا ... وہ دارالسلام کے نائب منیجر محمد طارق شاہد صاحب تھے ... انھوں نے بات شروع کی:

"ہم آج کل بچوں کی کتب پر کام کر رہے ہیں ... چاہتے ہیں آپ سے بھی کچھ کتابیں لکھوائیں ... کتابوں کے ساتھ ہم آپ سے کچھ کیسٹیں بھی لکھوانا چاہتے ہیں ..."

"جی بہتر! لکھ دوں گا ... آپ موضوع بتائیں ... ضخامت اور سائز بتائیں ... اور یہ بھی کہ کتنی تعداد میں کتب درکار ہیں۔"

محمد طارق شاہد صاحب تفصیلات بتاتے رہے ... میں تفصیلات نوٹ کرتا رہا ... پھر ان سے رخصت ہو کر جھنگ آ گیا ... اب میں نے اس ادارے کے لیے کام شروع کیا ... طارق صاحب نے مجھے اپنی بہت سی کتابیں دکھائی تھیں ... اس میں کوئی شک نہیں دارالسلام بہت ہی خوب صورت کتابیں شائع کرنے والا ایک ادارہ ہے ...

چند کتب تیار کر کے میں ان کے پاس لے گیا ... انہوں نے کہا۔

''یہ آپ کا پہلا کام ہے ... اس لیے پہلے میں پڑھ کر دیکھ لوں گا۔''

''جی ٹھیک ہے۔''

''آپ پندرہ دن بعد چکر لگائیں۔''

''اچھی بات ہے۔''

اس روز انہوں نے مجھے چائے بھی پلائی ... پندرہ دن بعد گیا تو ان کا سلوک مجھ سے بدل چکا تھا ... بہت محبت سے پیش آئے ... پر تکلف کھانا کھلایا... اب بات معاوضے کی شروع ہوئی ... کہنے لگے :

''آپ بتائیں ... آپ کو ان کتابوں کا کیا معاوضہ دیا جائے۔''

''یہ تو میں نہیں بتاؤں گا ... آپ اپنے ادارے کے مطابق جو دیں گے لے لوں گا۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا ... جو معاوضہ انہوں نے دیا ... میں نے لے لیا ... اس طرح انہوں نے مزید کام دے دیا ... اب میں اپنے ادارے کے ناول لکھنے کے علاوہ ان کے لیے کتب لکھنے لگا ... تقریباً ایک سال تک ان کے لیے کتب لکھتا رہا ... چند کتب کے نام یہ ہیں ...

جان سے قیمتی، زمین میں پہلا قدم، پرانی کتاب، ہولناک طوفان، موت کی ہوا، ہولناک آگ، عظیم قربانی، انوکھے مہمان، پتھروں کی بارش، عجیب بشارت، ظالم بھائی، سب سے پیارے، تھالی کا بینگن ...

یہ تقریباً 32 کتب ہیں ... ان کے بعد انہوں نے کیسٹیں لکھوانا شروع کیں ... ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں ...

سنہری اوراق، خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ، جرنیل صحابہ، امہات المومنین، محمد بن قاسم، تاریخ مکہ مکرمہ، تاریخ مدینہ منورہ، میں لوٹ کر آؤں گا، قیامت کب آئے گی، اور زنجیریں ٹوٹ گئیں، حقوق الاولاد وغیرہ ...

غرض تقریباً تین سال تک میں ان کا کام کرتا رہا ... محمد طارق شاہد

بہت محبت سے پیش آتے رہے ... وقت پر ادائیگی کرتے رہے ... ادائیگی کے سلسلے میں انہوں نے کبھی پریشان نہیں کیا۔

انہی دنوں گھر میں جگہ کی تنگی کا مسئلہ پیش آیا تھا ... ہمارا گھر بہت چھوٹا تھا ... اور اب میرے آٹھ بچے تھے ... ان میں سے فرحت کی اور نوید کی شادی ہو چکی تھی ... نوید کی دلہن کے لیے اوپر کمرہ بنوایا گیا تھا، لیکن باقی بچوں کے ساتھ ہمیں دو چھوٹے کمروں میں رہنا پڑ رہا تھا ... لہٰذا میرے گھر والوں نے مطالبہ شروع کیا: ''اب ہمیں کوئی بڑا گھر لے لینا چاہیے ... اس چھوٹے سے گھر میں گزارا کب تک ہو گا۔''

مطالبہ درست تھا ... خود میں اس بات کو محسوس کر رہا تھا ... ہم نے مکان تلاش کرنا شروع کیا ... ہمارے ایک پڑوسی محمد شفیق صاحب نے بتایا۔

''میں نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے لیے آٹھ مرلے کا مکان بنوایا ہے... ابھی وہ مکمل نہیں ہوا... اس میں بہت سا کام باقی ہے ... لیکن میرے بھائی اب میرے ساتھ وہاں رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں ... آٹھ مرلے کے مکان کے ساتھ ہی چار مرلے جگہ میری ہے ... میں وہ بعد میں بنواؤں گا ... لیکن اب بھائیوں کی علیحدگی کی وجہ سے میں آٹھ مرلے کا یہ مکان فروخت کرنے پر مجبور ہوں ... میں نے سنا ہے، آپ ان دنوں مکان کی تلاش میں ہیں ... آپ پہلے یہ مکان دیکھ لیں، کیونکہ اس سے زیادہ نیا مکان تو آپ کو مل ہی نہیں سکتا ... کیونکہ ابھی وہ مکمل نہیں ہوا... میں مکان مکمل کر کے دوں گا ... سودا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے دونوں بھائیوں کے پیسے دینے ہیں۔''

میں نے شفیق صاحب کی بات گھر والوں کو بتائی تو وہ فوراً مکان دیکھنے کے لیے تیار ہو گئے جونہی انہوں نے مکان دیکھا انہوں نے فوراً فیصلہ سنا دیا: ''بس! ہم یہی مکان لیں گے۔''

اب میں نے شفیق صاحب سے بات کی ... آٹھ مرلے کا تیار شدہ

مکان خریدنا ... اتنا آسان نہیں تھا ... میں فوری طور پر پورے مکان کی رقم ادا کرنے کے قابل نہیں تھا، لہٰذا میں نے شفیق صاحب سے کہا :

''مکان کے دو حصّے ہیں ... ایک حصّے کے پیسے میں اب دے دیتا ہوں، ایک حصّے کے پیسے ڈیڑھ سال بعد دے سکوں گا۔''

یہ بات میں نے حساب لگا کر کہی تھی ... کیونکہ ان دنوں آمدنی سمٹتی جا رہی تھی ... فوری طور پر 8 مرلے کے مکان کی رقم ادا کرنا میرے لیے آسان کام نہیں تھا ... حالات پہلے جیسے ہوتے تو اور بات تھی ... بیس سال تک ادارہ خوب چلا تھا اور اگر وی سی آر ... ڈش انٹینا جیسی تبدیلیاں نہ آجاتیں ... تو پڑھنے والے کم نہ ہوتے ... لیکن یہ سب اللہ تعالیٰ کے کام ہیں ... انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں۔

محمد شفیق صاحب نے اپنے بھائیوں سے بات کی ... کیونکہ انہیں تو بھائیوں کو پیسے دینے تھے ... بھائی اگر یہ بات منظور کر لیتے تو انھیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا ... بھائیوں نے یہ بات مان لی ... اس طرح ہم نے مکان خرید لیا ... اور نصف رقم دے دی گئی ... شفیق صاحب سے کہہ دیا کہ آپ مکان جلد از جلد مکمل کروا دیں ... انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے ... آپ فکر نہ کریں۔''

انہوں نے کام کروانا شروع کر دیا ... ہم نئے مکان میں منتقل ہونے کی تیاری کرنے لگے ... اب میں اپنے ادارے کے ناول شائع کرنے کے ساتھ ساتھ دارالسلام کے لیے بھی کام کر رہا تھا۔

انھی دنوں طاہر ایس ملک نے کینیڈا جانے کا پروگرام بنا لیا ... اس وقت مجھے ایک دھکا سا لگا ... میں نے سوچا ... ان حالات میں یہ شخص بھی ساتھ چھوڑ کر جا رہا ہے ... لیکن جانے والوں کو کون روک سکتا ہے ... اس کے سر پر کینیڈا جانے کا بھوت سوار ہو چکا تھا ... اور آخر وہ چلا گیا۔

پھر بعد میں سنا تھا کہ اس نے بیوی بچوں کو بھی کینیڈا ہی بلا لیا ہے ... اب بھی وہ وہیں ہے، حالانکہ اس نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا ...

"سر ... میں بس چار پانچ سال لگا کر واپس آجاؤں گا ... کیونکہ پھر میری بچیاں بڑی ہوجائیں گی ... اور میں نہیں چاہتا ... میری بچیاں کینیڈا کے ماحول میں جوان ہوں ..."

اس نے یہ بات کہی تھی اور بالکل درست کہی تھی ... اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا ... لیکن وہ ایسا کر نہیں سکا ... آج اسے کینیڈا گئے تقریباً سترہ سال ہو چکے ہیں ... اس دوران اس کے والد صاحب فوت ہوئے ... وہ جنازے میں شرکت نہ کر سکا ... بعد میں آیا تھا ... ابھی چند ماہ پہلے اس کی والدہ انتقال کر گئیں ... ان کے انتقال کے ایک ماہ بعد وہ آسکا تھا ... لیکن مجھ سے ملنے کی اس نے نہ پہلے کوشش کی نہ اب ... خیر ... وہ جہاں رہے خوش رہے ... اللہ اسے اپنی امان میں رکھے اور اس کی بچیوں کو بھی ...

جن دنوں طاہر کینیڈا گیا تھا ... ان دنوں سے کچھ پہلے ہی کمپیوٹر پر کمپوزنگ کا نظام شروع ہو گیا تھا اور لاہور میں بھی جگہ جگہ کمپوزنگ کرنے والے ملنے لگے تھے ... اس چیز نے ہاتھ کی کتابت کا رجحان ختم کر دیا اور کاتب حضرات یہ کام چھوڑ تے چلے گئے ... لہٰذا سعید نامدار صاحب نے بھی کتابت چھوڑ دی... اور میں کمپیوٹر پر کمپوزنگ کرانے لگا تھا ... رفیق مغل صاحب اگرچہ کتابیں اب بھی منگوا رہے تھے ... لیکن میرے دفتر آنا انہوں نے بھی چھوڑ دیا تھا ... ان حالات میں مجھے میر درد کا یہ شعر بہت یاد آنے لگا تھا ...

یادِ ایامِ عشرتِ فانی
نہ وہ ہم ہیں نہ تنِ آسانی
اک دن یوں ہجومِ یاراں تھا
جیسے اب مجمعِ پریشانی

ایک ایک کر کے سب نے ساتھ چھوڑ دیا...اب میں تھا اور میرا ایک ملازم میجر یار محمد ... ادارہ اب دو آدمیوں میں سمٹ گیا تھا ... تاہم میجر یار محمد سب کام آسانی سے کر لیتا تھا۔

ان دنوں میرے داماد لاہور میں کرائے کی جگہ پر رہتے تھے...میری بچی کو ابھی انہوں نے جھنگ میں ہی رکھا ہوا تھا۔

ایک دن میں نے ان سے کہا: ''میرے پاس مکان میں خالی جگہ پڑی ہے ... آپ کرائے کیوں دیتے ہیں ... یہاں آ جائیں۔''

میرے داماد یعقوب انجم نے یہ بات مان لی ... اور ساندے والے گھر میں آگئے ... اب وہ میجر یار محمد کا ہاتھ بٹانے لگے ...اس طرح عملہ تین آدمیوں تک محدود رہ گیا ... بہرحال کام چل رہا تھا ... یہ نہیں کہ ناول بالکل رک گئے تھے ... جی نہیں ... میں برابر ناول لکھ رہا تھا اور جیسے تیسے ... ناول فروخت بھی ہورہے تھے ... گزارے کی صورتِ حال باقی تھی ... کام گویا لڑھک ضرور رہا تھا ... اور میں اتنے میں بھی خوش تھا ... کیونکہ دارالسلام کے لیے جو کام کر رہا تھا ... اس سے بھی معقول پیسے مل رہے تھے ...اس طرح میں نے ڈیڑھ سال میں مکان کی بقایا رقم بھی ادا کر دی ... مکان اس سے پہلے ہی تیار ہو چکا تھا ... لہٰذا ہم اس میں منتقل ہو گئے ... ہم چونکہ بہت چھوٹے مکان سے آئے تھے ... اس لیے آٹھ مرلے کا مکان بہت اچھا اور کھلا لگا ... اب ہم سب خوش تھے ... اس وقت نوید کے ہاں ایک بچی پیدا ہوچکی تھی... اور نوید ہومیو پیتھک میڈیکل کالج میں داخلہ لے چکا تھا ... بلکہ ادھر اس کی شادی ہوئی تھی، ادھر اس نے داخلہ لے لیا تھا۔

آفتاب احمد کے ناول بھی شائع ہوتے رہے تھے ... لیکن ان کی تعداد اور زیادہ کم ہو گئی تھی ... پھر بھی میں نے بھائی ہونے کے ناطے اس کے ناول جاری رکھے ... میں نے سوچا تھا ... چلو بھائی کو پیسے مل جاتے ہیں،

مجھے کوئی نفع اس کے ناول سے نہیں ہوتا ... نہ سہی ... ان حالات میں بھی میں نے مایوسی کو پاس نہیں آنے دیا ... میں خیال کرتا تھا ... کوئی نہ کوئی سبب بن جائے گا... اللہ کوئی نہ کوئی راستہ کھول دے گا۔

ایک دن دارالسلام کے منیجر محمد طارق شاہد صاحب نے یہ بات کہہ دی : '' اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو ادارے میں ملازم بھی رکھ سکتے ہیں، آپ چاہیں تو اسی طرح اجرت پر کام کر سکتے ہیں اور پسند کریں تو ملازمت کرلیں۔''

جواب میں میں نے ان سے کہا : '' سوچ کر جواب دوں گا۔''

'' اچھی بات ہے۔''

کافی سوچ کر میں نے انھیں بتایا : '' فی الحال میں اسی طرح کام کرنا پسند کروں گا ... بعد میں ضرورت محسوس کی تو ملازمت بھی کرسکتا ہوں۔''

محمد طارق شاہد صاحب نے میری بات کو پسند کیا ... اور میں نے ان کے ادارے کا کام جاری رکھا۔

ایک دن سعید نامدار سے ملاقات ہوئی ... راز دارانہ انداز میں کہنے لگے:

'' آپ نے داماد کو مکان میں رہنے کی اجازت تو دے دی ہے ... اور وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی مکان میں لے آئے ہیں ... لیکن آپ نے ایک بات نہیں سوچی۔''

'' اور وہ کیا ؟ '' میں نے ان کی طرف پریشانی کے عالم میں دیکھا ۔

'' ان کے بچے ابھی چھوٹے ہیں ... لیکن آخر وہ بڑے ہو جائیں گے ... اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگیں گے ... پھر آپ ان سے مکان خالی نہیں کرا سکیں گے اور اگر کرائیں گے تو آپ کے نواسے نواسیاں کہیں گے کہ نانا ابو نے ہمیں ہمارے مکان سے نکال دیا ہے ۔''

کافی دیر تک میں سعید نامدار صاحب کی طرف دیکھتا رہا کوئی جواب نہ دے سکا ...

آخر میں نے کہا: '' بات آپ کی ٹھیک ہے ... لیکن جو ہونا تھا ... وہ ہو چکا... اب میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا مکان خالی کر دو ... کرائے کے مکان میں چلے جاؤ... میری بچی کیا کہے گی ۔''

'' یہی تو میں کہہ رہا ہوں ... جب آپ اس وقت نہیں کہہ سکتے ... تو کچھ مدت بعد تو کسی صورت نہیں کہہ سکیں گے ۔''

میں نے جواب دیا : '' اچھا ... اللہ مالک ہے ... اللہ جو کرتے ہیں ، اچھا کرتے ہیں ... ''

میں نے بات ختم کردی ... حالات سست روی کا شکار رہے۔

ایک دن میں نے تنگ آکر چھوٹے بھائی آفتاب سے کہہ دیا ...

'' آفتاب ! مجبوری ہے ... اب تمھارے ناول بند کرنا پڑیں گے ... کیونکہ ان کا نقصان بہت بڑھ گیا ہے ... تعداد اشاعت بالکل کم ہو گئی۔''

آفتاب سن ہوکر رہ گیا ... اب میں سوچتا ہوں ... کاش میں اس سے یہ نہ کہتا ... لیکن میں اس سے کہہ چکا تھا ... اب کیا ہوسکتا تھا ... اس کا نقصان پورا کرنے کے لیے ... میں نے کلینک پر اسے رکھ لیا اور کلینک سے اسے اتنے پیسے ملنے لگے... جتنے کہ ناول کے ملا کرتے تھے ... اس کے علاوہ وہ اپنا کام بھی کرتا تھا ...

آفتاب کو نوید کے ساتھ کلینک پر کام کرتے ہوئے تقریباً دو سال گزر گئے ... اب آفتاب کی گزر بسر آرام سے ہورہی تھی ...اس کے اب تین بچے تھے ... ایک بیٹی دو بیٹے ... بیٹی بڑی تھی ... تینوں بچے پڑھ رہے تھے۔

ایک روز مجھے لاہور جانا تھا ... صبح سویرے میں گھر والوں سے رخصت ہوکر لاہور کے لیے روانہ ہو گیا ... طبیعت میں کسی قدر اداسی صبح سے ہی تھی ... میں اس اداسی کو صاف محسوس کر رہا تھا ... لیکن اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

لاہور پہنچا ... بڑی بیٹی نے ناشتا سامنے رکھا ... ناشتا اچھا نہ لگا ... لیکن بیٹی سے کیا کہتا ... تھوڑا بہت کھا لیا ... دوپہر کو بھی یہی حال رہا ... شام کو بیٹی نے ایک خاص ہوٹل سے کڑاہی گوشت منگا لیا ... ہم کھانے بیٹھے تو میں نے بیٹی سے کہا:

''فرحت! نہ جانے کیا بات ہے ... کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔''

فرحت نے فوراً کہا: ''صبح سے میرا بھی یہی حال ہے ... لیکن میں نے کسی سے کہا نہیں ... کیونکہ کوئی وجہ تو ہے نہیں۔''

میں نے بہت مشکل سے چند لقمے کھائے ... فرحت نے بھی بہت تھوڑا کھایا ... جی ہی نہیں چاہ رہا تھا ... باقی لوگوں نے معمول کے مطابق کھایا ... ابھی کھانا کھائے چندمنٹ ہی ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی ... فون ڈرائنگ روم میں تھا ... فرحت اٹھ کر فون سننے چلی گئی ... میں اپنے داماد محمد یعقوب انجم سے کوئی بات کرنے لگا ... اتنے میں فرحت کے زور سے رونے کی آواز آئی ... ہم گھبرا گئے ... ابھی اٹھے ہی تھے کہ فرحت ڈرائنگ روم سے نکل آئی اور اس نے مجھے میری زندگی کی دوسری غمگین خبر سنائی۔

''آفتاب چچا فوت ہوگئے۔''

وہ دن 22 مئی 1999 کا تھا ... ہم کچھ دیر تو خوب روتے رہے پھر میں نے محمد یعقوب سے کہا... ''چلو بھائی ... جھنگ چلنے کی تیاری کرو۔''

اسی وقت ایک گاڑی ہم نے کرائے پر لی اور جھنگ کی طرف روانہ ہوگئے ... راستے بھر روتے رہے ... کسی کل چین نہیں آرہا تھا ... آفتاب سب سے چھوٹا بھائی تھا ... اس کی عمر ہی کتنی تھی ... صرف 38 سال ... 38 سال کا جوان بھائی ... فوت ہوجائے ... تو دل کی کیا کیفیت ہوسکتی ہے ... یہ تو وہی جان سکتے ہیں ... جنھیں ایسے غم سے واسطہ پڑ چکا ... لیکن یہ دنیا ہے ... اللہ کے حکم کے سامنے کوئی کچھ نہیں کر سکتا ... گھر پہنچے ... جونہی اندر داخل

ہوئے ... کہرام مچ گیا ... آفتاب کی چارپائی صحن میں رکھی تھی ... وہ اس پر ساکت لیٹا تھا ... میں اسے پیار سے مکھن کہتا تھا ... تین بار میرے منہ سے انتہائی کرب کے عالم میں نکلا : ''مکھن ... مکھن ... مکھن۔''

اور میں اس کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا ... وہ رات روتے گزری ...

صبح آٹھ بجے جنازہ لے جایا گیا ... جنازے کے بعد میرے بیٹے نوید نے بتایا :

'' چچا بالکل ٹھیک تھے ... انہوں نے عصر کی نماز کے بعد عشاء کے وقت تک کلینک پر کام کیا ... عشاء کا وقت ہوا تو میں نے ان سے کہا :

'' چچا ! آپ مسجد کے کولر میں برف ڈال آئیں ... اتنی دیر میں میں حساب کر لیتا ہوں ... انہوں نے کہا ... اچھا اور برف ڈالنے چلے گئے۔

گرمیوں کے دن تھے ... مسجد کے ایک کولر میں روزانہ برف ڈالنے کا کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا ... بس وہ کولر میں برف ڈال کر آ رہے تھے کہ راستے میں ہی یک دم گرے ... بازار کے لوگ ان کی طرف دوڑے ... وہ پھوپھو کے گھر کے دروازے کے سامنے گرے تھے ... لوگوں کو معلوم ہی تھا ... یہ ان کی بہن کا گھر ہے ... لہٰذا اٹھا کر انھیں اندر صحن میں لٹایا ... اور پھر دوڑ کر مجھے اطلاع دی ... میں نے گاڑی نکالنے کے لیے دوڑ لگا دی ... گاڑی نکال کر لایا ... انھیں گاڑی میں ڈالا اور لے چلے ہسپتال کی طرف... لیکن انہوں نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔''

یہ کہہ کر نوید رونے لگا ... جانے والے چلے جاتے ہیں ... یادیں چھوڑ جاتے ہیں ... آفتاب آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہے ... وہ بہت صابر تھا ... کبھی اپنی ضرورت بیان نہیں کرتا تھا ... بعد میں جب ضرورت بیان نہ کرنے کی باتیں سامنے آئیں تو میرا دل تڑپ تڑپ گیا ... آفتاب کی وفات کے بعد اس کی بیوی اور تینوں بچوں کے اخراجات کی ذمّے داری الحمد للہ ! میں نے لے لی ...

☆☆☆☆☆

O

انہی دنوں افغانستان میں تبدیلی کی لہر شروع ہوئی ...

جب سے روس نے افغانستان پر قبضہ کیا تھا ...وہاں جنگ کے بادل چھائے رہے تھے ... آخر اس معاملے میں امریکہ نے دخل اندازی کی ... امریکہ چاہتا تھا ، روس افغانستان سے نکل جائے ...جنرل ضیاء الحق کے دور میں ان کی مدد سے افغانستان میں دخل اندازی شروع کی اور اس طرح روس کو افغانستان سے جانا پڑا۔

روس تو افغانستان سے نکل گیا ... لیکن اب افغانستان میں اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی ... خانہ جنگی نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ... ان حالات میں جب کہ افغانستان میں ظلم وستم انتہا کو پہنچ گیا تھا ... ڈاکے اور اغوا کی وارداتیں عام ہونے لگی تھیں ... ایک اللہ کے بندے نے چند نوجوانوں کے ساتھ مل کر اس ظلم کے خلاف کمر کس لی ... ان نوجوانوں کا جذبہ صادق تھا ... لہٰذا بہت ہی تیزی سے یہ چھوٹی سی جماعت طاقت پکڑنے لگی ... مظلوم عوام اس جماعت میں شامل ہوتے چلے گئے ... یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس جماعت نے افغانستان کے صوبوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا ... ایک ایک کر کے صوبے ان کے قبضے میں آ گئے ... افغانستان کے عوام نے اس تبدیلی کو بہت خوشگوار محسوس کیا ... خانہ جنگی کے ختم ہونے کا انھیں یہی راستہ نظر آیا ... لہٰذا روز بروز اس جماعت کی طاقت بڑھنے لگی ...

یہ جماعت تھی طالبان کی اور اس کے امیر تھے ملّا عمر ... ملّا عمر کا نام ابھرنے لگا ... اور ایک دن یہ خبر سننے میں آئی کہ ملّا عمر نے افغانستان کے 22 صوبوں پر قبضہ کر لیا ... اور اب ان کا رخ کابل کی طرف ہے ... سب کا خیال یہ تھا کہ جب تک کابل ان کے قبضے میں نہیں آجاتا ... اس وقت تک پورا ملک ان کے قبضے میں نہیں آئے گا ... ان حالات میں آخر طالبان کابل پہنچ گئے ... وہ کابل پر قابض ہو گئے... کابل کی فتح کے بعد ملا عمر اور ان کے ساتھیوں کا افغانستان پر قبضہ ہو گیا۔

انہی دنوں میرا ناول غار کا سمندر شائع ہوا تھا ... میں نے اس کی دو باتیں طالبان کے نام کی تھیں ... میری روح بہت خوش تھی ... کیونکہ شریعت کا نفاذ میری بہت خاص تڑپ ہے ... بس اپنے ملک میں دور دور تک کوئی امید نظر نہیں آتی ... میں سوچا کرتا تھا کہ چلو آج افغانستان میں شریعت نافذ ہوئی ہے ... اللہ نے چاہا تو کبھی پاکستان میں بھی ہو جائے گی ...

ملا عمر کا افغانستان پر قبضہ تو ہو گیا ... لیکن شریعت کا نفاذ اسلام دشمنوں کو ہضم نہیں ہو رہا تھا ... لہٰذا ملک میں خانہ جنگی شروع کر دی گئی ... طالبان کے مقابلے میں احمد شاہ مسعود کو کھڑا کر دیا گیا اور طالبان کی احمد شاہ مسعود سے جنگ شروع ہو گئی ... یہ جنگ مسلسل جاری رہی ... اس میں طالبان کا بھی بہت نقصان ہوتا رہا ... اور آخر احمد شاہ مسعود جنگ میں مارے گئے...

اب امریکہ نے دیکھا ... طالبان مکمل طور پر افغانستان پر قابض ہو گئے ہیں ... اور وہاں اسلامی نظام جاری کر دیا گیا ہے ... اور جہاد کی روح بیدار ہو گئی ہے ... تو اس نے اس نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کا حربہ اختیار کیا ...

اس کے بعد نائن الیون کا واقعہ پیش آیا ... دو طیارے امریکہ کی دو بلند ترین اور بڑی ترین سرکاری عمارتوں سے ٹکرائے اور ان عمارتوں کو آگ لگ گئی ... اصل واقعہ کیسے پیش آیا اس پر آج تک اتفاق نہیں ہوا ... جو بھی ہوا ...

سازش تھی یا واقعی وہ القاعدہ کی کارروائی تھی ... یہ واقعہ بہرحال ہو گیا۔

اس وقت کے امریکہ کے صدر بش نے اس تباہی کا ذمے دار القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کو ٹھہرایا ... اسامہ بن لادن ایک مدت سے افغانستان میں تھے اور مجاہدین کے ساتھ مل کر روس کے خلاف لڑتے رہے تھے ... بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسامہ بن لادن کو افغانستان میں بھیجا امریکہ نے تھا... اب وہی امریکہ افغانستان کا دشمن بن چکا تھا ... افغانستان پر قبضے کے لیے پر تول چکا تھا اور اس کی ابتدا ان دو عمارتوں کی تباہی سے کی گئی تھی ... امریکہ کے صدر بش نے اعلان کیا...

"یہ حملہ براہِ راست امریکہ پر حملہ ہے ... اور اس حملے کے ذمے دار اسامہ بن لادن ہیں ... لہٰذا ملا عمر اسامہ بن لادن کو ہمارے حوالے کر دیں ... ورنہ افغانستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا۔"

کچھ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ امریکہ کا صرف بہانہ تھا ... ملا عمر اگر اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے پر تیار ہو جاتے تو بھی امریکہ کوئی اور بہانہ بنا کر افغانستان پر حملہ ضرور کرتا ... کیونکہ اس کا پروگرام یہی تھا۔

ملا عمر نے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا ... اور جواب دیا:

"اسامہ بن لادن ہمارے مہمان ہیں اور ہم اپنے مہمانوں کو کبھی اپنے دشمن کے حوالے نہیں کیا کرتے ... یہ ان کی ریت ہی نہیں ہے ..."

ملا عمر انہیں امریکہ کے حوالے نہ کرنے پر اڑے رہے۔ اس کشمکش میں تقریباً ایک ماہ گزر گیا ...امریکی صدر جارج بش برابر دھمکیاں دے رہے تھے ... انہوں نے پاکستان کے اس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف سے بھی صاف صاف پوچھ لیا:

"آپ اس جنگ میں ہمارے اتحادی ہیں یا نہیں ... جواب دیں۔"

پرویز مشرف نے فوراً ہی امریکہ کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔

امریکہ نے اس جنگ کے لیے بیالیس ملکوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ... ان میں بر طانیہ سب سے آگے تھا۔ بیالیس ملکوں کا اتحاد ہونے کے بعد جارج بش نے ملا عمر کو آخری دھمکی دی ... گویا الٹی میٹم دے دیا کہ اسامہ بن لادن کو اس کے حوالے کر دیا جائے ... ورنہ جنگ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں۔"

ملا عمر کی طرف سے پھر وہی جواب دیا گیا:

" اسامہ بن لادن ہمارے مہمان ہیں ... ہم اپنے مہمان کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتے ..."

اور اس سے اگلے دن امریکہ نے افغانستان پر فضائی حملہ کر دیا۔

امریکہ کے طیارے اندھا دھند بمباری کرنے لگے ... افغانستان حکومت کے پاس لڑاکا طیارے نہیں تھے، لہٰذا ان طیاروں کو بھگانے کا ان کے پاس کوئی انتظام نہیں تھا... صرف نیچے سے فائرنگ کی جاسکتی تھی ... لیکن اس خطرے کے پیش نظر امریکی طیارے اتنی بلندی سے بم گرانے آتے تھے کہ نیچے سے کی جانے والی فائرنگ سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں یہ کیا بتانے لگا...ان باتوں کا میری کہانی سے کیا تعلق ہے ... میں تعلق بتاتا ہوں ... میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ میں شریعت کے نفاذ کا جنون کی حد تک امیدوار ہوں ... تمام اسلامی ممالک میں خالص اسلامی نظام کی تڑپ مجھے بے چین کیے رکھتی ہے ... طالبان کی صورت میں مجھے یہ امید بر آتی نظر آنے لگی تھی ... لیکن امریکی اندھادھند بمباری نے طالبان کے منصوبے کو منتشر کرکے رکھ دیا ... افغانستان کے عوام خوفزدہ ہوکر پاکستان کا رخ کرنے لگے ... وہ پاکستان کی سرحد عبورکر کے پاکستانی علاقے میں پناہ لینے لگے ... اس بمباری کا جب کوئی حل نظر نہ آیا تو ملا عمر اور ان کی کابینہ نے نئی حکمت عملی اختیار کی... حکمت عملی یہ تھی کہ پہاڑوں میں چھپ جائیں

... اس طرح امریکہ کو اپنی پیدل فوج کو لانا پڑے گا ... کیونکہ فضائی حملوں سے وہ اس طرح کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے... اس فیصلے کے بعد طالبان پسپا ہونے لگے۔

ان دنوں میرا بہت برا حال تھا... مارے رنج اور غم کے میں روتا رہتا تھا... ان دنوں میرا بس ایک ہی شوق تھا ... طالبان کی خبریں اخبارات میں تلاش کر کر کے پڑھتا تھا ...

ہفت روزہ ضربِ مومن اسی زمانے میں شروع ہوا تھا ... کسی نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ... میں ضربِ مومن خریدنے لگا ... لیکن یہ ہفت روزہ تھا ... سات دن بعد آتا تھا ... جب کہ طالبان کی خبریں روزانہ پڑھنی ہوتی تھیں ... ایسے میں کسی نے بتایا ... ایک اخبار شروع ہوا ہے ... ضربِ مومن والوں نے ہی شروع کیا ہے اور اس کا نام ہے روزنامہ اسلام ...

یہ سن کر میں بہت خوش ہوا ... مقامی نیوز ایجنسی پر گیا تو وہاں روزنامہ اسلام نہیں تھا ... معلوم ہوا... اس کی ایجنسی عام ایجنسی سے الگ ہے ... اور ایجنسی ہولڈر جھنگ سٹی میں رہتے ہیں۔

جھنگ صدر کا فاصلہ جھنگ سٹی سے دو کلو میٹر ہے ... میں نے ایک دوست کو بھیجا کہ وہاں سے روزنامہ اسلام خرید کر لائے ... بلکہ گذشتہ چند روز کے بھی خرید لائے ... مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ اخبار طالبان کی خبریں نمایاں کر کے لگا رہا ہے ...

اس طرح میں نے زندگی میں پہلی بار روزنامہ اسلام خریدا... پھر تو روزانہ صبح سویرے روزنامہ اسلام کا مطالعہ کرنا میرے لیے باقی تمام کاموں سے زیادہ ضروری بن گیا ... ایجنسی والے کو پیغام بھیج دیا ... وہ اخبار مجھے بھی دے جایا کرے ...

اب روزنامہ اسلام روزانہ گھر آنے لگا ... انھی دنوں میں نے ایک غمگین

ترین خبر پڑھی ... اور وہ خبر میری زندگی کے لیے بھی اہم بن گئی۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی ... یعنی 42 ملکوں کی پیدل فوجیں افغانستان میں داخل ہوچکی تھیں ... اب ایک طرف امریکی طیارے طالبان پر بہت بڑے اور بہت زیادہ وزن کے یعنی 25,25 کلوگرام کے بم گرا رہے تھے ... جنھیں غالباً ڈیزی کٹر کا نام دیا گیا تھا ... اور دوسری طرف 42 ملکوں کی فوجیں جدید ترین اسلحے سے طالبان پر حملے کر رہی تھیں ... طالبان ایک طرح سے ان کے مقابلے میں نہتّے تھے ... آخر کار طالبان نے پہاڑوں میں روپوش ہونے کا فیصلہ کر لیا ... ہر طرف سے پسپا ہونے لگے ... میرے لیے یہ خبریں اس قدر اندوہ ناک تھیں کہ بس کیا بتاؤں۔

پھر اس سلسلے کی میں نے اپنی زندگی کی غمگین ترین خبر پڑھی ... خبر یہ تھی:

'' ملا عمر پسپا ہوتے ہوئے قندھار تک پہنچ گئے تھے ...وہاں سے رات کی تاریکی میں کمبل اوڑھ کر نا معلوم منزل کی طرف چلے گئے ... اب کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔

یہ خبر نہیں ایک بہت بڑا بم تھا جو مجھ پر گرا ... میں ایک طرح سے ہوش کھو بیٹھا ... پھر میرے آنسو جاری ہو گئے ... نہ جانے میں کتنی دیر روتا رہا ... پھر میں نے قلم اٹھایا اور لکھنے لگا ... ملا عمر پر ایک چھوٹا سا کالم نما مضمون یا مضمون نما کالم لکھا گیا ... میں نے اس کالم کا نام '' امید'' رکھا اور ضربِ مومن کے پتے پر بھیج دیا ... پہلے آپ وہ کالم پڑھ لیں ... کالم یہ تھا:

'' میرا اس سے خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا، وہ میرا کوئی دور کا رشتے دار بھی نہیں تھا ... میری تو اس سے کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی ... میں نے اسے دیکھا بھی نہیں، ہماری آپس میں خط وکتابت بھی نہیں تھی بلکہ وہ تو مجھے جانتا بھی نہیں تھا ... البتہ میں اسے ضرور جانتا ہوں اور جانتا رہوں گا ... کچھ سال پہلے تک تو میں نے کبھی اس کا نام بھی نہیں سنا تھا ...وہ تو بس اچانک

اس کا نام سامنے آیا ... پھر کبھی کبھار اس کا نام سامنے آجاتا ...اکثر اس کی خبریں بھی نہ ملتیں ... وہ کہاں ہے ... کیا کر رہا ہے ... کیسا ہے ... میرا جی بے تحاشہ چاہتا، میں کم ازکم ایک بار جاکر اس سے ملاقات کر آؤں ... دو گھڑیاں اس کے سامنے بیٹھ آؤں ... اور کچھ نہیں ... بس اسے دیکھتا رہوں اور جب ملاقات کا وقت ختم ہو جائے تو خاموشی سے اٹھ آؤں...ایک اجنبی کی طرح ... اس خواہش نے کئی بار سر ابھارا ...میں نے سوچ لیا تھا ...زندگی میں ایک بار اس سے ضرور ملاقات کروں گا ... مجھے اس سے کوئی کام نہیں تھا ... میں اسے کوئی پیغام بھی نہیں دینا چاہتا تھا ... غرض مجھے اس سے اپنی ذات کے لیے ... یا اپنے کسی عزیز کی ذات کے لیے قطعاً کوئی کام نہیں تھا ...پھر بھی میں ایک طویل سفر طے کر کے دشوار گزار راستے سے ہو کر اس کے پاس صرف چند لمحات کے لیے پہنچنا چاہتا تھا ... لیکن میری یہ حسرت، حسرت ہی رہ گئی ... اس خواہش نے ابھی دم نہیں توڑا ... لیکن ملنے کی امید اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے ... شاید میں اب اس سے کبھی نہ مل سکوں گا ... کبھی نہ دیکھ سکوں گا ...اس کا بھی امکان ہے ...بہت جلد ایسا ہوجائے ... اور یہ امکان بھی ہے کہ شاید ایسا کبھی نہ ہوسکے ... یا شاید ایسا ایک مدت بعد ہو ... لیکن امید دم نہیں توڑتی ... امید مجھ سے کہتی ہے ... وہ آئے گا ... ایک دن آئے گا ... میں اس سے ملوں گا ... اس دن شاید اس دنیا کے لیے ایک نیا سورج طلوع ہوگا ... کاش ایسا ہو... کاش ایسا ہو جائے ... کاش ایسا ہو جائے ... کاش وہ دن جلد آجائے ... میری زندگی میں آجائے ... لیکن میں مرنے سے پہلے پہلے سننا چاہتا ہوں ... جاننا چاہتا ہوں ...میں چاہتا ہوں... کوئی میرے کان میں کہہ دے ... وہ زندہ ہے ... وہ پھر آگیا ہے ... وہ پھر چھا گیا ہے ... اس نے باطل قوتوں کو پھر شکست دے دی ہے ... کفر کی طاقتیں پھر سرنگوں ہوگئی ہیں ... اب یہ قوتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں ... مجھے امید ہے ...یہ امید ختم نہیں ہو گی ...میں اگر ختم

ہو گیا ... تب بھی یہ امید ختم نہیں ہوگی... شاید اس وقت میری قبر پر آکر مجھے کوئی خوش خبری سنائے گا ... تم تو چلے گئے... لیکن وہ آگیا ہے ... تم سنتے ہو نا ... وہ آگیا ہے ... اس نے کفر کی طاقتوں کو پھر للکارا ہے ... کفر اب اس سے لرزہ براندام ہے ... شاید میں یہ لفظ قبر میں سنوں گا... لیکن میں یہ الفاظ سنوں گا ضرور ... آپ سوچ رہے ہوں گے ... وہ کون ہے...اس کا کیا نام ہے ...جس کے لیے میرے یہ جذبات ہیں ...میں کہے دیتا ہوں ... وہ مجھے پہلے بھی عزیز تھا ...اب بھی عزیز ہے ... مرتے دم تک عزیز رہے گا... مجھے اس سے محبت ہے ... محبت تھی ... محبت رہے گی ... یہ محبت مر کر بھی ختم نہیں ہو گی... اس لیے کہ اس بھری دنیا میں وہی تو ایک تھا ...جس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور تازہ کردیا تھا ... جس نے سو فیصد اسلامی نظام نافذ کر دیا تھا ...پوری دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا تو نہیں ... ایسا دوسرا نہیں ... وہ اکیلا ہی تھا ... بس ایک اکیلا ...میری آنکھیں تھک چکی ہیں ... لیکن کوئی دوسرا ایسا نظر نہیں آیا ...میں فضاؤں سے پوچھتا ہوں ... ہواؤں سے پوچھتا ہوں ...برف پوش پہاڑوں سے پوچھتا ہوں ...وہ کہاں ہے ...اس کا کیا حال ہے ...یہ ہوائیں ... یہ فضائیں ...یہ چوٹیاں میری بات نہیں سمجھتیں ... مجھے ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا ... کون مجھے اس بات کا جواب دے گا ... مجھے جواب ملے گا بھی کہ نہیں، میرا دل تڑپ رہا ہے ... میں جلداز جلد جان لینا چاہتا ہوں ... وہ کہاں ہے ... اس کا کیا حال ہے ... وہ کب آئے گا ... وہ اب تک آیا کیوں نہیں ... یہ کیسی تمنا ہے ...یہ کیسی تڑپ ہے ... میں اسے کوئی معنی نہیں پہنا سکتا، میں تو خود بے معنی ہو کر رہ گیا ہوں ... کسی کو کیا معنی پہناؤں گا ... خود اپنا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آتا ... اب صرف ایک لفظ میرے پلے رہ گیا ... صرف ایک لفظ ... وہ لفظ ہے... اے کاش ... اے کاش...''

جمعے کے روز ضربِ مومن آیا تو امید نہیں تھی کہ امید شائع ہوگیا ہوگا ...

کیونکہ جانتا تھا ... ابھی ابھی تو بھیجا ہے ... اتنی جلدی کیسے چھپ جائے گا ... لیکن یہ دیکھ کر حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ امید شائع ہوچکا تھا ... اسے پڑھ کر دیکھا... ضربِ مومن نے جوں کا توں شائع کیا تھا ... اس میں کوئی کانٹ چھانٹ نہیں کی تھی ... اب ضربِ مومن اور روزنامہ اسلام کو بغور پڑھنا ... خاص طور پر ان میں سے طالبان کی خبریں تلاش کرکر کے پڑھنا میرا شوق بن گیا ... ان دنوں ہر طرف طالبان کی تباہیوں کی خبریں گردش کررہی تھیں اور کسی کل چین نہیں آرہا تھا ... جی چاہتا تھا، کوئی ایسا شخص ہو ... جو افغانستان کے اندر کی خبریں مجھے سنا دیا کرے ... لیکن ایسا شخص میں کہاں سے لاتا ...اس وقت تو طالبان کو خود بھی اپنی خبریں نہیں مل رہی تھیں... پورا ملک درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا ...

ان حالات میں ... جب یہ خبریں آرہی تھیں کہ امریکہ نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا ہے اور طالبان پہاڑوں میں روپوش ہو گئے ہیں ... ان کی اور اسامہ بن لادن کی تلاش میں پہاڑوں پر زبردست بم باری کی جارہی تھی ... اور خاص طور پر تو پہاڑوں پر تو اتنی بم باری کی گئی کہ وہ تمام پہاڑ بالکل سیاہ ہو گئے تھے ... ان حالات میں جب کہ سردی شدید تھی اور غالباً دسمبر کا مہینا شروع ہو چکا تھا ... رات کے گیارے بجے گھر کے فون کی گھنٹی بجی ... اس وقت تک جھنگ میں موبائل سروس شروع نہیں ہوئی تھی ...

میرا بستر فون کے ساتھ ہی تھا ... گھنٹی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی ... میں نے بازو لحاف سے نکالا اور ریسیور اٹھا کر لحاف کے اندر کھینچ لیا۔

ریسیور کان سے لگاتے ہوئے میں نے کہا :

''السلام علیکم ... کون صاحب۔''

''وعلیکم السلام ... قاری عبدالرحمٰن بات کر رہا ہوں۔''

'' جی فرمایئے۔'' میں نے قدرے حیران ہو کر کہا، کیونکہ یہ نام میرے

لیے بالکل نیا تھا۔

''کالم امید آپ نے لکھا ہے نا۔''

''جی کالم امید۔'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''میں روزنامہ اسلام سے بات کر رہا ہوں ... کالم امید آپ نے لکھا ہے نا۔''

''جی ...جی ہاں ... آپ کراچی سے بات کر رہے ہیں۔'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''نہیں ... اسلام آباد سے ... ہمارا دفتر اسلام آباد میں بھی ہے۔''

''اوہ اچھا ... فرمایئے۔''

''میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں''

''آپ اتنی دور سے آئیں گے ... فون پر ہی بتا دیں کیا کام ہے۔''

''نہیں ! کام تو میں ملاقات کے وقت ہی بتاؤں گا۔''

''اچھی بات ہے ... آپ کب آنا چاہتے ہیں۔''

''کل صبح سویرے میں جھنگ پہنچ جاؤں گا ... آپ کا پتا وہی ہے نا ... بازار لوہاراں والا۔'' انہوں نے کہا۔

''یہ پتا ضرور ہے ... لیکن اب ہماری رہائش بدل گئی ہے... لیکن بہرحال آپ نے اگر بازار لوہاراں والی دکان دیکھی ہے تو وہیں آجایئے گا ... میں بیٹے کو بھیج دوں گا ... وہ آپ کو گھر لے آئے گا۔''

''اچھی بات ہے ... اب کل ملاقات ہو گی۔''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے کہا اور انہوں نے فون بند کر دیا۔

میں بہت زیادہ حیران تھا کہ صرف چھوٹے سے کالم کی اشاعت نے آخر ضربِ مومن اور روزنامہ اسلام کو کیسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ...خیر دوسرے دن صبح سویرے وہ جھنگ پہنچ گئے ... انہوں نے فون پر بتایا کہ میں آپ کی دکان پر

کھڑا ہوں ...اور دکان پر تالا لگا ہوا ہے ... یہاں کوئی نہیں ...
ظاہر ہے ... اتنی صبح سویرے کلینک کھلنے کا وقت نہیں تھا ... کلینک تو انہیں بند ہی ملنا تھا ...میں نے اپنے بیٹے نوید سے کہا ۔
'' قاری عبدالرحمٰن نامی ایک صاحب اسلام آباد سے آئے ہیں اور ہماری دکان پر کھڑے ہیں ... انھیں لے آؤ۔''
نوید گیا اور جلد ہی قاری صاحب کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا ...میں ان سے گلے ملا، مصافحہ کیا ... پھر کرسی پر بٹھایا ... ہنس مکھ چہرہ ، سرخ وسفید رنگ ، مسکراتی آنکھیں ... بس بات بہت تیزی سے کر جاتے تھے اور بعض اوقات جملہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
نوید مہمان کے لیے ناشتا تیار کرانے کے لیے چلا گیا تھا ... اور وہ مجھے بتا رہے تھے :
'' بچپن میں جو آپ کے ناول پڑھنا شروع کیے تو اب تک برابر پڑھ رہا ہوں اور میرے دوست احسان الحق صاحب تو دو ہاتھ آگے ہیں۔''
'' میرے لیے یہ باتیں حددرجے خوشی کی ہیں۔''
اب انہوں نے کہا : ''میں اب مطلب کی بات کی طرف آتا ہوں ... ہماری انتظامیہ آپ کا کالم امید پڑھ کر بہت متاثر ہوئی ... اور اب ہم چاہتے ہیں... آپ روزنامہ اسلام کے لیے کالم لکھا کریں۔''
'' کالم ... لیکن میں کالم لکھنا کیا جانوں ... جو مضمون ''امید'' میں نے لکھ کر بھیجا ... وہ بھی کالم کے طور پر نہیں تھا ... میں نے تو ایک مضمون لکھا تھا۔''
'' مضمون اور کالم میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا ... ہمارا خیال ہے ... آپ لکھ سکیں گے۔''
'' اگر آپ کا خیال ہے تو میں لکھ دیا کروں گا۔''
'' ہم دوسروں کو دو سو روپے فی کالم دیتے ہیں ... آپ کو تین سو روپے

فی کالم دیں گے ...''

ان کی بات سن کر میں نے کہا۔

''لیکن مجھے تین سو روپے کیوں ... مجھے بھی دوسو روپے فی کالم دیئے جائیں۔''

'' آپ کو تین سو ہی دیئے جائیں گے۔''

'' اچھی بات ہے ، جیسے آپ کی مرضی ... '' میں نے جواب میں کہا ۔

تقریباً تین گھنٹے ٹھہر کر وہ واپس چلے گئے ... میں نے کالم لکھنا شروع کر دیے ... چند کالم تیار ہوگئے تو انھیں بھیج دیئے ... وہ کالم فوراً ہی شائع ہوگئے ... ادھر میں انھیں اور کالم لکھ کر بھیج چکا تھا ...

ایک روز ان کا فون آیا ... میں اس روز لاہور میں تھا ... گھر والوں نے انھیں بتایا کہ لاہور گئے ہیں ... ساتھ ہی انہوں نے لاہور کا نمبر بھی بتا دیا...اب انہوں نے لاہور کے نمبر پر فون کیا... کہنے لگے :

''آپ کے کالم ہم برابر لگا رہے ہیں ، آپ نے دیکھ ہی لیے ہوں گے ... اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو پانچ سو روپے فی کالم دیں گے ۔''

'' جی ... کیا ۔'' میں حیرت زدہ رہ گیا ... پھر میں نے کہا ۔

'' اس کی کیا ضرورت ہے ... آپ تو پہلے ہی مجھے دوسروں سے زیادہ دے رہے ہیں ... مختصر سے کالم ہوتے ہیں ... فی کالم تین سور وپے بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں ... ''

''نہیں بس! فیصلہ ہو گیا ہے ... آپ کو فی کالم پانچ سو روپے دیا کریں گے اور مہینے میں دس بارہ کالم ضرور لکھ دیا کریں ... ''

'' جی اچھا۔''

اس طرح مجھے کالموں کی صورت میں کچھ پیسے ملنے لگے ... ادارے نے میرے کالم کا مستقل نام '' مکالمہ '' تجویز کیا تھا ... ایک روز ان کا فون موصول

ہوا... وہ کہہ رہے تھے :

'' اشتیاق صاحب ... کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی ڈھنگ کا کالم نہیں ہوتا ... میرا مطلب ہے ... جتنے کالم لگانے ہوتے ہیں ... اتنے نہیں ہوتے ... ایک آدھ کالم کم پڑجا تا ہے ... جب کہ آپ کے کالم ہمارے پاس ایڈوانس موجود ہوتے ہیں ... اب اگر ہمیں ایک وقت میں آپ کے دو کالم لگانے پڑیں ... تو کیا کیا جائے ... ویسے اس کا حل یہ ہے کہ آپ اپنا کوئی قلمی نام بتا دیں۔''

'' جی ... قلمی نام۔'' میرے منہ سے مارے حیرت کے نکلا

میں خود قلمی نام سے کہانیاں لکھتا رہا تھا ... رسائل والوں کو جب ایک سے زیادہ کہانی لگانے کی ضرورت پیش آجاتی تھی تو وہ میری دوسری کہانی ایم گمنام کے نام سے لگادیتے تھے ... ایم گمنام نام میں نے تجویز کیا تھا۔

اس نام سے مئیں نے شیخ غلام علی اینڈ سنز کی ایک روپے اور آٹھ آنے والی کہانیاں بھی لکھی تھیں... پھر جب ان کا رسالہ جگنو شروع ہوا تھا تو اس میں بھی میں ایم گمنام کے نام سے لکھتا رہا تھا ... جب اپنا رسالہ چاند ستارے شروع کیا تو اس میں بھی یہ نام میرے کام آیا تھا ...اور آج جب قاری صاحب نے میرے ایک عدد قلمی نام کا مطالبہ کیا تو مجھے ایم گمنام یاد آگیا ... میں نے سوچے سمجھے بغیر ان سے کہہ دیا :

'' آپ دوسرا کالم عبداللہ فارانی کے نام سے لگا دیا کریں۔''

'' اچھی بات ہے ... یہ نام ٹھیک رہے گا۔''

اس وقت مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ عبداللہ فارانی نام سے مستقبل میں کیا کچھ شائع ہونے والا ہے ... مستقبل کا کسی کو پتا ہو بھی کیسے سکتا ہے ... مستقبل کا حال تو اللہ ہی جانتے ہیں ... بہرحال جب بھی انھیں دوسرا کالم لگانے کی ضرورت پیش آتی ... وہ عبد اللہ فارانی کے نام سے لگا دیتے ... انھی دنوں

ضربِ مومن کی انتظامیہ نے مجھ سے کہا:

''ہم ضربِ مومن میں بچوں کے لیے بھی کچھ جگہ مخصوص کر رہے ہیں... آپ اس جگہ کے لیے بھی کچھ لکھ دیا کریں۔''

جواب میں میں نے کہا: ''جی اچھا! اس جگہ کے لیے بھی کچھ لکھ دیا کروں گا انشاء اللہ۔''

جب ایک دو بار اور کہا گیا تو میں نے ضربِ مومن کے بچوں والے حصے میں نبوت کے جھوٹے دعوے دار کی سچی کہانی کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا... یہ سلسلہ مرزا قادیانی لعین کے بارے میں تھا... یہ سلسلہ بہت زیادہ پسند کیا گیا... ہمارے ادارے کے مہتمم صاحب نے تو یہاں تک الفاظ کہہ ڈالے:

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مرزا قادیانی پر اتنی آسان زبان میں کہانی لکھی جا سکتی ہے۔''

الحمد للہ یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا... میں نے اس کی اقساط دارالسلام کے محمد طارق شاہد صاحب کو بھی دکھائیں... وہ ان اقساط کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے ... ایک دن انہوں نے کہا۔

''اشتیاق صاحب... جب آپ کا یہ سلسلہ مکمل ہو جائے تو یہ آپ ہمیں بھیج دیجیے گا... آپ کو اس کی ادائیگی کر دی جائے گی اور ہم اسے کتابی شکل میں شائع کریں گے۔''

''جی اچھا!''

اور پھر بعد میں یہ کام ہوا... سلسلہ مکمل ہونے پر میں نے تمام اقساط محمد طارق صاحب کو دے دیں... انہوں نے دارالسلام سے یہ کتاب تھالی کا بینگن کے نام سے شائع کی... الحمد للہ! کتاب خوب بکی...

کالم جاری رہے... ادھر میرے ناول جیسے تیسے چل رہے تھے... میں اب بھی باقاعدگی سے شائع کر رہا تھا... دارالسلام والوں کا بھی کام کر رہا تھا...

گویا اب بھی میں تین کام کر رہا تھا ... محنت کی زندگی آلو چھولے بیچنے سے جو شروع ہوئی تھی ... تو اس محنت کا سلسلہ اب تک کہیں رکا نہیں تھا ... لیکن میں نے کبھی کوئی تھکن محسوس نہیں کی ... میں کام سے کبھی تنگ نہیں آیا ... نہ جھنجھلایا ... بلکہ مصروفیات میں میرا وقت آسانی سے گزر تا تھا ... جب کہ کسی دن کسی مجبوری کی وجہ سے کام نہ کر پاتا تو وہ دن پہاڑ بن کر گزرتا ... جیسے عید کا دن وغیرہ ... کیفیت آج بھی یہی ہے ... کام کرتے ہوئے وقت اچھا گزرتا ہے ... کسی وجہ سے کسی روز کام نہ کر سکوں تو بور ہوتا ہوں ...البتہ بڑھاپے کی وجہ سے کسی قدر تھکن ضرور محسوس کرتا ہوں۔

اب دیکھیے ... تقدیر کیا دن دکھاتی ہے ... ایک روز قاری عبد الرحمٰن کا فون موصول ہوا ... وہ دراصل روزنامہ اسلام راولپنڈی کے ایڈیٹر تھے ... ادارہ مجھ سے جو بھی بات کرنا چاہتا تھا ، ان ہی کے ذریعے سے کرتا تھا ... اور وہ چونکہ بچپن سے میرے ناول پڑھ رہے تھے ، اس لیے مجھ سے بہت اچھی طرح واقف تھے ... فون پر انہوں نے کہا۔

''آپ سے کچھ کام ہے ... میں جھنگ آرہا ہوں۔''

''جی اچھا ...'' میں نے جواب دیا۔

دوسرے ہی دن وہ صبح سویرے پہنچ گئے۔

علیک سلیک اور ناشتے کے بعد انہوں نے کہا: ''بات دراصل یہ ہے کہ روز نامہ اسلام کی انتظامیہ بچوں کے لیے ایک ماہنامہ رسالہ نکالنا چاہتی ہے۔''

''اوہو اچھا۔'' میں نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

''اس رسالے کے سلسلے میں ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''میں ہر طرح تعاون کروں گا ... بے فکر رہیں ... لیکن۔'' میں کہتے کہتے رک گیا۔

''لیکن کیا ؟''

'' اس کے لیے پہلے ڈیکلریشن کا مرحلہ طے کرنا پڑے گا۔''(یعنی حکومت سے اجازت لینی ہوگی)

'' وہ ہم لے لیں گے ... وہ ہمارا کام ہے ... آپ فکر نہ کریں ... ہمارا اتنا بڑا ادارہ ہے ... کوئی کام غلط نہیں کر سکتے ... پہلے ڈیکلریشن لیں گے ... پھر رسالہ شروع کریں گے... لیکن اس وقت سوال یہ ہے کہ رسالے کا نام کیا رکھا جائے ... کوئی نام طے ہو گا تو ڈیکلریشن کیلئے اسی نام سے درخواست دیں گے۔''

'' بالکل ... آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں ۔''

'' آپ چند نام تجویز کردیں ... ہمیں ان میں سے جو نام پسند آجائے گا ... اسی کا ڈیکلریشن لے لیں گے ۔''

'' اچھی بات ہے۔''

میں نے کاغذ قلم پکڑ لیا اور نام سوچنے لگا ... جو نام بھی ذہن میں آیا ... لکھتا چلا گیا ... اس طرح میں نے کوئی دس کے قریب نام تجویز کر دیے ... کاغذ ان کو دیتے ہوئے کہا۔

'' ان میں سے جو نام اچھا لگے، اسی نام سے درخواست دے دیں۔''

انہوں نے نام پڑھے ... پسندیدگی کے انداز میں سر ہلایا اور مجھ سے رخصت ہو گئے ... ایک ماہ تک کچھ پتا نہ چلا کہ اس سلسلے میں کوئی بات آگے بڑھی ہے یا نہیں ...اور مجھے محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس موضوع کو چھوڑ بیٹھے ہیں ... لیکن میرا خیال اس وقت غلط ثابت ہو گیا جب ان کا پھر فون آ گیا ... انہوں نے پوچھا ۔

'' کیا آپ جھنگ میں ہیں ۔''

اس روز میں جھنگ میں نہیں بلکہ لاہور میں تھا ... میں نے انہیں بتایا ...

'' میں آج لاہور میں ہوں ... آپ فرمائیں تو جھنگ آجاتا ہوں۔''

’’نہیں ! میں لاہور آجاتا ہوں ... آپ گھر پر ٹھہریں ... لاہور پہنچ کر میں فون کروں گا ... آپ بتا دیجیے گا کہ کہاں پہنچنا ہے۔‘‘

’’جی اچھا۔‘‘

انھوں نے لاہور پہنچ کر فون کیا ... میں نے انہیں راستہ بتایا اور آخر وہ گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے... میں انھیں اندرونی کمرے میں لے آیا ... ان دنوں بیٹی جھنگ گئی ہوئی تھی ...پہلے انہیں ناشتا کرایا گیا ... ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے کہا۔

’’ ماہنامہ رسالے کا ڈیکلریشن نہیں مل سکا... گورنمنٹ نے ڈیکلریشن بند کر رکھے ہیں ۔‘‘

’’اوہ !‘‘ میرے منہ سے نکلا ۔

’’اب بتائیں ... آپ کیا کہتے ہیں ... کیا کیا جائے... کیا ڈیکلریشن کے بغیر رسالہ نکال لیں ... بہت سے لوگ ایسا کرتے رہتے ہیں ... یا ہم کسی رسالے کا ڈیکلریشن خرید لیتے ہیں ... بہت سے لوگ ڈیکلریشن فروخت کر دیتے ہیں ... کیونکہ ان کا رسالہ کامیاب نہیں جارہا ہوتا۔‘‘

’’نہیں ! یہ ٹھیک نہیں ...بعد میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں ... مثلاً رسالہ کامیاب ہوجاتا ہے تو مالک کہنے لگتا ہے ... میری ڈیکلریشن واپس کریں ... اپنے پیسے لے لیں ... یعنی اس طرح وہ بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔‘‘

’’یہ بات آپ کی ٹھیک ہے۔‘‘ وہ مسکرائے پھر کہنے لگے...

’’پھر کیا کیا جائے ۔‘‘

ایسے میں میرے منہ سے نکل گیا ۔

’’ آپ کو ڈیکلریشن کی ضرورت ہی نہیں۔‘‘

’’ کیا مطلب ؟‘‘ انہوں نے حیران ہو کر کہا ۔

’’ دیکھیے ... آپ ماہنامہ کی بجائے ہفت روزہ نکال لیجیے ۔‘‘

''کیوں کیا ہفت روزہ کے لیے ڈیکلریشن کی ضرورت نہیں ہو گی۔''

'' یہ بات نہیں ... آپ الگ سے رسالہ نہیں نکالیں گے ... روزنامہ اسلام کے تحت نکالیں گے ... جس طرح روزنامہ جنگ ہفتے میں ایک بار بچوں کا ایڈیشن بچوں کا جنگ کے نام سے شائع کرتا ہے ... روزنامہ نوائے وقت بچوں کا ایڈیشن پھول اور کلیاں کے نام سے شائع کرتا ہے ... اور باقی اخبارات بھی یہی کام کرتے ہیں ... لہٰذا آپ بھی روزنامہ اسلام کے تحت ہر ہفتے بچوں کا ایڈیشن نکال لیا کریں ... اس طرح آپ کو الگ سے ڈیکلریشن کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

'' بات آپ کی بالکل ٹھیک ہے ...اب یہ بھی بتادیں ... اس کا نام کیا رکھیں۔'' انہوں نے پوچھا ...

میرے منہ سے نکل گیا .. '' بچوں کا اسلام ۔''

'' بچوں کا اسلام ۔'' ان کے بھی منہ سے نکلا۔

'' ہاں ! بچوں کا اسلام۔''

انہیں یہ نام بہت پسند آیا ... انہوں نے کہا ۔

'' اچھی بات ہے ... میں انتظامیہ سے بات کرتا ہوں ... پھرآپ کوفون کروں گا ۔''

'' جی اچھا ۔''

وہ رخصت ہوگئے ... انہوں نے انتظامیہ کو ساری بات بتائی ... ان سب نے بھی اس رائے کو پسند کیا ... پھر چند دن بعد قاری صاحب کا فون موصول ہوا ... وہ کہہ رہے تھے ...

''آپ کو میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا ... انتظامیہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے ۔''

مجھے ایک بار پھر حیرت ہوئی ... خیر میں نے ان سے کہا۔

''اچھی بات ہے ... بتا دیں ... کب چلنا ہے۔''

''جہاز کی سیٹیں بک کرا کے آپ کو اطلاع دوں گا۔'' انہوں نے کہا۔

''جی اچھا۔''

تین دن بعد انہوں نے فون کیا ...

''آپ لاہور آجائیں ... میں بھی لاہور پہنچ رہا ہوں ... پھر یہاں سے ہم صبح کراچی کے لیے روانہ ہوں گے۔''

''جی اچھا۔''

دوسرے دن ہم کراچی پہنچ گئے ... روزنامہ اسلام کا دفتر ناظم آباد 4 میں ہے ... دفتر سے ہمیں لینے کے لیے گاڑی آئی ہوئی تھی ... گاڑی ہمیں دفتر لے آئی ... قاری صاحب مجھے مہمان خانے میں لے آئے ...

زندگی میں پہلی بار وہاں جانا ہوا تھا ... مجھے یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا ... اس وقت قاری صاحب نے بتایا ...

''پہلے ہم دوپہر کا کھانا کھائیں گے ... پھر دوپہر کے وقت آرام کریں گے ... شام پانچ بجے کے بعد مہتمم صاحب سے ملاقات طے ہے ...''

''جی اچھا۔''

شام کے پانچ بجے ہم بالکل تیار تھے ... قاری صاحب مجھے مہتمم صاحب کی خدمت میں لے آئے ... انہوں نے پیار بھرے انداز میں گلے سے لگایا ... مصافحہ کیا اور ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے ... اس وقت تک میرا خیال یہ تھا کہ یہ حضرات بچوں کا اسلام کے لیے مجھ سے مستقل طور پر کچھ لکھوانا چاہتے ہیں ... اس لیے بات چیت کر رہے ہیں ... اب انہوں نے فرمایا...

''اشتیاق صاحب ! آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا ... قاری صاحب نے آپ کے بارے میں ہمیں بہت تفصیل سے بتایا ہے ... دراصل ہم بچوں کا اسلام کی ادارت آپ کو سونپنا چاہتے ہیں ... آپ جو تنخواہ کہیں گے، ہم دیں گے

... رہائش دیں گے ... گاڑی دیں گے۔''

میں نے ان کی باتیں سنیں ... تو بہت حیران ہوا ... کیونکہ اس وقت مجھے پتا چلا تھا کہ یہ حضرات تو مجھے بچوں کا اسلام کا مدیر بنانا چاہتے ہیں ... اب میں قدرے گھبرا بھی گیا ... کیونکہ جھنگ کراچی سے بہت دور ہے ... مجھے اس خیال سے گھبراہٹ ہوئی تھی کہ اب گھر والوں سے اتنی دور رہنا پڑے گا ... مشقتیں برداشت کرتے ایک عمر گزر گئی تھی ، اب میں گھر والوں سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا ... آخر میں نے باادب انداز میں ان سے کہا۔

''میری چند گزارشات ہیں ... پہلے وہ سن لیں ... اگر میں بچوں کا اسلام کی ادارت کی ذمّے داری لیتا ہوں تو مجھے اپنے ناولوں کا کام بند کرنا پڑے گا ... دوسری بات میں میگزین کو خالص دینی میگزین نہیں بناؤں گا ... اس میں کہانیاں بھی ہوں گی لطیفے بھی ہوں گے ... میرا مطلب ہے دینی اور دنیاوی مضامین ساتھ ساتھ شائع کیے جائیں گے ... نہ میگزین خالص دینی ہوگا، نہ خالص دنیاوی۔''

''ہمیں اس سے اتفاق ہے۔'' مہتمم صاحب مسکرائے ۔

''شکریہ ! دوسری گذارش یہ ہے کہ مجھے کام جھنگ میں رہ کر کرنے دیا جائے۔''

''کیا ... بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکے گا ... آپ جھنگ میں اور میگزین شائع ہوگا کراچی میں۔''

''میں عرض کرتا ہوں ... کام شروع کرنے سے پہلے میں چار شمارے آپ کو بالکل مکمل کر کے دے دیتا ہوں ... آپ ان چاروں کو دیکھ لیں... اس کے بعد ایک شمارہ ادھر شائع ہوگا ... ادھر میری طرف سے ایک شمارہ جھنگ سے ادھر ای میل کر دیا جایا کرے گا ... اس طرح دفتر میں مستقل طور پر چار شمارے موجود رہیں گے ...اس صورت میں بھلا آپ کو کیسے کوئی پریشانی ہوگی ..

کوئی ضرورت پیش آنے پر آپ مجھے کراچی بلالیا کریں گے...اس طرح آپ کو کسی قسم کی کوئی الجھن نہیں ہو گی ... میری طرف سے کوئی پریشانی محسوس نہیں ہو گی ... یہ میں ذمے داری لیتا ہوں۔''

''ہوں ...اس پرآپ غور کر لیں ... ہم بھی غور کر لیتے ہیں ... ویسے ہم اب بھی یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ آپ یہاں آجائیں ... اپنی فیملی کو یہاں لے آئیں۔''

''یہ کام میرے لیے بہت مشکل ہوگا ... لیکن خیر ... پہلے میں آپ کو شمارے تیار کر دوں ... آپ انھیں دیکھ لیں ... اس کے بعد اس سلسلے میں مزید بات کر لیں گے۔''

''یہ ٹھیک رہے گا ...تو پھرآپ شمارے تیار کرنا شروع کردیں ... آپ چار شمارے کتنے دن میں تیار کر لیں گے۔''

''بس بیس بائیس دن میں ... مجھے سائز بتادیں ... کمپوزنگ کا سائز بھی بتادیں ...''

''وہ آپ کو قاری صاحب بتا دیں گے ... یہ اسلام آباد میں ہوتے ہیں ... آپ سے ملتے رہیں گے ... آپ کا ان سے مسلسل رابطہ رہے گا۔''

''جی اچھا۔''

اب مہتمم صاحب نے فرمایا : ''اب سب سے اہم بات ! آپ تنخواہ بتادیں۔''

''جی ... جو آپ دیں گے، وہ لے لوں گا۔''

''یوں بات نہیں بنے گی ... آپ بے فکر ہو کر بتائیں ... بلکہ کھل کے بتائیں اور بالکل نہ شرمائیں۔''

''جی نہیں ! میں نہیں بتاؤں گا۔''

''اچھا آپ مہمان خانے میں چلیں ... ہم اس بارے میں قاری صاحب

سے مشورہ کرتے ہیں ... اور ہاں ! یہ بھی سن لیں ... آپ دو معاون بھی رکھ لیں ... جو ادارت کے سلسلے میں آپ کی مدد کریں گے ... کمپوزنگ کا بل اور معاونین کی تنخواہ الگ دی جائے گی ۔''

''جی بہت بہتر ۔''

میں مہمان خانے میں چلا آیا ، چند منٹ بعد ہی قاری صاحب آ گئے ... انہوں نے بتایا کہ آپ کی اتنی تنخواہ مقرر کی گئی ہے ... تنخواہ معقول تھی... میں نے سر ہلا دیا ... دوسرے دن ہم کراچی سے واپس روانہ ہوئے ... لاہور اتر کر قاری صاحب تو اسلام آباد چلے گئے اور میں نے جھنگ کی راہ لی ...

اب مجھے چار شمارے تیار کرنے تھے ... ان کی کمپوزنگ کرانی تھی ... باقی سب کام بھی کرنے تھے ... میں نے کام شروع کر دیا ... ان دنوں مسئلہ یہ تھا کہ بچوں کا اسلام کی ڈاک تو تھی نہیں کہ اس میں سے مضامین الگ کر لیتا اور ان کی کانٹ چھانٹ کر کے چار شمارے تیار کر دیتا ... لہٰذا سب کچھ خود لکھنا پڑا ... کہانیاں، مضامین اور دوسری تمام چیزیں ... اس لیے میں بیس دن تک خوب مصروف رہا ... آخر بیس دن میں شمارے مکمل ہو گئے ... میں نے قاری صاحب کو فون کیا ... جھنگ میں موبائل سروس شروع نہیں ہوئی تھی ... پی ٹی سی ایل سے بات کرتے تھے ... انہوں نے ریسیور اٹھایا تو میں نے کہا ۔

''چار شمارے تیار ہیں ۔''

''بہت خوب ! میں مفتی صاحب سے بات کرتا ہوں ... پھر آپ کو بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے ۔''

''جی اچھا۔''

ایک گھنٹے بعد ان کا فون موصول ہوا۔

''آپ تیار رہیں ... یا ہمیں کراچی جانا ہوگا یا اسلام آباد ۔''

''جی ... جی اچھا ۔''

دوسرے دن ان کا پھر فون آیا... وہ کہہ رہے تھے۔

"آپ چاروں شمارے اسلام آباد کے پتے پر بھیج دیں۔"

"جی اچھا۔"

میں نے شمارے اسلام آباد بھیج دیے ... اب پھر انتظار شروع ہو گیا ... میری بے چینی بڑھ رہی تھی ... آخر قاری صاحب کا فون موصول ہوا۔

"میں اس وقت لاہور ہوں ... آپ مہربانی فرما کر لاہور آجائیں اور آکر مجھے فون کریں۔"

"اچھی بات ہے۔"

میں اسی وقت تیار ہو کر لاہور پہنچ گیا ... وہاں سے انہیں فون کیا اور اطلاع دی ...

ایک گھنٹہ بعد ہی ان کا فون ملا ...

"آپ ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈائیوو کے اڈے پر آجائیں ... میں یہاں موجود ہوں ... اگر آپ لیٹ ہو گئے تو بس نکل جائے گی ... بس کے روانہ ہونے میں پورا ایک گھنٹا ہے ... اور آپ کو معلوم ہو گا ... ڈائیوو والے ایک منٹ بھی لیٹ نہیں چلتے۔"

"جی ہاں!" میں نے گھبرا کر کہا ...

گھبراہٹ کے عالم میں اپنی بیٹی فرحت اور اس کے بال بچوں کو اللہ حافظ کہا اور رکشے میں بیٹھ کر ڈائیوو کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا ... جب میں اڈے پر پہنچا تو بس کے روانہ ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے اور قاری صاحب احاطے میں بے تابانہ ٹہل رہے تھے ... مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے اطمینان کا سانس لیا ...

ہم دونوں بس پر سوار ہوئے اور اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے ... اس وقت انہوں نے بتایا ...

"مہتمم صاحب کراچی سے اسلام آباد پہنچ چکے ہیں ... آج رات نو بجے ان کی آپ سے ملاقات ہے ... جاوید چوہدری صاحب کو بھی ملاقات کے لیے بلایا گیا ہے۔"

"اوہو اچھا۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔

جاوید چوہدری مشہور کالم نگار ہیں ... بچپن میں میرے ناول پڑھتے رہے ہیں ... انہوں نے اپنے ایک کالم میں لکھا ہے کہ بچپن میں مجھے اشتیاق احمد سے ملنے کا بہت شوق تھا ... ایک دن میں گھر والوں سے اجازت لیے بغیر ہی اپنے شہر سے لاہور جانے کے لیے بسوں کے اڈے پر پہنچ گیا ... لاہور جانے والی بس کا ٹکٹ خریدا اور اس میں بیٹھ گیا ... بس روانہ ہوئی تو خوف محسوس کرنے لگا کہ گھر والوں سے تو اجازت ہی نہیں لی ... نہ جانے وہ کیا سلوک کریں ... بس اس طرح ایک ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہمت جواب دے گئی اور بس سے اتر کر واپس اپنے شہر کی بس میں سوار ہوا ... اور مار کھانے سے بال بال بچا ...

قاری صاحب اس وقت ان جاوید چوہدری کا ذکر کر رہے تھے اور اسی لیے میں چونکا تھا ...

پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اسلام آباد پہنچے ... روزنامہ اسلام کے دفتر کے بجائے قاری صاحب مجھے سیدھا اپنے گھر لے گئے ...مجھے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا گیا ... عشاء کی نماز کے بعد قاری صاحب نے کہا۔

"بس اب تھوڑی دیر بعد ملاقات ہے۔"

میں نے سر ہلا دیا ... آخر وہ آئے اور مجھے ساتھ لے کر ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوئے ... وہاں مہتمم صاحب موجود تھے اور جاوید چوہدری صاحب بھی تھے ... میں دونوں حضرات سے ملا ... جاوید چوہدری سے گلے ملتے ہوئے میں نے کہا۔

"بچپن سے چلے آج مجھ تک پہنچے ہیں۔"

وہ ہنس پڑے ... اب میں نے دیکھا ... کمرے میں ایک وسیع دستر خوان بچھا تھا اور اس پر بے شمار چیزیں سجائی گئی تھیں۔کھانا کھایا گیا ... مہتمم صاحب کو جاوید چوہدری صاحب سے جو بات کرنی تھی وہ کھانے سے پہلے ہو چکی تھی ... اس لیے انہوں نے اجازت چاہی ... ان کے جانے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا:

'' اشتیاق صاحب! میں نے چاروں شماروں کا مواد پڑھا ہے، ماشاء اللہ بہت اچھا ہے ... اب ہم اللہ کا نام لے کر اس کی اشاعت شروع کر دیتے ہیں ... کل ہی سے روزنامہ اسلام میں اور ضرب مومن میں بچوں کا اسلام کا اشتہار شروع کر دیتے ہیں ...جب تک پہلا شمارہ نہیں آجاتا ... اشتہار مسلسل لگتا رہے گا ... آپ کو کوئی مسئلہ ہو ... کوئی پریشانی ہو تو فون پر بتادیں۔''

'' جی بہتر!''

'' ویسے اشتیاق صاحب ... میری ایک تجویز ہے۔''

'' جی فرمایئے۔''

''آپ نے جو یہ چار شمارے تیار کیے ہیں، ان چاروں میں جو سب سے بہترین کہانیاں اور مضامین ہوں ... پہلا شمارہ ان سے تیار کیا جائے۔''

ان کی تجویز سنتے ہی میں نے فوراً کہا۔

''نہیں جناب! یہ نہیں ہوگا۔''

''کیوں؟'' انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

'' اس طرح پہلا شمارہ اس قدر زبردست ہوگا کہ پھر ویسا زبردست شمارہ شائع کرنا بہت مشکل ہو جائے گا ... اور لوگ کہیں گے ... جو بات پہلے شمارے میں تھی... پھر وہ بات نظر نہیں آئی ... ہم یہ بات کیسے سن سکیں گے ... لہٰذا شماروں کو اسی طرح شائع ہونے دیں ... ہم بہتر سے بہتر کی کوشش جاری رکھیں گے ... لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ ... پہلے شمارے کے بعد پھر کوئی شمارہ قابلِ ذکر نہیں آیا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں ... میری رائے درست نہیں تھی...'' انہوں نے صاف دل سے کہا۔

مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی ... دوسرے دن ان سے رخصت چاہی کیونکہ اب مجھے بچوں کا اسلام کا پانچواں شمارہ تیار کرنا تھا ... گھر آکر میں نے کام شروع کر دیا ... ادھر میں نے پانچواں شمارہ کراچی بھیجا ... ادھر کراچی کا فون موصول ہوا ...

قاری صاحب کہہ رہے تھے :

''پہلے شمارے کی پیسٹنگ کا مسئلہ ہے ... کم ازکم پہلا شمارہ آپ کی موجودگی میں تیار ہونا ضروری ہے ... کیونکہ آرٹسٹ صاحب کو اور پیسٹنگ کرنے والے صاحب کو آپ سے بہت سی باتیں پوچھنی ہیں ... لہٰذا آپ کراچی آجائیں ... آپ جہاز کا ٹکٹ ضربِ مومن لاہور کے دفتر سے لے لیں ...یہ دفتر مسجد شہدا کے سامنے واقع بلڈنگ میں ہے ... وہاں الطاف صاحب ہوں گے ... ان کے پاس آپ کا ٹکٹ ہے ... وہی آپ کو ائرپورٹ تک پہنچا آئیں گے۔''

''جی ... جی اچھا۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

اب مجھے پھر کراچی جانا پڑ رہا تھا ... اس لیے میں پریشان تھا ... میں سوچ رہا تھا ... اگر اس طرح آنا جانا لگا رہا تو شمارے وقت پر تیار نہیں ہوسکیں گے ... لیکن مرتا کیا نہ کرتا ... کراچی جانا پڑا ... قاری صاحب ائرپورٹ پر آئے ہوئے تھے ... وہ مجھے روزنامہ اسلام کے دفتر لے آئے ... مجھے مہمان خانے میں پہنچا کر چلے گئے ... جلد ہی ایک صحت مند سے آدمی کمرے میں آئے ... علیک سلیک کے بعد انہوں نے بتایا ...

''میں خرم ہوں... میں نے پہلا شمارہ پڑھ کر دیکھا ہے ... ماشاء اللہ آپ نے بہت اچھا پرچہ تیار کیا ہے ... اب مسئلہ ہے اس کی پیسٹنگ کا ... آپ

مجھے بتائیں... پہلے صفحے پر کون کون سے مضامین لگائے جائیں گے اور دوسرے پر کون کون سے۔''

''جی کیا مطلب ... کیا شمارے کے صرف دو صفحات ہوں گے۔''

'' جی ہاں ! اخباری سائز پر شائع ہوگا نا۔''

'' اوہ اچھا۔'' میں یہ سن کر قدرے مایوس ہوا... میرا خیال تھا کہ رسالے کے سائز پر چھپے گا ... لیکن میں ادارے میں بالکل نیا تھا ... کچھ نہیں کہہ سکتا تھا ... میں انھیں بتانے لگا ... وہ پوچھتے رہے اور نوٹ کرتے رہے ... جب کام مکمل ہو گیا ... یعنی انھیں جو پوچھنا تھا ... پوچھ چکے تو انہوں نے کہا۔

'' اشتیاق صاحب ... آپ اس ادارے میں آ تو گئے ہیں ... اللہ آپ کو آنا مبارک کرے ... لیکن ایک بات کہے دیتا ہوں۔''

'' جی فرمایئے۔''

وہ دبے لفظوں میں کہنے لگے :

'' جب تک انھیں آپ کی ضرورت ہے ... یہ آپ کو رکھیں گے ... جب یہ دیکھیں گے کہ انہیں آپ کی ضرورت نہیں رہی ... تو آپ کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کر دیں گے۔''

میں نے ان کے چہرے پر نظریں جما دیں ... کچھ دیر تک ان کی طرف دیکھتا رہا ... آخر میں نے کہا۔

'' اللہ مالک ہے ... جب تک اللہ کو منظور ہے ... اس وقت تک تو میں یہیں کام کروں گا ... اور جب اللہ کو منظور نہیں ہو گا تو میں ادارے سے رخصت ہو جاؤں گا۔''

'' آپ ٹھیک کہتے ہیں ...'' خرم صاحب نے جلدی سے کہا اور پھر وہ اٹھ گئے ...

لیکن خرم صاحب کا یہ خیال کم ازکم میری حد تک بالکل غلط ثابت ہوا تھا

... کیونکہ آج ادارے میں کام کرتے ہوئے گیارہ سال ہو چکے ہیں ... مجھے ادارے نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا ... یہ حضرات میرے کام سے بالکل مطمئن ہیں الحمدللہ ! تاہم میرا ایمان ہے ... جب تک اس ادارے سے میرا رزق وابستہ ہے ... اس وقت تک میں کام کر سکوں گا ... اس کے بعد نہیں ... خرم صاحب کی بات بھی درست ہے ... یہ حضرات مجھے کسی وقت بھی فارغ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو لکھ دیا ہے ... وہ ہو کر رہے گا۔

کراچی سے واپس جھنگ آیا اور شمارے کی تیاری میں جٹ گیا ... پہلا شمارہ 30 جون 2002 کو شائع ہوا... ابھی چار شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ قاری صاحب کا فون موصول ہوا ... وہ نہایت پر جوش انداز میں کہہ رہے تھے :

اشتیاق صاحب !آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ بچوں کا اسلام کو کس قدر پذیرائی ملی ہے ... یہاں کراچی دفتر میں بچوں کا اسلام کی ڈاک کے ڈھیر لگ گئے ہیں... ادارے کو کبھی اتنے خطوط موصول نہیں ہوئے ... ان خطوط کو پڑھنا بھی آپ کا کام ہے ... انتظامیہ چاہتی ہے ... آپ ایک بار کراچی آئیں ... اور ڈاک کے اس ڈھیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں ...

میں ان کی بات سن کر پھر فکر مند ہوگیا ... کیونکہ وہ مجھے ایک بار پھر کراچی بلا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا ... اس طرح تو میں پر سکون رہ کر کام نہیں کر سکوں گا ... خیر مجھے ایک بار پھر کراچی جانا پڑا ... ائرپورٹ سے قاری صاحب دفتر لائے تو وہاں واقعی ڈاک کا بہت بڑا ڈھیر نظر آیا ... ادھر قاری صاحب نے کہا ...

" ڈاک کی یہ صورتِ حال دیکھ کر انتظامیہ یہ چاہتی ہے کہ آپ کراچی میں رہ کر کام کریں ... ورنہ جھنگ میں اتنی ڈاک سے آپ کیسے نبٹ سکیں گے۔"

میں نے ناراضی کے عالم میں ان کی طرف دیکھا ... کیونکہ یہ بات

میرے پروگرام کے خلاف تھی ... آخر میں نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں ... میں تین چار دن یہاں ٹھہر کر اس ڈاک کا صفایا کر دیتا ہوں ... پھر آپ سے بات کروں گا۔"

اب میں نے کراچی کے دفتر میں ہی رہ کر ڈاک کا مطالعہ شروع کیا ... اچھی اچھی چیزیں پڑھ کر الگ کرتا چلا گیا اور تین دن کی بھر پور محنت کے بعد میں نے تمام ڈاک کنارے لگا دی ... اس وقت میں نے قاری صاحب سے کہا ...

"قاری صاحب! یہ تھی آپ کی وہ ڈاک جسے آپ انبار کہہ رہے تھے ... اگر یہ ڈاک انبار تھی ... تو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی کام سے گھبرانے والا نہیں... اس سے دس گنا زیادہ ڈاک بھی آجائے گی تو میں اس سے بھی نبٹ لوں گا ... لیکن آپ مہربانی فرما کر مجھے پر سکون رہ کر کام کرنے دیں اور پر سکون رہ کر میں کام جھنگ میں رہ کر کر سکتا ہوں ...یہاں نہیں ... مہربانی فرما کر میرے حال پر رحم کریں، جو بات طے ہوئی ہے ... اس کے مطابق معاملے کو چلنے دیں ... آپ کو اور ادارے کے کسی بھی فرد کو اگر میری کارکردگی سے کوئی ذرا سی بھی شکایت پیدا ہو تب آپ بات کریں ... لیکن اگر میرے کام سے کسی کو ذرّہ برابر بھی کوئی مشکل نہ ہو تو پھر آپ کو جھنگ میں رہ کر کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

قاری صاحب نے میرے لہجے کی سختی کو محسوس کر لیا ... انہوں نے جان لیا ... میں کام کروں گا تو جھنگ میں رہ کر ... ورنہ نہیں کروں گا ... چنانچہ انہوں نے کہا: "اچھی بات ہے ناراض نہ ہوں آپ کو جھنگ بھجوا دیتے ہیں۔"

جھنگ واپس آکر میں نے ایک فیصلہ کیا ... فیصلہ یہ تھا:

"اب میں اپنے ناول شائع نہیں کروں گا ... بس بچوں کا اسلام کروں گا ... تاکہ بچوں کا اسلام کو پوری توجہ دے سکوں۔"

اس طرح میں نے ناول بند کر دیئے ... لاہور سے دفتر سمیٹ لیا ...

پورا گھر بڑی بیٹی فرحت اور اس کے بچوں کے حوالے کر دیا ... اور مکمل طور پر جھنگ آ گیا ...

ان حالات میں بچوں کا اسلام کے پہلے 20 شمارے اخباری سائز پر شائع ہوئے اور بے تحاشہ پسند کیے گئے ... ساتھ ہی یہ مطالبہ زور پکڑ گیا کہ اسے رسالے کے سائز میں شروع کیا جائے ... چنانچہ 20 شماروں کے بعد اکیس واں شمارہ رسالے کی شکل میں شائع ہوا ... یہ سولہ صفحے کا تھا ... اس کی اشاعت پر قارئین نے حددرجے خوشی کا اظہار کیا ... بچوں کا اسلام کی تعداد اشاعت روز بروز اوپر ہی اوپر جارہی تھی ... اس کے قارئین میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا ... اس کا نام مشہور ہوتا جار ہا تھا اور میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا ... خود انتظامیہ کے الفاظ یہ تھے ...

'' ہمارے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ بچوں کا اسلام اس قدر جلد اتنا مقبول ہو جائے گا۔''

اس کے ساتھ ساتھ اس کی ڈاک میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا تھا ... کراچی سے ہر آٹھ دس دن بعد ڈاک موصول ہورہی تھی ... اور وہ چار پانچ کلو کے قریب ہوتی تھی ... گویا مہینے میں پندرہ کلو ڈاک ... اور یہ کوئی کم ڈاک نہیں تھی ... کیونکہ ایک قاری جو ایک خط لکھتا ہے ... اس کا وزن کتنا ہوتا ہے ... ایک گرام ... دو گرام ... اس لحاظ سے جب 15 کلو ڈاک کے خطوط کا حساب لگا یا جائے تو اس کی تعداد پر حیرت ہی ظاہر کی جا سکتی ہے ...

بچوں کا اسلام کی ایک خصوصیت تو دو باتیں تھیں ، دوسری خصوصیت سلسلہ وار ناول تھا ... تیسری خصوصیت عبداللہ فارانی کا مستقل سلسلہ تھا اور چوتھی خصوصیت تھی ... قارئین کے خطوط کی اشاعت ... ان چیزوں نے اسے بہت جلد پسندیدگی کا اعلیٰ معیار عطا کر دیا تھا ... اور یہ سب اللہ کی مہربانی تھی ...

ان حالات میں ایک اور ریکارڈ قائم ہوا ... اس ریکارڈ نے ایک نیا

رجحان پیدا کیا ... یہ کہ عبداللہ فارانی کے مضامین کتابی شکل میں بھی شائع کیے جائیں ... اس سلسلے میں سب سے پہلی کتاب روشن ستارے شائع کی گئی ... یہ پہلے چار حصوں میں شائع کی گئی ... خود پبلشر نے اس کے بارے میں یہ الفاظ کہے...

''یہ کتاب اتنی فروخت ہوئی ... اتنی فروخت ہوئی کہ ہم اسے فروخت کر کر کے تھک گئے ... مگر اس کی مانگ کم نہیں ہوئی ...''

☆☆☆☆☆

O

ایک دن فاروق احمد صاحب کا فون موصول ہوا ...

آپ بھولے نہیں ہوں گے ... کراچی میں جب بھی جانا ہوتا تھا ... میرے کراچی میں میزبان یہی ہوتے تھے ... وہی فاروق احمد جنہیں ان کے لڑکپن میں پہلی بار دیکھ کر مجھے ان پر اپنے کردار فاروق کا گمان ہوا تھا اور اس بات کا ذکر میں نے پی ٹی وی کے پروگرام فروزاں میں بھی کیا تھا ... والد صاحب حج پر گئے تھے ، تب ہم ان ہی کے ہاں ٹھہرے تھے اور جب میں حج پر گیا تھا تو اس وقت پھر میں ان کے ہاں ٹھہرا تھا ... بچپن میں یہ مجھ سے ملنے اس وقت آئے تھے جب میں نے اپنا ادارہ شروع ہی کیا تھا ... چھوٹی سی گیلری میں انہوں نے مجھ سے ملاقات کی تھی ... پھر جب بھی کراچی جانا ہوا ... یا قارئین کے ساتھ ملاقات کا کوئی پروگرام بنا ... تو ان ہی کے گھر جا کر ٹھہرا کرتا تھا ...اس طرح ان سے ایک بہت قریبی تعلق قائم ہو چکا تھا ... ان حالات میں ان کا فون موصول ہوا ... وہ کہہ رہے تھے :

'' سر! آپ سے کچھ کام ہے ... ملنا چاہتا ہوں۔''

'' اچھی بات ہے ...کراچی آؤں گا تو آپ سے مل لوں گا۔'' میں نے جواب دیا ۔

'' اوہو ... سر! آپ میرا مطلب نہیں سمجھے ... میں آنا چاہتا ہوں ... آپ کے پاس۔''

''اچھی بات ہے ... آپ جس دن لاہور آئیں ... مجھے فون کر دیں، میں بھی لاہور آجاؤں گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ... میں خود جھنگ آجاتا ہوں۔''

''جھنگ ... آپ جھنگ آئیں گے۔'' میں نے مارے حیرت کے کہا۔

''ہاں! میں خود جھنگ آؤں گا ... آپ کی طرف سے تو اجازت ہے نا''

''اس میں اجازت کی کیا بات ہے ... شوق سے تشریف لائیں۔''

''بس تو پھر ... میں پرسوں آرہا ہوں۔''

''اچھی بات ہے ... روانہ ہونے سے پہلے فون کر دیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

اور پھر دو دن بعد فاروق احمد میرے گھر میں داخل ہو رہے تھے اور میں انھیں حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا ...وہ مارچ 2003 کا دن تھا۔

تقریباً بیس سال پہلے جب فاروق پہلی بار کرشن نگر والی گیلری میں آئے تھے تو وہ ایک دبلے پتلے لڑکے تھے ... اب وہ نوجوان نظر آئے ... میں ان سے گرمجوشی سے ملا ...

ابھی تک حیران تھا کہ انھیں جھنگ آنے کی کیا ضرورت پیش آگئی ... جب سے ان کا اور میرا تعلق شروع ہوا تھا اور ان کے گھر آنا جانا شروع ہوا تھا ... میں انھیں ہر ماہ ناولوں کا سیٹ اعزازی بھیجنے لگا تھا ... اب جب سے بچوں کا اسلام شروع ہوا تھا، یہ سلسلہ رک گیا تھا اور ناولوں کا سلسلہ رکنے کا انہیں پتا چل گیا تھا۔ وجہ بھی معلوم ہوگئی تھی...آتے ہی انھوں نے یہی بات کہی:

''میں آیا ہی اس لیے ہوں کہ آپ نے ... اپنے ناولوں کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔'' فاروق نے گویا اعلان کیا۔

''بس کیا بتاؤں ... مجبوری ہے ... '' میں نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

'' جب کہ میں چاہتا ہوں ... آپ کے ناولوں کی اشاعت بند نہ ہو... یہ سلسلہ جاری رہے ...'' فاروق احمد نے کہا۔

'' لیکن ناولوں کی اشاعت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی ... اسی لئے یہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔''

'' اسی لیے تو آیا ہوں ۔'' فاروق احمد مسکرائے ۔

''کس لیے آئے ہیں ... کیا مطلب ؟''

'' مطلب یہ کہ میں چاہتا ہوں ... آپ کا ایک ناول ہر ماہ میں شائع کیا کروں۔''

ان کی پیشکش پر مجھے اپنے ناول اور ناولوں کا زمانہ یاد آگیا... دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔

'' آپ ... آپ اور یہ کام کریں گے۔'' مارے حیرت کے میں نے کہا۔

'' ہاں کیوں نہیں۔'' وہ بولے۔

'' لیکن آپ کا کاروبار تو اور ہے ... جہاں تک مجھے معلوم ہے ... آپ نے اپنے والد صاحب والا کام ہی شروع رکھا ہے۔''

'' وہ کاروبار اپنی جگہ ہے ... یہ میرا شوق زیادہ ہے ... کاروبار کم۔''

'' لیکن پھر بھی ...''

'' یوں سمجھیں کہ میں آپ کے ناول خود پڑھنا چاہتا ہوں ... اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ شائع ہوتے رہیں۔''

'' اچھی بات ہے ... لیکن آپ کو یہ بتادوں ... کہ اس کام میں کامیابی کافی مشکل کام ہے۔''

'' اس بات کو آپ چھوڑیں ... آپ کو بس ناول لکھ کر دینا ہے ... معاوضہ بتا دیں ... آپ کو ہر ماہ ایڈوانس معاوضہ مل جایا کرے گا۔''

"اچھی بات ہے ... مجھے غور کرنے دیں۔"

"آپ کو غور کرنے کی ضرورت نہیں ... ناول لکھنا آپ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ... آپ تو ہر ماہ چار ناول لکھتے رہے ہیں۔"

"لیکن اب میرے پاس بچوں کا اسلام کے کام کی وجہ سے ناول لکھنے کا وقت نہیں ہے..."

"لیکن میں آپ سے ہر ماہ چار نہیں ... ایک ناول لکھوانے کی بات کر رہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے ... میں آپ کو ہر ماہ ایک ناول لکھ دیا کروں گا ... لیکن یہ ناول چھوٹے سائز کے ہوں گے ... یعنی سوا سو صفحات کے آس پاس .... اس سے بڑے ناول میں نہیں لکھوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ مسکرائے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ویسی ہی مسکراہٹ ہے جو انسپکٹر جمشید کے چہرے پر کسی کیس میں کامیابی کے قریب پہنچنے پر نمودار ہوتی ہے۔

اس کے بعد معاوضہ کی بات شروع ہوئی ... میں نے انھیں بھی اپنی عادت کے مطابق کہا۔

"فی ناول معاوضہ آپ بتا دیں۔"

"نہیں آپ بتائیں۔" فاروق احمد بولے۔

"یہ تو خیر نہیں ہوگا ... آپ کا بتایا ہوا معاوضہ اگر مناسب نہ لگا تو پھر میں بتاؤں گا۔"

اور انہوں نے معاوضہ بتا دیا ... معقول معاوضہ تھا ... میں نے کوئی اعتراض نہ کیا ... یہ میری اس سلسلے میں ان سے پہلی ملاقات تھی ...

اب میں نے ان کے لیے ہر ماہ ناول لکھنا شروع کر دیا ... ان سے یہ طے ہوا تھا کہ وہ ناول کا معاوضہ ایڈوانس بھیج دیا کریں گے اور میں ناول پر کام

کرنا شروع کر دیا کروں گا ... اس طرح پہلا ناول مکمل کرنے کے بعد میں نے انہیں بھیج دیا ... جلد ہی ناولوں کی اشاعت شروع ہو گئی ... شروع میں تقریباً سو صفحات والے ناول انھیں لکھ کر دیے ... یہ تقریباً 24 ناول لکھے گئے ... ان میں چند ناولوں کے نام یہ ہیں

فائل کا دھماکا، بلیک گولڈ ، ہم شکل سازش ، آپریشن الورا ، مجرم منصوبہ ، دائرے میں خوف ، چالباز ، پراسرار خوف ، ہیروں کا دشمن ، گھناؤنا وار، رنگین خطرہ، پیکٹ میں موت ، دھوکے کا پہاڑ ، طوفانی خطرہ ، اندھیرے کا سوداگر ، پرانے شکاری نیا جال ، ہیروں کا چکر ، قتل کی پیش کش ، خوف کا سایہ ، زہریلا ٹکراؤ ، اندھا سفر ، تاریک سفر ، موت کا جنگل ، غلامی کا سمندر (خاص نمبر)

یہ ناول چھوٹے سائز کے تھے ... اس کے بعد تقریباً دو سو صفحات کے ناول فاروق احمد صاحب نے لکھوانے شروع کیے ... انہوں نے اپنے ادارے کا نام اٹلانٹس پبلی کیشنز رکھا تھا ... بڑے سائز کے پہلے ناول کا نام انگارہ مشن تھا...

اس ناول کے ساتھ ہی اٹلانٹس کے تحت تقریباً 250 صفحات والے ناولوں کا آغاز ہوا ... اب میں بچوں کا اسلام کر رہا تھا یا ہر ماہ اٹلانٹس کے لیے ایک ناول لکھ رہا تھا ... اس دوران چند ناول ایم آئی ایس نے بھی شائع کیے۔

زندگی گویا اب بھی پرسکون دھارے میں چل پڑی تھی ... اب گھر بیٹھے یہ دونوں کام کر رہا تھا ... اور کوئی پابندی نہیں تھی ... نہ کسی قسم کا کوئی دباؤ تھا۔

میرے ناولوں کی پبلشنگ کا آغاز کرنے سے دو برس پہلے فاروق احمد نے میرے ناولوں کو پاکستان ٹیلیویژن پر پیش کرنے کے سلسلے میں بھی اہم ترین کردار ادا کیا تھا ...

ڈرامہ سیریز ایڈونچر ٹائمنر سال 2000 سے 2002 کے درمیان پی ٹی وی سے پیش کی گئی تھی ۔ یہ ایک جاسوسی سیریز تھی۔ ایڈونچر ٹائمنر میں فاروق احمد بھی

اداکاری بھی کر رہے تھے ... وہ ایک سراغرساں کا رول نبھا رہے تھے ... ڈرامے میں ان کے کردار کا نام جمیل تھا ... سراغرساں جمیل ...

ایڈونچر ٹائمنر سیریز کے تحت میرے سات ناول پیش کئے گئے ... ان کے نام تھے ... فون کی چوری ، چھپا رستم ، زہریلے چاکلیٹ ، عمارت میں بم ، فارمولے کی واپسی ، خون آلود خنجر ، تیسرے کی تلاش ...

پہلے ناول '' فون کی چوری کی ڈرامائی تشکیل کے بعد ڈاکٹر طاہر مسعود اپنی دیگر مصروفیات کے سبب ساتھ چھوڑ گئے اور بعد کے چھ ناولوں کی ڈرامائی تشکیل کی ذمے داری پروڈیوسر آصف انصاری صاحب نے فاروق احمد کے کاندھوں پر ہی ڈال دی ... لکھتے لکھاتے تو وہ رہتے ہی تھے ... اس لئے اس کام میں بھی انہیں کوئی خاص پاپڑ نہیں بیلنے پڑے ...

بطور سراغرساں جمیل، انسپکٹر جمشید کا کردار بھی فاروق احمد نے ادا کیا اور خوب کیا۔ یہ بھی کیا عجیب اتفاق تھا کہ بچپن میں جس لڑکے کو دیکھ کر مجھے اس پر اپنے کردار فاروق کا گمان ہوا تھا ... تیس برس بعد وہی میرے ناولوں پر بنی ڈراموں میں انسپکٹر جمشید کے رول میں سامنے آیا۔

اس طرح پہلی بار پاکستان ٹیلیویژن پر میرے ناول ڈرامہ سیریز ایڈونچر ٹائمنر میں پیش کئے گئے۔ یہ سیریز تین بار پی ٹی وی سے اور ایک ایک بار برطانیہ اور کنیڈا کے اردو چینلز پر پیش کی گئی۔ جاپان میں منعقد ہوئے ٹیلیویژن پروگراموں میں ایک بین الاقوامی مقابلے میں بھی اسے نامزد کیا گیا ... نہ صرف یہ بلکہ ایڈونچر ٹائمنر کو بچوں کیلئے بہترین ڈرامے کا پی ٹی وی ایوارڈ بھی دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

O

ایک روز ایک فون موصول ہوا ... اس فون نے جہاں مجھے حیرت زدہ کیا ... وہیں مجھے بے تحاشہ خوشی کا موقع بھی دیا ...فون کی گھنٹی بجی ... میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کہا گیا ... ''السلام علیکم ... یہ نمبر اشتیاق احمد صاحب کا ہے نا۔''

''جی ہاں ! بات کر رہا ہوں۔''

''شکریہ ! میں سپرنٹنڈنٹ پولیس غلام رسول زاہد بات کر رہا ہوں خانیوال سے۔''

میں چونک گیا ... ایک ایس پی صاحب مجھ سے بات کر رہے تھے ... حیران نہ ہوتا تو کیا کرتا ... میں نے سنا، وہ کہہ رہے تھے ...

''بہت مشکل سے آپ کا نمبر تلاش کر پایا ہوں ... بس کیا بتاؤں ... بچپن سے آپ کے ناول پڑھتا چلا آ رہا ہوں ... اب بھی جہاں سے بھی اور جیسے بھی آپ کا کوئی ناول مل جاتا ہے ... بس فوراً حاصل کر لیتا ہوں ... اس وقت آپ کے پاس جو نئے پرانے ناول ہوں ... میں خریدنا چاہتا ہوں ... '' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے ... اب میں نے کہا۔

''بہت خوشی ہوئی ... آپ کی بات سن کر ...خریدنے کی آپ نے کیا بات کہی... آپ اپنا پتا لکھوا دیں ... میں ناول پوسٹ کرا دیتا ہوں۔''

''نہیں !آپ پوسٹ نہ کریں ... میں ایک پولیس مین کو بھیج دیتا ہوں

... وہ کل کسی وقت آپ کے پاس آئے گا ... لیکن میں چاہتا ہوں ... آپ جتنے ناول اس کے حوالے کریں ... ان کی قیمت ضرور لیں ...''

''نہیں جناب ! یہ نہیں ہوگا ... وہ ناول میری طرف سے آپ کو تحفہ ہوں گے۔''

''اچھا خیر آپ کی مرضی ... اور آپ کا بہت بہت شکریہ !''

دوسرے دن پولیس مین میرے گھر پہنچ گیا ... میں نے کتابوں کا ایک بڑا سا پیکٹ تیار کر رکھا تھا ... وہ اس کے حوالے کیا ...

اسی شام غلام رسول زاہد صاحب کا فون موصول ہوا ...وہ بہت خوشی اور جوش کے عالم میں کہہ رہے تھے ...

''آپ نے تو اشتیاق صاحب ڈھیر ساری کتابیں بھیج دیں ... میں بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں ... میں تو آپ کی کتب نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتا رہا ہوں۔''

''اب آپ کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی ... میں ساتھ ساتھ آپ کو کتب ارسال کرتا رہوں گا۔''

''لیکن اس طرح تو آپ کو بہت زحمت ہوگی۔''

''جی نہیں ... خوشی ہوگی۔''

''اچھا کمال ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس دیے ... ان کی ہنسی بہت کھنکھاتی ہنسی تھی ... سن کر بہت حیرت ہوئی ...

اب یہ ہونے لگا کہ میں اپنے پاس موجود کتابیں ہر ماہ انھیں بھیجنے لگا ... ہر بار ان کا شکریے کا فون ضرور آتا اور وہ بہت خوشی کا اظہار کرتے... پھر کچھ ماہ بعد انہوں نے فون پر یہ اطلاع دی ...

''میرا تبادلہ سرگودھا ہو گیا ہے ... لہٰذا اب اس پتے پر کتب نہ بھیجیے گا ... میں سرگودھا پہنچ کر آپ کو وہاں کا پتا لکھوا دوں گا۔''

'' جی اچھا!'' میں نے کہا۔

سرگودھا پہنچ کر انھوں نے پتا لکھوا دیا ... اب کتب وہاں جانے لگیں ... ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ ان کا فون موصول ہوا ...

'' اشتیاق صاحب ... ہمارے ایک سب انسپکٹر ریٹائر ہوئے ہیں ... ہم انھیں الوداعی پارٹی دے رہے ہیں ... میں چاہتا ہوں اس تقریب میں آپ بھی شرکت کریں۔''

'' جی میں ... '' میں بس اتنا ہی کہہ سکا ... حیرت کی وجہ سے اور کچھ بھی نہیں کہا گیا تھا ... آخر میں نے کہا۔

''جی بہتر ... آپ مجھے تاریخ اور وقت بتا دیجیے گا، بندہ پہنچ جائے گا۔''

'' نہیں ... ایسے نہیں ... میں یہاں سے کسی کو بھیجوں گا، آپ اس کے ساتھ آیئے گا۔''

'' جی ... جی اچھا۔'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

تین دن بعد ان کا فون ملا۔

'' میرا آدمی آپ کو لینے کے لیے آ رہا ہے ... آج شام پارٹی ہے۔''

'' جی اچھا۔''

صبح پہلے ٹائم ہی ایک پولیس مین آ پہنچا ... میں اس کے ساتھ سرگودھے کی طرف روانہ ہوا ... ایک جگہ بس رکی اور میں اس سے اترا وہاں ایک پولیس جیپ کھڑی تھی ... پانچ چھ پولیس مین چوکس کھڑے تھے ... انھوں نے مجھے اس طرح سلوٹ کیا جیسے میں کوئی پولیس آفیسر ہوں ... مجھے شرم آئی ... پھر وہ مجھے جیپ میں بٹھا کر غلام رسول زاہد صاحب کے دفتر لے گئے ... غلام رسول صاحب دفتر میں موجود نہیں تھے ... غالباً کہیں راؤنڈ لگانے گئے تھے ... پولیس مین نے مجھ سے کہا ...

''آپ صاحب کے دفتر میں تشریف رکھیں ... وہ ابھی آ جائیں گے ...

نہانا پسند کریں تو نہا لیں ۔"

گرمی بہت تھی اور سفر میں کچھ حالت خراب ہو گئی تھی ... سو میں نے سوچا، نہا لینا چاہیے ...

نہا کر فارغ ہوا تھا کہ زاہد صاحب آ گئے ... میں انھیں اور وہ مجھے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے تھے ... وہ لمبے قد کے ، سرخ وسفید رنگ ، سڈول جسم والے خوب صورت انسان تھے ... مجھ سے گلے ملے ... وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور میں ان کے سامنے والی کرسی پر ٹک گیا ...اب لگے حال احوال پوچھنے ... میں ذرا شرمایا اور گھبرایا ہوا سا تھا ... ایک تو یہ کہ پہلی ملاقات تھی ... دوسرے وہ ایس پی تھے ... ایک بڑے آفیسر تھے ... وہ بھی عام آفیسر نہیں پولیس آفیسر ... پولیس والوں کا اپنا ایک رعب ہوتا ہے ... خیر ... کہنے لگے :

" آج پہلی بار آپ سے مل کر بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں ... آٹھویں جماعت میں تھا جب پہلی بار آپ کا ناول پڑھا تھا ... بس اس کے بعد تو پھر میں آپ کے ناولوں کا شیدائی ہو گیا ... اور اب تک ہوں ... یہ شوق اب تک ختم نہیں ہوا ... ویسے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں ... کیا آپ کے والد پولیس میں رہے ہیں ۔"

میں مسکرا دیا ،نفی میں سر ہلا تے ہوئے میں نے کہا۔

"جی نہیں ... میرے والد پولیس میں نہیں رہے ... نہ میں خود ... بلکہ ہمارا تو کوئی عزیز رشتے دار بھی پولیس میں نہیں رہا۔"

" یہ سن کر حیرت ہوئی ... کیونکہ میں یہی خیال کرتا رہا کہ اس قدر جاسوسی ناول کوئی پولیس ملازم ہی لکھ سکتا ہے ... ایک باقاعدہ تفتیش کا نظام اور دوسری جزئیات پڑھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے اور یہی خیال گزرتا ہے کہ لکھنے والا خود پولیس ملازم ہے... خیر آج میں بہت زیادہ خوشی محسوس کر رہا ہوں ... "

اس کے بعد چائے اور پھل آ گئے اور ہم چائے پینے لگے ... دوپہر تک

وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے ... یہ باتیں مختلف ناولوں کے گرد گھوم رہی تھیں ...

عصر کے بعد تقریب تھی ... تقریب ان کے دفتر کے گراؤنڈ میں تھی ... اور یہ دفتر تھا سرگودھا پولیس ٹریننگ اسکول ... اس کے انچارج غلام رسول صاحب ہی تھے ...وقت ہوا اور ملازمین لینے کے لیے آئے تو غلام رسول صاحب اٹھ کھڑے ہوئے ... میں ان کے پیچھے چلا ... لیکن انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ساتھ لے چلے ... جونہی ہم گراؤنڈ میں داخل ہوئے ... تالیوں کی زبردست گونج نے ہمارا استقبال کیا ... زاہد صاحب اس تقریب کے گویا دلہا تھے ...ان کے لیے بڑی اور شاہانہ کرسی رکھی گئی تھی ... ساتھ ہی دوسری کرسی تھی ... انہوں نے مجھے دوسری کرسی پر بٹھایا ...

اب تقاریر شروع ہوئیں ...یہ تقاریر رخصت ہونے والے پولیس آفیسر کی خدمات اور کارگزاریوں پر تھیں ... آخر زاہد صاحب کو دعوت دی گئی... لیکن انہوں نے اٹھ کر کہا۔

''مجھ سے پہلے اشتیاق صاحب آپ سے خطاب کریں گے ... کیونکہ یہ جرائم پر لکھتے رہتے ہیں ... اس لیے یہ بھی ہماری ہی برادری کے ہیں ... یہ اب تک چھ سو ناول لکھ چکے ہیں۔''

اس پر زوردار تالیاں بجیں ... اور میری سٹی گم ہو گئی ...مجھے تو اسٹیج پر آکر تقریر کرنے کا فن ہی نہیں آتا تھا ... لیکن اب زاہد صاحب نام پکار چکے تھے ...میں کر ہی کیا سکتا تھا ...اسٹیج پر آگیا اور ''ماں'' کی شخصیت پر چند منٹ بات کر کے اپنی کرسی پر جا بیٹھا ...

اس کے بعد زاہد صاحب کی تقریر شروع ہوئی ... یہ بھی ریٹائرڈ ہونے والے آفیسر کی خدمات پر تھیں ... آخر میں انھیں شیلڈ پیش کی گئی ... اس کے ساتھ ہی غلام رسول زاہد صاحب نے مائیک میں کہا۔

''اور اب اشتیاق احمد اسٹیج پر آکر اپنی شیلڈ وصول کریں گے۔''

میں حیرت زدہ رہ گیا ... میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس موقعے پر مجھے شیلڈ سے نوازیں گے ... کیونکہ بھلا میرا کیا حق تھا ... لیکن مجھے اسٹیج پر جا کر شیلڈ لینا پڑی ... وہ دن میری زندگی کا ایک یادگار دن ثابت ہوا ... ان کی دی ہوئی شیلڈ دوسری شیلڈز کے ساتھ آج بھی میرے کمرے میں موجود ہے ... غلام رسول زاہد صاحب کے ساتھ اب باقاعدہ فون پر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا ... وہ سرگودھا میں2004 تک رہے، پھر ان کی بطور ایس ایس پی ترقی ہو گئی ... اور انہیں اسلام آباد بھیج دیا گیا ... انہوں نے اپنی الوداعی پارٹی میں بھی مجھے بلایا ...ان کے ساتھ کئی گھنٹے اس روز بھی گزارے ۔ اسلام آباد میں غلام رسول صاحب تقریباً ایک سال تک انٹیلی جنس میں رہے، اس کے بعد انھیں رحیم یار خان بھیج دیا گیا ... میں اپنی کتب انھیں بھیجتا رہا ... رحیم یار خان سے انھیں اسلام آباد سہالہ پولیس ٹریننگ کالج ٹرانسفر کر دیا گیا ... یہیں ان کی بطور ڈی آئی جی ترقی ہوئی ... اور وہ اب تک سہالہ میں موجود ہیں ... ہماری دوستی اب پہلے سے بہت زیادہ گہری ہو چکی ہے، میرے بہترین، بے لوث اور مخلص ترین دوست ہیں ... اللہ کرے میری اور ان کی دوستی اسی طرح قائم رہے ... آمین ...

ان ہی کے ساتھ نسیم پرویز صاحب کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری خیال کرتا ہوں۔ ایک روز ان کا فون آیا ... انہوں نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ...

”میرا نام نسیم پرویز ہے ... آپ اشتیاق احمد ہیں ۔“

”جی ہاں ! فرمایئے ۔“ میں نے کہا۔

”دیکھیے ... میں فوج میں میجر ہوں ... میں، میری بیگم اور بچے آپ کے ناول بہت شوق سے پڑھتے ہیں ... میری بیگم اور بچے آپ سے ملنے کے بہت خواہش مند ہیں ... اگر آپ ہمارے گھر تشریف لے آئیں تو ہم سب آپ کے شکر گزار ہوں گے۔“

مجھے ایک بار پھر حیرت کا جھٹکا لگا ... میں نے ان سے کہا ...

''جی بہتر ! میں آجاؤں گا ... آپ پتا لکھوادیں اور یہ بھی بتا دیں کہ کس روز اور کتنے بجے آؤں ۔''

'' اس وقت تو آپ جھنگ میں ہیں ... آپ لاہور کب آئیں گے ... بس اتنا بتادیں ... پھر جب آپ لاہور پہنچ جائیں تو فون پر اطلاع دے دیجیے گا ... آکرہم خود لے جائیں گے ۔''

''جی اچھا۔''

اس طرح میں جب لاہور گیا تو میں نے انھیں فون کر دیا ... وہ لینے کے لیے آگئے ... میجر نسیم پرویز اپنے ایک بیٹے کے ساتھ آئے تھے ... مجھ سے نہایت گرمجوشی سے ملے ... پھر وہ مجھے لے چلے ... کینٹ ایریا میں سرفراز رفیقی روڈ چونڈہ لین میں ان کی رہائش تھی ... رہائش گاہ کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے گاڑی روک دی اور تین بار ہارن دیا ... گیٹ فوراً ہی کھل گیا ... گاڑی کے بائیں طرف چند فوجی کھڑے تھے ... انہوں نے فوجی انداز میں سلام کیا ... میں نے سلام کا جواب دیا... میجر صاحب نے رہائش کے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا ، میں نے اس طرف دیکھا تو ان کی بیگم اپنی ایک بچی اور دوسرے بیٹے کے ساتھ کھڑی نظر آئیں... تینوں برآمدے میں تھے ... جونہی میں آگے بڑھا ... ان کی بیٹی پھولوں کا بڑا سا گلدستہ لیے آگے بڑھی ... اس نے مجھے گلدستہ پیش کیا ... ایک ہاتھ سے گلدستہ پکڑ کر میں نے دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا ... آگے بڑھ کر دوسرے بیٹے سے ہاتھ ملایا ... بیگم صاحبہ کو سلام کیا ... وہ تو بچھی جا رہی تھیں اور ان سب کے چہروں پر ایک ایسی خوشی تھی جیسے انھیں کوئی خزانہ مل گیا ہو ...

اب انہوں نے خاطر تواضع شروع کی ... قسم قسم کی چیزیں میرے سامنے رکھتے رہے ... کھانے کے معاملے میں میں بہت وہ ہوں ... یعنی بہت کم کھاتا ہوں ... لیکن جب اتنی بہت سی چیزیں سامنے ہوں اور بار بار کہا جائے

تو انسان کو کچھ کھانا بھی پڑتا ہے ... لہٰذا میں کچھ نہ کچھ کھاتا رہا ... ادھر وہ اپنے شوق کے بارے میں بتاتے رہے ... یہ بتا رہے تھے کہ کتنی مشکلوں سے انہوں نے میرا نمبر حاصل کیا ...

میں تقریباً ایک گھنٹا وہاں ٹھہرا رہا ... پھر میں نے اجازت چاہی ... رخصت کے وقت انہوں نے تحائف کا ایک شاپر بھرا ہوا گاڑی میں رکھ دیا...ان کی بیگم اور بچوں نے بہت محبت سے رخصت کیا ... میجر صاحب ساندے تک خود چھوڑنے آئے ...

ان سے بھی اسی روز سے ایک تعلق قائم ہو گیا ... فون پر باقاعدہ بات چیت ہونے لگی ... میں ہر ماہ کے ناول انھیں ارسال کرنے لگا ... ادھر سے شکریے کے فون آتے ... یہ بھی کہا جاتا کہ جب بھی لاہور آیا کریں ... ہمارے ہاں ضرور آیا کریں... لیکن میں صرف ایک بار اور ان سے ملنے گیا ... اور اس مرتبہ بھی انہوں نے رخصت کے وقت بے تحاشہ تحائف سامنے کر دیے۔

بس اس وجہ سے ان کے ہاں جاتے ہوئے بہت گھبراتا ہوں کہ تکلف بہت کرتے ہیں ...

بہرحال تعلق جاری رہا ... کتابوں کے پیکٹ جاری رہے ... یہاں تک کہ غلام رسول زاہد صاحب کی طرح ان کی بھی ترقی ہو گئی اور وہ لیفٹیننٹ کرنل بن گئے ... انھیں مبارک باد دینے گیا ... سب لوگ بس بچھے جا رہے تھے ... ان سے اجازت چاہی تو پھر بہت سے تحائف ساتھ کر دیے اور گھر پہنچا کر گئے ۔

یہاں ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ لگے ہاتھوں، وہ بھی لکھے دیتا ہوں۔

میرے بڑے بیٹے نوید کے ایک دوست نے اس سے کچھ ناولوں کی فرمائش کی ۔ اس نے اپنے دوست کی فرمائش مجھے بتائی۔ میں نے وہ ناول نکال کر اسے دے دیے۔اس نے دوست کے پتے پر ناول بذریعہ رجسٹری ارسال کر دیے۔ نوید کا دوست فوج میں ملازم تھا۔

فوج میں ایک دستور یہ ہے کہ کوئی پیکٹ بذریعہ ڈاک آتا ہے تو پہلے وہ پیکٹ متعلقہ اہل کار کے آفیسر کو بھیجا جاتا ہے ... آفیسر اس پیکٹ کو کھول کر دیکھتا ہے ... پھر ماتحت کو دیتا ہے ... نوید کا ارسال کردہ پیکٹ بھی اس کے دوست کے آفیسر کے پاس پہنچا۔ انہوں نے کھول کر دیکھا اور پھر نوید کے دوست کو طلب کر لیا... پیکٹ کھلی ہوئی حالت میں میز پر موجود تھا ... دوست کا بیٹا ان کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی نظر پیکٹ پر پڑی ... ادھر آفیسر نے کہا :

''یہ پیکٹ تمہارے نام آیا ہے ... یہ کہاں سے آیا ہے ... اور کیسے ؟''

نوید کے دوست نے کہا :

''مجھے اشتیاق احمد کے ناول پڑھنے کا بہت شوق ہے ... اشتیاق احمد میرے دوست نوید کے والد ہیں ... میں نے فون پر اس سے فرمائش کی تھی کہ یہ چند ناول میں اب تک نہیں پڑھ سکا ... لہٰذا اپنے والد سے لے کر مجھے بھیج دے ، سو اس نے بھیج دیے۔''

''بدتمیز !'' آفیسر نے غصے کے عالم میں کہا۔

''سر! میں معافی چاہتا ہوں... کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے ۔'' نوید کے دوست نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا ۔

''اور نہیں تو کیا ... تم ان کا نام اس طرح لے رہے ہو ... کہہ رہے ہو، اشتیاق احمد ... یوں کہو... اشتیاق احمد صاحب ...''

'' جی!!! ''مارے حیرت کے نوید کے دوست کے منہ سے نکلا...ادھر انہوں نے کہا :

'' اور یہ پیکٹ تو جھنگ سے آیا ہے ... لہٰذا تم جھوٹ بول رہے ہو... اشتیاق احمد تو لاہور میں رہتے ہیں۔''

''نہیں سر! وہ جھنگ میں رہتے ہیں ... ہاں دفتر ان کا لاہور میں ہے... آبائی گھر جھنگ میں ہے ... اور میں بھی جھنگ کا ہوں ۔''

'' اوہ ...'' ان کے منہ سے نکلا ۔

'' لل... لل... لیکن سر...'' میرا دوست ہکلایا۔

'' ہاں! کہو... کیا کہنا چاہتے ہو ۔''

'' سر... آپ انہیں کیسے جانتے ہیں۔''

'' جاننا چاہتے ہو ۔'' انہوں نے سرد لہجے میں کہا ۔

'' جی سر...'' اس نے خوف زدہ ہو کر کہا ۔

'' آؤ میرے ساتھ ۔''

یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھے... اور میرے بیٹے کے دوست کو اپنے گھر لے گئے...ایک کمرے کی الماری انہوں نے کھول ڈالی ... بیٹے کے دوست نے حیرت زدہ انداز میں اس الماری کو دیکھا ... اس میں صرف میرے ناول نہایت ترتیب سے لگے ہوئے تھے...اب اسے معلوم ہوا کہ ...وہ بھی میرے ناولوں کے شوقین تھے۔

یہ واقعہ دوست کے بیٹے نے جھنگ میں آکر اسے سنایا...

اسی طرح ایک بار ایک فون موصول ہوا ... یعنی اس واقعے سے بھی کئی سال پہلے... بلکہ بہت پہلے ... غالباً 1985ء میں... کوئی نوجوان بات کر رہا تھا ... کہنے لگا :

'' جھنگ میں ہماری خالہ رہتی ہیں... ہمیں اکثر جھنگ آنا ہوتا ہے ... ہم چاہتے ہیں ...اس بار جھنگ آئیں تو آپ سے بھی ملاقات کریں ... کیا ہمیں اجازت ہے ... ہم یہاں سرگودھا میں رہتے ہیں... اور آپ کے ناولوں کے شیدائی ہیں ۔''

جواب میں میں نے کہا : '' ضرور آجایئے گا ...''

اس فون کے کوئی دو ماہ بعد دو نوجوان ملنے کے لیے آئے۔

انہوں نے بتایا: ''وہ وہی ہیں ، جنہوں نے سرگودھا سے فون کیا تھا۔''

میں ان سے گرمجوشی سے ملا ... اب انہوں نے بتایا :

'' ان کے والد پاک فضائیہ میں اسکواڈرن لیڈر ہیں ۔''

اسکواڈرن لیڈر پاک فضائیہ کا کافی بڑا عہدہ ہے ... مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ایسے گھرانے میں بھی میرے ناول پڑھے جاتے ہیں۔

اب یہ دونوں نوجوان جب بھی جھنگ آتے ... مجھ سے ملنے کے لیے ضرور آتے ...انہوں نے اپنی خالہ اور ان کے شوہر سے بھی مجھے ملوایا۔ ایک مرتبہ کہنے لگے :

'' سات ستمبر آنے والا ہے ...اس روز بھارت کے خلاف چھ ستمبر 65ء کی جنگ کی کامیابی کی خوشی میں طیاروں کے اڑانے کی تقریب منعقد کی جاتی ہے ... آپ اپنے بچوں کے ساتھ سرگودھا آئیں... یہ تقریب آپ کو بھی دکھائیں گے۔''

میں نے ان سے وعدہ کر لیا ... سات ستمبر کو صبح سویرے بچوں کے ساتھ سرگودھا پہنچ گیا ...ان نوجوانوں کے والد کا نام محمد رفیق تھا ... محمد رفیق صاحب تھے تو سکواڈرن لیڈر... لیکن تھے بہت سادہ سے آدمی... ان میں ملنساری حد درجے کی تھی... ہم سب بہت گرم جوشی سے ملے اور پھر تقریب دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس روز ہم نے بہت قریب سے طیاروں کو اڑتے اور لینڈ کرتے دیکھا... بہت ہی دل خوش کن نظارہ تھا۔

اس گھرانے سے بھی پھر بہت گہری دوستی ہوگئی ... میں انہیں ناول اعزازی بھیجنے لگا ... کچھ مدت بعد ان کا تبادلہ کراچی ہو گیا ... اور ان کی بھی ترقی ہوگئی... وہ ونگ کمانڈر بن گئے۔

ایک روز ہمارے جھنگ کے حکیم محمد سلیم صاحب میرے پاس آئے۔ یہ وہی حکیم سلیم ہیں... جنہوں نے دادئ مرجان کے سلسلے میں مرزائیوں کی آمد کے بعد میری ملاقات ختم نبوت کے عالم مولانا غلام حسین سے کرائی تھی... انہوں نے

آ کر کہا :

'' مجھے کسی نے بتایا ہے کہ ونگ کمانڈر محمد رفیق صاحب سے آپ کا دوستانہ تعلق ہے ... اور اس گھرانے میں آپ کے ناول پڑھے جاتے ہیں۔''

میں نے ان سے کہا : '' اتنا دوستانہ تعلق تو خیر نہیں ...ہاں اس گھرانے میں ناول ضرور پڑھے جاتے ہیں۔''

'' بس یہی کافی ہے ... میرا بیٹا فوج میں ہے اور آج کل اسے کراچی میں لگا دیا گیا ہے ...ہم چاہتے ہیں ... کسی طرح اسے لاہور یا اسلام آباد میں لگا دیا جائے... کراچی بہت دور ہے اور بیٹا وہاں بہت پریشان ہے ... اگر آپ ونگ کمانڈر صاحب سے کہہ دیں تو یہ کام ان کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے ۔''

یہ سن کر میں نے کہا :

'' میں انہیں خط لکھ دیتا ہوں... یہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ یہ کام کر سکتے ہیں یا نہیں۔''

اس پر حکیم صاحب نے کہا :

'' میرا بیٹا کہتا ہے ... یہ کام وہ کرا سکتے ہیں ۔''

'' اچھی بات ہے ...''

میں نے کہا اور انہیں خط لکھ دیا ...ایک ہفتے بعد ہی حکیم محمد سلیم صاحب ملنے کے لیے آئے... وہ حد درجے خوش نظر آرہے تھے ... انہوں نے بتایا کہ رفیق صاحب نے فوراً ان کے بیٹے کا تبادلہ راولپنڈی کرادیا ہے۔''

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی... خوشی بھی تھی ... حکیم صاحب دیر تک شکریہ ادا کرتے رہے۔

بعد میں سنا تھا کہ محمد رفیق صاحب ریٹائر ہو گئے تھے۔ ان کے بیٹوں سے بھی ایک مدت ہوئی ... رابطہ نہیں ہوا۔

ادھر بچوں کا اسلام کے ایک سلسلے کی وجہ سے ایک اور حیرت انگیز موڑ آیا

... اس موڑ کے بارے میں بھی میں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا ...

آپ کو یاد ہوگا ... میں نے ایک قلمی نام عبداللہ فارانی تجویز کیا تھا اور اس نام سے روزنامہ اسلام میں کالم شروع ہو گئے تھے۔ اب جب بچوں کا اسلام شروع ہوا تو اس میں بھی ایک قلمی نام کی ضرورت محسوس ہوئی ... وہ اس لیے کہ اپنے نام سے دو باتیں تو پہلے ہی لکھ رہا تھا ... میرا ناول بھی قسط وار شروع ہو چکا تھا ... اب تیسری جگہ اپنا نام دینا اچھا نہ لگا تو عبداللہ فارانی کے نام سے اسلامی سلسلہ شروع کر دیا ... اس سلسلے میں میں نے سب سے پہلے ان صحابہ پر مضامین لکھے جن کے نام تاریخ کی کتابوں میں زیادہ مشہور نہیں ہیں ... ان مضامین کو نہایت دلچسپ کہانی کی صورت میں شروع کیا ... یک دم عبداللہ فارانی کا نام مشہور ہونے لگا ... چند ماہ ہی میں عبداللہ فارانی بچوں کا اسلام کے معروف لکھنے والے بن گئے ...

اور ابھی کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عبداللہ فارانی میں ہی ہوں...

صحابہ پر بہت سی کہانیاں ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے ذہن میں ایک بات ڈالی ... میں آسان فہم انداز میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھوں... اور اس انداز سے لکھوں کہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کی طرف خاص توجہ دوں ... کیونکہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کو چھوڑ دیا جاتا ہے جب کہ مجھے جزئیات کے پڑھنے میں زیادہ مزا آتا ہے ... تاریخ کا کوئی اہم واقعہ پڑھتا ہوں تو اس کی تمام تر جزئیات کو پڑھ لینے کی تڑپ محسوس کرتا ہوں ... مثلاً کافی مدت پہلے میں نے جب واقعہ کربلا کا مطالعہ شروع کیا تو جتنی کتابیں جمع کی تھیں ... ان سب میں کہیں نہ کہیں الجھن محسوس کی ... یہ محسوس کیا ہے ...یہاں کوئی بات رہ گئی ہے ...بہت سی جزئیات چھوٹ گئی ہیں ... تاریخ طبری، تاریخ البدایہ والنہایہ، طبقات ابن سعد وغیرہ ... یہ سب خرید خرید کر واقعے کو مکمل طور پر پڑھنے کی ادھیڑ بن میں لگا رہا اور اب تک اس موضوع پر جہاں سے بھی کوئی کتاب ملتی ہے

... اس کا مطالعہ کرتا ہوں ... بس میں نے سوچا ... سیرت النبی لکھتے وقت جزئیات کا خیال رکھوں گا ... اسی بنیاد پر سلسلے کا نام رکھا ... "سیرت النبی قدم بہ قدم"۔

اس وقت جب میں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا اور اصل نام کے ساتھ قدم بہ قدم لفظ لکھا تھا ، مجھے گمان تک نہیں تھا کہ یہ قدم بہ قدم کیا دن دکھائے گا ... خیر الحمد للہ ! شمارہ 87 سے اس سلسلے کا آغاز ہوا ... اس دوران صحابہ پر جو کہانیاں لکھی گئی تھیں ، وہ ادارے نے روشن ستارے کے نام سے شائع کر دیں ... یہ کہانیاں چونکہ عبداللہ فارانی کے نام سے شائع ہوئی تھیں ، اس لیے کتاب بھی اسی نام سے شائع کی گئی ... روشن ستارے چار حصوں میں شائع کی گئی ...یعنی چھوٹی چھوٹی چار کتابیں... روشن ستارے نمبر 1 نمبر 2 نمبر 3 اور نمبر 4۔

ان کتابوں کے شائع ہونے کی دیر تھی کہ ان کی فروخت تیزی سے شروع ہوگئی ... شائع کرنے والے ادارے کا نام کتاب گھر تھا۔

کتاب کے تیزی سے فروخت ہونے کی خبر جلد ہی سب کو ہو گئی ... پہلا ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا ... چنانچہ دوسری بار شائع ہوئیں... پھر تیسری بار ... خود کتاب گھر والوں نے یہ جملہ کہا ... "یہ کتاب اس قدر فروخت ہو رہی ہے کہ ہم کیا بتائیں ... آج تک ہمارے ہاں سے شائع ہونے والی کوئی کتاب بھی اس قدر تیزی سے فروخت نہیں ہوئی۔"

بچوں کا اسلام میں سیرت النبی قدم بہ قدم نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ...اب عبد اللہ فارانی کا نام حد درجے نمایاں ہو گیا ... کچھ لوگوں نے تو یہ تک کہہ دیا :

"عبداللہ فارانی اشتیاق احمد کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔"

☆☆☆☆☆

O

انہی دنوں ایک روز فون کی گھنٹی بجی ... اسکرین پر نام مولانا محمد اسماعیل ریحان کا نظر آیا ... موبائل آن کیا تو دوسری طرف سے مولانا نے چہکتی آواز میں کہا۔ ''آپ کو ایک خوش خبری سناؤں۔''

میرے منہ سے فوراً نکل گیا۔

'' غالباً آپ مجھے عمرے کی خوش خبری سنانا چاہتے ہیں ۔''

'' ہائیں ... آپ نے کیسے جان لیا ؟'' انہوں نے حیرت ظاہر کی۔

''ایسے کہ کچھ مدت پہلے یہ ذکر میر ے سامنے آچکا ہے ... مجھے بتایا گیا تھا کہ آئندہ سال آپ کو عمرے پر بھیجنے کا ارادہ ہے ۔''

'' بس تو پھر تیاری کر لیں ... ہمارے ادارے کے کچھ ساتھی عمرے کے لیے جارہے ہیں ... آپ ان کے ساتھ جانا پسند کریں گے یا اکیلے جائیں گے ۔''

'' سب کے ساتھ جاؤں گا ... سب کے ساتھ لطف رہے گا۔''

'' اچھی بات ہے... میں انتظامیہ کو بتادوں گا۔'' انھو ں نے کہا۔

میں نے عمرے کی تیاری شروع کر دی ... شمارے بھی پیشگی تیار کرنا شروع کر دیئے ... مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ سفر ایک ماہ کا ہوگا ... اس طرح چار مزید شمارے تیار کرنے تھے ... اور مجھے ابھی پاسپورٹ بھی بنوانا تھا ... پاسپورٹ بنوانے فیصل آباد گیا تو وہاں جو سلوک انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے ، اس کا اندازہ ہوا ...اس سلسلے میں روزنامہ اسلام میں کالم لکھا ... اور کیا کر سکتا تھا ... جیسے تیسے

کر کے پاسپورٹ بنا ... ادھر کراچی سے فون آچکا تھا کہ جونہی پاسپورٹ بنے ، ادھر بھیج دیں ... میں نے پاسپورٹ کراچی بھیج دیا۔

ویزہ لگوانے کا سارا کام کراچی والوں کو کرنا تھا اور میرا کام اس دوران انتظار کرنے کا رہ گیا تھا ... ایک ماہ کے اندر میں نے چار مزید شمارے تیار کر ڈالے ... اب اس لحاظ سے بے فکر ہو گیا کہ آتے ہی کام کا پہاڑ سر پر نہیں ہو گا...ادارے کے جو لوگ جارہے تھے ... ان کے پاس پاسپورٹ چونکہ پہلے ہی تیار تھے ، اس لیے ان کے ویزے پہلے سے لگ گئے ...اور میں پیچھے رہ گیا ... اس دوران مجھے یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ ادارے کے مہتمم صاحب ساتھ جارہے ہیں ...اور ہم لوگ ان کے ساتھ عمرہ کریں گے ... اس خبر نے اور جوش طاری کر دیا... پھر مجھے کراچی سے اطلاع دی گئی ...

'' آپ کا ویزہ لگ گیا ہے ... ٹکٹ بھی ہو گیا ہے ... لہٰذا آپ پرسوں تک کراچی پہنچ جائیں ... اس سے اگلے دن آپ کو روانہ ہونا ہے ۔''

میں نے خبر گھر والوں کو سنائی ... اور دوسرے دن ان سے رخصت ہو کر لاہور پہنچا ... پھر لاہور سے کراچی ... ائرپورٹ پر قاری صاحب موجود تھے ... وہ مجھے جامعۃ الرشید لے آئے ... وہاں پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ میرے حوالے کر دیئے گئے ... اس وقت قاری صاحب نے بتایا:

''سب لوگ جا چکے ہیں ۔''

''کیا !!!'' میں دھک سے رہ گیا ۔''

اتنا لمبا سفر اب مجھے تنہا کرنا تھا ... یہ بات میرے لیے بہت پریشانی کی تھی ... میں نے ان سے کہا :

'' مہربانی فرما کر باقی ساتھیوں کو اطلاع دے دیں، مفتی صاحب کو بتا دیں تاکہ وہ کسی کو لینے کے لیے بھیج دیں ورنہ میں انھیں کیسے تلاش کروں گا...''

'' فکر نہ کریں ... ابھی اطلاع کیے دیتا ہوں ۔''

قاری صاحب نے متعلقہ آدمی کو یہ بات بتا دی ... اس نے کہا۔

'' میں ابھی فون کر دیتا ہوں ... انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

شام کے وقت میں روزنامہ اسلام کے ساتھیوں سے ملاقات کے لیے چلا گیا ... اس وقت میں نے ایک ساتھی خالد عمران صاحب سے کہا۔

'' مہربانی فرما کر مفتی صاحب کا نمبر میرے موبائل میں فیڈ کر دیں ... تاکہ میں وہاں پہنچ کر انھیں فون تو کر دوں۔''

'' اچھی بات ہے۔'' خالد عمران صاحب نے کہا اور نمبر فیڈ کرنے لگا...

دوسرے دن ... یعنی پندرہ ستمبر 2006 کو میں احرام باندھ کر جدّہ کے جہاز پر سوار ہوا ... جدّہ پہنچا ...چیکنگ وغیرہ کے مراحل سے گزر کر جب میں باہر نکلا تو پر امید تھا کہ کوئی لینے کے لیے آیا ہوا ہوگا اور میں مزے سے اس کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا ... لیکن میں یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ وہاں دور دور تک کوئی شناسا چہرہ نہیں تھا ...

مارے پریشانی کے برا حال ہو گیا ... وہاں سب لوگوں سے پاسپورٹ لیے جا رہے تھے اور عمرے کے لیے آنے والوں کو بسوں میں بٹھایا جا رہا تھا...اس طرح ہم مکّہ پہنچے ... اب وہاں سب کو واؤچر کے حساب سے ہوٹلوں میں پہنچایا جانے لگا ... میرے پاسپورٹ کو کھول کر دیکھا گیا تو اس میں واؤچر نہیں تھا... مجھ سے پوچھا گیا ...

''آپ کا واؤچر کہاں گیا۔''

مجھے واؤچر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا ... اسی وقت یہ بات سامنے آئی کہ جو لوگ ویزہ وغیرہ لگواتے ہیں ... وہی واؤچر بھی بنواتے ہیں اور ان واؤچروں کے حساب سے ہوٹلوں میں ٹھہرایا جاتا ہے ... سب لوگ اپنے اپنے ہوٹل پہنچ گئے ... سب سے آخر میں میں رہ گیا ... بس والا کہنے لگا :

''اب آپ کا کیا کریں ... آپ کے پاس تو واؤچر ہی نہیں ہے ...

آپ کو کہاں پہنچائیں ۔"

میں نے اسے بتایا ... "میرے ساتھی مجھ سے پہلے آگئے ... میں پیچھے رہ گیا ... اس کا مطلب ہے واؤچر اکٹھا تھا ... وہ ان کے پاس ہے ... میرے پاس ان کا نمبر ہے ... میں فون کر کے معلوم کر لیتا ہوں ... کیا آپ مجھے اپنے موبائل سے نمبر نوٹ کر کے فون کرنے کی اجازت دیں گے ... میں کال کے پیسے جو بنیں گے ، آپ کو دے دوں گا۔"

اس نے برا سا منہ بنایا ... پھر نمبر ڈائل کیا ... لیکن نمبر نہ مل سکا ... آخر اس نے کہا۔" میں آپ کا سامان اس ہوٹل میں رکھ دیتا ہوں ... ہوٹل کا کارڈ آپ کو دے دیتا ہوں ... جب آپ کے ساتھی مل جائیں تو آپ، کارڈ دکھا کر یہاں سے اپنا سامان لے لیں۔"

اس کی بات سن کر قدرے سکون محسوس ہوا ... اب میں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نکلا ... تلاش کرنے کا واحد ذریعہ فون پر رابطہ کرنا تھا ... ایک پبلک فون بوتھ سے میں نے فون کرنے کی کوشش شروع کی ... لیکن فون نہ ہو سکا ... نہ جانے میں نمبر غلط ملا رہا تھا یا کیا بات تھی ...

مایوس ہوکر وہاں سے نکل آیا اور ایک اور فون بوتھ میں داخل ہوا ... پھر کوشش کی ... آخر نویں یا دسویں بار کوشش کے بعد سلسلہ مل گیا ...

مفتی صاحب کی آواز سنائی دی ... میں نے فوراً انہیں بتایا ...

"جی ... اشتیاق احمد بات کر رہا ہوں ... میں تو نہ جانے کب سے بھٹک رہا ہوں ... آپ کہاں ہیں ۔"

"آپ باب عمرہ پر آجائیں ... میں اسامہ کو بھیج دیتا ہوں ... وہ آپ کو پہچانتا ہے ۔"

" جی اچھا !"

میری جان میں جان آئی اور باب عمرہ کے بارے میں لوگوں سے پوچھتا

ہوا دوڑنے لگا ... گھبراہٹ یہ تھی کہ کہیں اسامہ مجھ سے پہلے بابِ عمرہ پر نہ پہنچ جائے اور وہاں مجھے نہ پاکر واپس نہ چلا جائے ... آخر خدا خدا کر کے میں بابِ عمرہ پر پہنچ گیا ... اورانتظار کرنے لگا ... پھر اسامہ آتا نظر آیا ... میں نے بھی اسے پہچان لیا ... وہ ہمارے مفتی صاحب کا خادم ہے ... نزدیک آیا تو ہم دونوں گرمجوشی سے ملے اور وہ مجھے اس ہوٹل کی طرف لے چلا جس میں مفتی صاحب دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے ...

ہوٹل کا نام قرطبہ ہوٹل تھا اور وہ حرم کے بالکل سامنے تھا ... درمیان میں بس سڑک تھی ... یعنی سڑک پار کرتے ہی میں حرم کی سیڑھیاں آجاتی تھیں... ہم لفٹ میں سوار ہو کر اوپر ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں مفتی صاحب اور مولانا بشیر صاحب موجود تھے ... دونوں حضرات نہایت محبت سے ملے ... جو مجھ پر گزری تھی ... میں نے انھیں کہہ سنائی ...بشیر صاحب نے فوراً کراچی متعلقہ آدمی کو فون کیا اور اسے جھاڑ پلائی کہ مجھے واؤچر کے بغیر کیوں بھیجا گیا ... انہیں یہاں اتنی پریشانی ہوئی ہے ... اس کے بعد میں اسامہ کو ساتھ لے کر اس ہوٹل پہنچا ... عمرے کی تفصیلات حد درجے دلچسپ اور روح پرور ہیں ... واپسی پر میں نے عمرے کا سفر نامہ لکھا ، جو ''سفر نامہ عمرے کا'' نام سے شائع ہوا ... لہٰذا یہاں وہ تمام تفصیلات نہیں لکھ رہا ... کتاب باتصویر شائع کی گئی تھی ... لہٰذا شائق حضرات عمرے کی تفصیلات اس کتاب میں دیکھ سکتے ہیں ...

عمرے سے واپسی پر زندگی پھر اسی معمول پر آگئی ... بچوں کا اسلام کے چار شمارے ہر ماہ تیار کرنے لگا اور اٹلانٹس پبلی کیشنز کے لیے ایک ناول لکھنے لگا ... لیکن پھر ایسا ہوا کہ سیرت النبی قدم بہ قدم سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا ... ایم آئی ایس پبلشرز نے اس سلسلے کو دو جلدوں میں شائع کیا ... دونوں جلدیں بہت خوب صورت شائع ہوئیں ... قارئین بچوں کا اسلام میں پڑھ چکے تھے ... اور پھر بھی کتابی شکل میں شائع ہونے کا بے چینی سے انتظا ر کر رہے تھے ... جونہی یہ دونوں
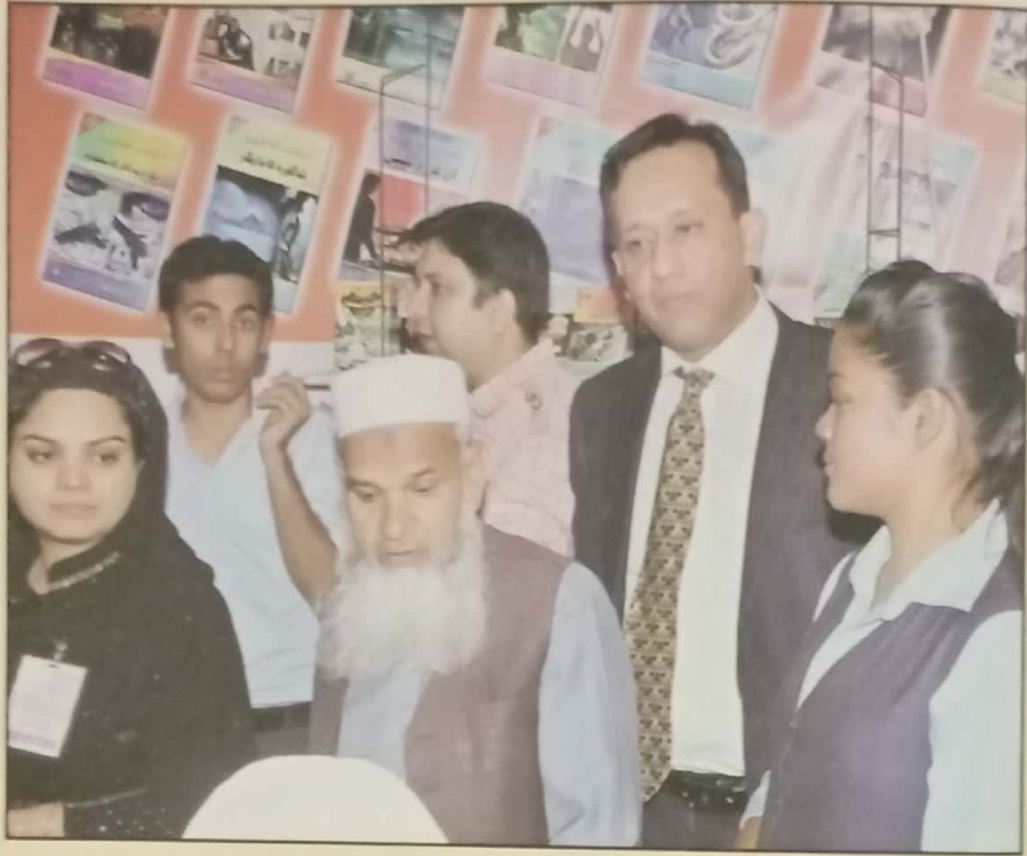
''پہاڑ کا سمندر'' کی تقریب رونمائی کے بعد اٹلانٹس پبلکشنز کے اسٹال پر....
ساتویں کراچی بین الاقوامی کتب میلے کے دوران (2011)۔

اشتیاق احمد، عظمت انصاری اور آصف انصاری

اٹلانٹس پبلکیشنز کے اسٹال پر ناولوں پر دستخط کرتے ہوئے (2012)

اٹلانٹس پبلکیشنز کی ٹیم کے ہمراہ...دائیں سے بائیں۔
عمر ریاض، آسیہ عزیز، اشتیاق احمد، عینی، عقیل، عظمت، فاروق احمد، اسامہ جہانگیری

''بے تکی وارداتیں'' کی تقریب رونمائی (2012)۔
دائیں سے بائیں: فاروق احمد، اشتیاق احمد، غازی صلاح الدین، آصف انصاری، عظمت انصاری

11 دسمبر 2012 کی صبح ہم ٹی وی کے پروگرام ''جاگو پاکستان جاگو''
کے میزبان فہد مصطفیٰ سے ہاتھ ملاتے ہوئے۔

''پہاڑ کا سمندر'' کی تقریب رونمائی (دسمبر 2011)۔

جلد میں شائع ہوئیں... بہت تیزی سے ان کی فروخت شروع ہوگئی ... فروخت کی رفتار نے ادارہ ایم آئی ایس کو حیرت زدہ کر دیا ...پہلا ایڈیشن انھوں نے تین ہزار کی تعداد میں شائع کیا تھا ... یعنی دونوں جلدیں تین تین ہزار شائع کی تھیں ... یہ کتب ایک ماہ میں ہی ختم ہوگئیں ... انہوں نے دوسرا ایڈیشن شائع کیا ... وہ بھی ہاتھوں ہاتھوں فروخت ہوگیا... یہی حال تیسرے ایڈیشن کا ہوا . پھر چوتھا ایڈیشن شائع ہوا ... غرض اس کتاب کی فروخت تاحال جاری ہے ...

خود ادارہ ایم آئی ایس نے ایک بات مجھے بتائی ... ادارے کے مینجر محمد رفیق صاحب ہیں ... کہنے لگے...

''کراچی میں ایک صاحب ہیں ... ان کا شوق ہے صرف سیرت النبی پر کتابیں جمع کرنا ... اس شوق کی بنیاد پر ان کی اب ایک بڑی لائبریری ہے ... اس میں دنیا بھر میں لکھی گئی سیرت کی کتب موجود ہیں ... ہم نے سیرت النبی قدم بہ قدم شائع کی۔ اس کا اشتہار بچوں کا اسلام میں شائع ہوا تو انہوں نے بھی اپنی لائبریری کے لیے دونوں جلدیں خریدیں ... دونوں جلدیں پڑھنے کے بعدانہوں نے فون کیا... فون پر ان کے الفاظ یہ تھے...

'' رفیق صاحب ! میرا تو شوق ہی سیرت النبی پر کتب جمع کرنا کا ہے ... اس وقت میری لائبریری میں تقریباً تین ہزار کتب موجود ہیں ... وہ سب میں صرف خریدی نہیں ... پڑھی بھی ہیں ... لیکن جو مزہ سیرت النبی قدم بہ قدم پڑھ کر آیا ... وہ کسی اور کتاب میں نہیں آیا۔''

یہ سن کر میں گھبرا گیا ... ایک طرف تو اللہ کا شکر ادا کیا ... دوسری طرف سوچنے لگا ... دنیا بھر میں تو بہت بڑے بڑے عالموں نے سیرت پر لکھا ہے اور یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا ... لیکن انھیں میری یہ سادہ سی کتب اس قدر کیوں پسند آئی ... میرے ذہن نے اس سوال کا وہی جواب دیا ... کہ اس کتاب میں جو جزئیات ہیں ... انھیں بڑے بڑے لکھنے والے عام طور پر چھوڑ جاتے ہیں

اور میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا ...

سلسلہ سیرت النبی قدم بہ قدم شمارہ 83 سے شروع ہوا تھا اور شمارہ 198 میں اس مبارک سلسلے کا اختتام ہوا ... شمارہ نمبر 199 شروع کیا تو سوچا، اب عبداللہ فارانی کے نام سے کون سا سلسلہ شروع کیا جائے ... اللہ تعالیٰ نے ذہن میں بات ڈالی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کا دور آتا ہے... لہٰذا اس سلسلے کا نام رکھ دیا ... خلفائے راشدین قدم بہ قدم ...

اس طرح قدم بہ قدم لفظ اس قدر مشہور ہوا کہ ادھر ادھر سے فون آنے لگے ... کچھ پبلشر زحضرات نے باقاعدہ ملاقات بھی کی کہ ہمیں قدم بہ قدم کے نام سے کوئی سلسلہ لکھ دیں ... لیکن میں بچوں کا اسلام اور ناول کی مصروفیات کی وجہ سے ذہنی طور پر آمادہ نہ ہو سکا ... البتہ ایم آئی ایس پبلشر نے چونکہ سیرت النبی قدم بہ قدم شائع کی تھی، اس لیے ان کی ایک فرمائش کو نہ ٹال سکا ... انہوں نے مطالبہ داغ دیا...

''آپ ہمارے لیے سیرت الانبیا قدم بہ قدم لکھیں ... لیکن وہ بچوں کا اسلام میں شائع نہ کریں۔''

میں انہیں انکار نہ کر سکا اور ان کے لیے یہ سلسلہ لکھ دیا ... انہوں نے اسے شائع کیا تو پہلا ایڈیشن فوراً ہی ختم ہو گیا ... غرض قدم بہ قدم نام نے بہت مقبولیت حاصل کر لی ... سیرت النبی قدم بہ قدم اور خلفائے راشدین قدم بہ قدم کے بعد امہات المومنین قدم بہ قدم، عمر ثانی قدم بہ قدم، قیامت کب آئے گی، آئمہ اربعہ قدم بہ قدم، روشن قندیلیں، بڑوں کا بچپن اور قصص الانبیا (30 حصّوں میں) مجھ سے لکھوائی جا چکی ہیں اور یہ سب کتابی شکل میں چھپ چکی ہیں ... ان تمام سلسلوں کے بعد اسلامی جنگیں قدم بہ قدم بچوں کا اسلام میں شروع کیا ... اس کے مکمل ہونے کے بعد واقعات صحابہ کے قدم بہ قدم شروع ہوا ... ایک ادارے نے کچھ مدت پہلے سیدہ فاطمتہ الزہرہ قدم بہ قدم لکھوائی ہے ... یہ کتاب

اشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہے ...

تین جلدوں میں آزادی قدم بہ قدم لکھوائی گئی ... یہ بھی اشاعت کے مراحل میں ہے ... یہ داستان انگریزوں کے ہندوستان میں قدم رکھنے سے شروع ہوتی ہے اور اس کے پاک وہند سے واپس چلے جانے پر ختم ہوتی ہے ... اس کے بعد ایک ادارے نے حال ہی میں ایک کتاب واقعاتِ اسلاف قدم بہ قدم لکھوائی ہے۔

ہمارے ملک میں دو ادارے ہیں جو بچوں کا ادب پر کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ... ہر سال تحریروں کے مقابلے کراتے ہیں اور نقد انعامات دیتے ہیں یا تعریفی سندیں جاری کرتے ہیں ...

یہ دو ادارے دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اور نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ہیں ... دعوہ اکیڈمی نیم سرکاری ہے ... جب کہ نیشنل بک فاؤنڈیشن سرکاری ہے ...

دوسال پہلے تک نیشنل بک فاؤنڈیشن مقابلے کراتا رہا ہے ... سنا ہے ... دو سال سے حکومت کی طرف سے بجٹ کا سلسلہ روک دیا گیا ہے ... اس لیے اب اس طرف مقابلے بند ہیں ...

دعوہ اکیڈمی والوں کے ساتھ بھی بجٹ کا مسئلہ ہے ... لیکن وہ جیسے تیسے ... ایک پرائیویٹ ادارے کی مدد سے جاری رکھے ہوئے تھے ... اس ادارے کا نام ہے... اورئینٹ ایڈورٹائیزنگ... یہ ادارہ بھی ہرسال پانچ رائٹروں کو انعامات سے نواز رہا ہے۔

میں ان تینوں اداروں کے مقابلوں میں حصّہ لیتا رہا ہوں اور الحمد للہ نقد انعامات اور تعریفی اسناد ان کی طرف سے حاصل کر چکا ہوں۔

☆☆☆☆☆

O

دو سال پہلے یعنی سن 2011 کی ایک بات رہ گئی ...

فاروق احمد صاحب نے فون کیا تھا :

'' یہاں کراچی میں ایک جگہ ہے ... ایکسپو سنٹر ... اس میں ہر سال کتابوں کا میلہ لگتا ہے ... پاکستان بھر کے اشاعتی ادارے اپنی کتب کے اسٹال لگاتے ہیں... اس بار ہم نے بھی اسٹال لگایا تھا ۔''

میں ان کی بات سن کر ہنس پڑا ...وہ حیران ہو کر کہنے لگے:

'' آپ کو ہنسی کس بات پر آئی ۔''

میں نے کہا : '' ہنسی اس بات پر آئی کہ دوسرے اداروں کے پاس تو نہ جانے کتنے مصنفین کی کتابیں ہوتی ہیں... جب کہ آپ کے پاس تو صرف میری کتابیں ہیں اور وہ بھی سو سے زیادہ نہیں ہوں گی ۔''

یہ سن کر انہوں نے کہا :

'' آپ کی بات بالکل درست ہے، لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے اسٹال پر سب سے زیادہ رش دیکھنے میں آیا ... بے تحاشہ لوگوں نے آپ کی کتب دھڑا دھڑ خریدی ہیں ۔''

'' اچھا ! کمال ہے ۔''

میں ان کی بات سن کر واقعی حیران ہوا تھا... ادھر وہ کہہ رہے تھے:

'' اور چند ماہ بعد لاہور میں بھی یہ کتب میلا لگے گا ، ایکسپو سنٹر لاہور میں

بھی ہے۔''

''اوہو ... اچھا۔''

جی ہاں! اور ہم لاہور میں بھی اپنا اسٹال لگائیں گے اور آپ کو بھی دعوت ہے ... ہم نے سوچا ہے ... اخبارات میں یہ اشتہار شائع کرائیں گے کہ اشتیاق احمد بھی اسٹال پر آئیں گے اور پھر خریدار کو اپنے ناولوں پر دستخط کر کے دیں گے۔''

''اچھا... یہ ہے آپ کا پروگرام۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''بالکل ... بس آپ تیار رہیے گا۔''

اس کے دو ماہ بعد ایکسپو سنٹر لاہور میں واقعی کتابوں کا میلہ لگا... فاروق احمد صاحب نے میری کتابوں کا اسٹال لگایا ...میں وہاں گیا اور پھر اپنے اسٹال پر رش میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ...میں دو دن مسلسل دستخط کرتا رہا۔

گزشتہ سال یعنی 2012 میں ... پھر انہوں نے کہا:

''تیار ہو جائیں... ایکسپو سنٹر کراچی میں کتاب میلہ شروع ہو رہا ہے... ہم بھی حسبِ سابق اسٹال لگائیں گے ... آپ کو بھی آنا ہوگا ...''

میں نے کہا: ''اچھی بات ہے ...میں آجاؤں گا۔''

پروگرام کے مطابق میں کراچی پہنچ گیا ... ایکسپو سنٹر میں مجھے دو دن ڈیوٹی دینا تھی ... پہلے دن سب سے پہلے ناول کی رونمائی کی تقریب رکھی گئی تھی ... پہاڑ کا سمندر اسی روز تیار ہو کر ملنا تھا ... ادھر میں ایکسپو سنٹر پہنچا ... ادھر کتاب آگئی۔ لوگوں کا بہت ہجوم تھا ... چند ہلکی پھلکی تقریریں ہوئیں... پھر میرے قارئین ... پہاڑ کا سمندر خرید خرید کر میرے پاس آنے لگے...وہ ملاقات بھی کر رہے تھے اور دستخط بھی کروا رہے تھے اور آٹو گراف بھی لے رہے تھے۔

رات نو بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا... دوسرے دن بھی صبح سے رات نو

بجے تک دستخط کرنے پڑے ... میں بہت بری طرح تھک گیا ... اس کے بعد پروگرام ختم ہوگیا اور میں لاہور آ گیا اور وہاں سے جھنگ واپس۔

اس سال پھر انہوں نے فون کیا اور بتایا کہ کتابوں کی نمائش حسبِ سابق ایکسپوسنٹر میں شروع ہو رہی ہے ... میلہ 7 تا 11 دسمبر جاری رہے گا... آپ بھی آئیں گے اور پچھلے سال کی طرح دو دن ہمارے ساتھ رہیں گے۔

میں نے ہامی بھر لی اور کراچی پہنچ گیا... پھر ایکسپو سنٹر میں دو دن بھرپور گزرے۔ اس سال رش پچھلے سال کی نسبت زیادہ تھا ... دونوں دن مسلسل دستخط کرنے پڑے...ہاتھ رکنے میں ہی نہیں آیا تھا ... شاید دو یا تین بار چند منٹ کے لیے ہاتھ کو رکنا نصیب ہوا ہوگا ...تمام ملنے والوں کا یہ جملہ لازمی تھا:

'' ہم تو بچپن سے آپ کے ناول پڑھ رہے ہیں ...اور اب تو ہمارے بچے بھی پڑھ رہے ہیں۔''

کچھ نے یہ کہا:

'' بلکہ اب تو تیسری نسل پڑھ رہی ہے ۔''

میں یہ سن سن کر خوش ہوتا رہا ...نماز کا وقت ہوتا تو اٹھ کر نماز کے لیے چلا جاتا ... اور بس ...

اس دوران میرے ناول بے تکی وارداتیں کی تقریب رونمائی بھی منعقد ہوئی ... اس تقریب میں ملک کے نامور صحافی جناب غازی صلاح الدین نے میرے ناول کی رونمائی کی ... دیگر شرکاء میں ایڈونچر ٹائمز سیریز کے پروڈیوسر آصف انصاری ، اور میرے ناول کے انگریزی مترجم محترم عظمت انصاری بھی شامل تھے۔

دو مصروف ترین دن گزارنے کے بعد فاروق احمد صاحب نے بتایا:

'' اب کل صبح ساڑھے آٹھ بجے آپ کو ہم ٹی وی والوں نے بلایا ہوا ہے۔''

یہ بات انہوں نے پہلے بھی بتائی تھی ... بلکہ جب انہوں نے کراچی بلانے کے لیے فون کیا تھا، اس وقت بھی بتا دی تھی ... اس وقت میں یہ سمجھا تھا کہ وہ انٹر ویو لیں گے ... اس لیے خاموش رہا ... ورنہ ٹی وی چینلوں وغیرہ جیسی جگہیں جانے سے بہت گھبراتا ہوں ...ایک بار 1980 میں پی ٹی وی لاہور والوں نے فروزاں پروگرام میں بلایا تھا ... اس کے بعد پھر کہیں نہیں گیا تھا... اب اتنی مدت بعد کہا گیا تو سوچا، چلو یہ بھی سہی ... لیکن ہم ٹی وی والوں کا پروگرام اور قسم کا تھا ... یہ ذرا ڈرامائی قسم کا پروگرام تھا۔

ہم ٹی وی کا پروگرام پورے دو گھنٹے براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا گیا تھا۔ اس سے فارغ ہوئے تو ایف ایم ریڈیو چینل 105 والوں نے بلایا ہوا تھا ... وہاں تحسین فاطمہ لائیو پروگرام پیش کر رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بھی بچپن میں میرے ناول پڑھتی رہی تھیں...ایک گھنٹے تک پروگرام جاری رہا ... پاکستان بھر سے پڑھنے والے سوالات کرتے رہے اور میرے ایف ایم پر آنے پر خوشی کا اظہار کرتے رہے ... پروگرام ختم ہوا تو تحسین فاطمہ نے چائے پلائی ... پھر ایک گلدستہ پیش کیا۔

اس کے بعد میں فاروق احمد صاحب کے ساتھ اس عمارت سے باہر آ گیا... رات کو 9 بجے ایف ایم ریڈیو 101 پر بھی ایک گھنٹے کا لائیو انٹرویو تھا ...عاصم بشیر صاحب اس پروگرام کے آر جے تھے۔ انہوں نے بتایا:

'' میں خود بھی بچپن میں آپ کے ناول جنون کی حد تک پڑھتا رہا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے آپ کے ناولوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور آج جو میں یہاں موجود ہوں...تو اس میں آپ کے ناولوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے ... جب آپ نے ماہانہ رسالہ چاند ستارے شروع کیا تھا، میں نے اس کے لیے ایک کہانی بھیجی تھی ... اس کہانی کو آپ نے ناقابل اشاعت قرار دیا تھا ... تاہم خط لکھ کر حوصلہ افزائی کی تھی کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، کوشش جاری رکھیں۔''

میں ان کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا ... پھر پروگرام شروع ہوا۔

یہاں بھی وہی حالت تھی ... ہر طرف سے سوالات کیے جاتے رہے اور میں حیران ہوتا رہا۔ جوابات بھی دیتا رہا۔

یہ عمارت سوک سنٹر کے عقب میں واقع ہے ... پندرہ منزلہ عمارت ہے ... ایف ایم ریڈیو کا دفتر سب سے اوپری منزل پر ہے ... عاصم بشیر صاحب نے عمارت کے گرد چکر لگوایا ...اور وہاں سے پورے کراچی کا منظر دکھایا ... وہاں سے پورا کراچی شہر نظر آتا ہے ... آخر پھر وہاں سے فارغ ہوئے۔

اس وقت تک کی زندگی کے یہ آخری پروگرام تھے ...سوچا ذکر کرتا چلوں ... اس طرح موجودہ دور تک جتنے بھی پروگراموں ، سیمیناروں ، ملاقاتی نشستوں میں ، اور ایوارڈ فنکشنوں میں، میں نے شرکت کی ... یہ ان سب کی تفصیلات تھیں ... اور کچھ پروگرام ایسے بھی ہوں گے جن کا ذکر شامل ہونے سے رہ گیا ہوگا ... آئندہ کیا ہوتا ہے ...مجھے معلوم نہیں۔

☆☆☆☆☆

O

میری زندگی کا لکھنے کا سفر جاری ہے ... مجھے معلوم نہیں ... کب تک جاری رہے گا ... زندگی کے آخری سانس تک یا اس وقت سے پہلے میں قلم ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں، کچھ نہیں کہہ سکتا ...

اس وقت تک ناولوں کی تعداد 787 ہو چکی ہے ... اٹلانٹس کے فاروق صاحب کو 787 کے بعد بھی بارہ ناول لکھ کر دے چکا ہوں ... اور لکھنے کا عمل جاری ہے ...

لکھنے کا عمل جاری تھا کہ دو ماہ پہلے اچانک انہوں نے کہا:

"آپ نے جو اپنی خود نوشت میری کہانی کے عنوان سے لکھی تھی ... وہ بہت مختصر لکھی تھی ... میں چاہتا ہوں، آپ اپنی زندگی اور اپنے لکھنے لکھانے کی داستان مکمل لکھیں اور اس میں زندگی کے باقی واقعات بھی آ جائیں۔"

ان کی بات کے جواب میں میں نے پوچھا:

"لیکن میں کیوں لکھوں ... لکھ کر کیا کروں گا۔"

جواب میں انہوں نے کہا۔

"میں اسے شائع کروں گا۔"

"لیکن وہ تو بہت ضخیم ہو جائے گی۔"

"تو ہو جائے ... فکر نہ کریں ... اپنی مکمل کہانی لکھیں۔"

ان کے یہ کہنے پر میں نے کہا۔

''لیکن یہ سوچ لیں کہ میری کہانی تو پہلے ہی تین بار چھپ چکی ہے۔''

''لیکن وہ تینوں ایڈیشن بے حد مختصر ہیں ... وہ صرف آپ کے مصنف بننے کی کہانی ہے ... ہم تو مکمل خودنوشت چھاپیں گے اور وہ بھی پہلی بار۔''

''اچھی بات ہے ... میں کام شروع کر دیتا ہوں۔''

''جی بالکل ٹھیک ... اور آپ اس بات کی پروا نہیں کریں گے کہ یہ کتنی طویل ہو جاتی ہے ... چھاپنا ہمارا کام ہے۔''

''اور فروخت کیسے کریں گے ... اتنی ضخیم کتاب خریدے گا کون ... کیونکہ وہ ناول تو ہوگا نہیں۔''

''آپ کے پڑھنے والے اسے ذوق شوق سے خریدیں گے ... آپ فکر نہ کریں ... نہ خریدیں تو بھی ہمیں پروا نہیں ... ہم تو چاہتے ہیں کہ تاریخ میں ہمارے ادارے کا نام زندہ جاوید ہوجائے۔''

''اچھی بات ہے ... میں لکھ دیتا ہوں ... میرا کیا جاتا ہے۔'' میں نے انہیں ہنس کر جواب دیا۔

اس طرح میری کہانی پر کام شروع ہوا ... میں نے اسے بے جا طویل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ...

فاروق احمد صاحب کی ایک تجویز یہ بھی ہے کہ آپ یہ کہانی جہاں تک لکھ کر دیں گے ... ہم شائع کر دیں گے ... لیکن بہتر ہو گا کہ آپ میری کہانی لکھتے رہیں ... تاکہ باقی تمام واقعات آپ کی وفات کے بعد میری کہانی کے آخری ایڈیشن میں شامل کر دیئے جائیں ...اس طرح آپ کی کہانی ... زندگی کے آخری لمحات تک کی کہانی بن جائے گی ...

میں نے ان کی یہ بات بھی مان لی ہے اور جب تک زندگی ہے ... میں اپنی کہانی لکھتا رہوں گا ... میری موت کے بعد وہ باقی حصّہ شامل کر کے اسے شائع کرتے ہیں یا نہیں ... اس سے بحث نہیں ... ان کی مرضی پر منحصر ہو گا۔

انہوں نے مطالبہ کیا تو میرے گھر والے میری کہانی کا بقیہ حصّہ ان کے حوالے کر دیں گے ...

اس ایڈیشن کی اشاعت کے بعد میں ایک رجسٹر خرید لوں گا ... اس کے پہلے صفحے پر یہ عنوان ہو گا ... میری کہانی کا باقی حصّہ ... زندگی کے آخری ایام کی کہانی ...

☆☆☆☆☆

O
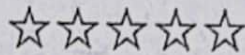
میں اپنی زندگی کی اس کہانی کے آخر میں چند باتیں لکھنا پسند کروں گا۔
میری ساری زندگی لکھتے لکھاتے گزری ... زندگی کی دوسری مصروفیات اور دوسرے معاملات میں میں بہت ... بہت زیادہ پیچھے رہ گیا ... خاندان بھر سے تو کٹ کر رہ ہی گیا... اپنے گھر والوں کے بھی زیادہ قریب نہ رہ سکا ... زندگی کا زیادہ حصّہ لاہور میں گزر گیا ... جب کہ سب گھر والے جھنگ میں ہی رہے ، اس لیے میں تمام تر توجہ اپنے گھر والوں پر نہ دے سکا ... اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچے تعلیمی میدان میں کوئی میدان نہ مار سکے ... پیچھے رہ گئے ... آپ اسے ماں کی محبت کہہ لیں ... میری مجبوریاں کہہ لیں یا میری اشاعتی مصروفیات ... جنھوں نے مجھے اور کہیں کا نہیں چھوڑا ... والدہ کی آخری عمر کی بیماری اور بڑھاپے نے مجھے زندگی بھر یہ نہ کہنے دیا ...
''ماں جی ! میں اپنے بیوی بچوں کو لاہور لے جا کر رکھنا چاہتا ہوں۔''
میں ان سے یہ نہ کہہ سکا ... والدہ کی وفات کے بعد والد صاحب سے بھی یہ نہ کہہ سکا ... اس طرح بیوی بچے جھنگ ہی میں رہے۔
میں اپنے لکھنے لکھانے کے عمل میں اپنے تمام ہم عصروں کو پیچھے چھوڑتا چلا گیا ... لیکن گھریلو معاملات میں سب سے پیچھے رہ گیا ... میں آج اس بات کو بہت محسوس کرتا ہوں۔
تاہم ایک اطمینان ہے ... بچے اپنی روزی کمانے کے قابل ہو چکے ہیں

اور روزی کمارہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں ۔ گھر کے تمام افراد نماز کا خیال رکھتے ہیں ... روزے پابندی سے رکھتے ہیں۔زکوٰۃ باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں ... ہمارے گھر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پابندی کرنے کا شوق موجود ہے ... قربانی کا شوق ہے ... حج اور عمرے کا شوق پایا جاتا ہے ... اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان سب کو حج اور عمرے کی بار بار توفیق عطا فرمائے ... آمین۔

ایک حسرت یہ رہی کہ میرے بچوں میں کوئی لکھنے والا نہ ہو سکا... اسی لیے میں یہ کہتا ہوں ... لکھنے کی صلاحیت خود پیدا نہیں کی جا سکتی، کسی حد تک پیدا کر بھی لی جائے تو اس میں قدرتی پن نہیں آئے گا ... اس کا مطلب ہے ، لکھنے کا تعلق قدرت کی طرف سے ہے ... اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں ... کیا آپ کو بھی شاعروں کی طرح آمد ہوئی ہے ... اس سوال کا جواب میں یہ دیتا ہوں:

''کبھی کبھی تو بالکل شاعروں کے انداز میں آمد ہوتی ہے ... کسی ناول کا مرکزی خیال اچانک ذہن میں آتا ہے اور پھر آن کی آن میں دماغ میں پورا ناول آجاتا ہے ... اسے میں آمد کہتا ہوں ... لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے ... ورنہ عام طور پر میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ ناول لکھنا شروع کر دیتا ہوں ... ناول خود بخود آگے بڑھنے لگتا ہے ... اور جب ناول مکمل ہوتا ہے تو کبھی کبھی خود مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسے لکھا گیا ... شاید یہ بھی آمد ہی کی کوئی قسم ہے۔''

مجھ سے عام طور پر یہ پوچھا جاتا ہے ... آپ اتنا زیادہ کیسے لکھ لیتے ہیں ... اس سوال کا میرے پاس چونکہ کوئی جواب نہیں ہوتا ، اس لیے مزاح کے انداز میں کہہ دیتا ہوں ...

''قلم سے۔''

ہاں البتہ ایک بات یاد آگئی ... آج سے بیس بائیس سال پہلے کی بات ہے ... میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی ... خبر کی سرخی یہ تھی:

''دنیا کا تیز ترین رائٹر۔''

یورپ کے کسی رائٹر کی خبر تھی ... نیچے تفصیل میں لکھا تھا کہ وہ ایک منٹ میں اتنے الفاظ لکھ لیتا ہے ... میں نے فوراً قلم لیا ... اور گھڑی دیکھ کر لکھنے لگا... جب ایک منٹ پورا ہو گیا تو قلم روک دیا ... میں نے الفاظ گنے ... اللہ کی مہربانی سے میرے الفاظ دنیا کے تیز ترین رائٹر سے زیادہ تھے ... اور بات یہ ہے کہ یورپ کے لوگ اپنے لوگوں کو نمایاں کرنے کا فن جانتے ہیں ... ہمارے ملک میں ایسا نہیں... اور مزے کی بات ... بچوں کے ادب کو تو ادب تصور ہی نہیں کیا جاتا۔

پہلی بار جب میری کہانی شائع ہوئی تھی ... تو اس کے پرنٹ لائن والے صفحے پر میں نے یہ الفاظ لکھے تھے :

''نام ، کردار اور واقعات فرضی نہیں ہیں ...''

اس بار بھی یہ الفاظ لکھے جا رہے ہیں ... کیونکہ عام طور پر ناولوں ، افسانوں اور دوسری کتابوں پر لکھا جاتا ہے ...

نام ،کردار اور واقعات فرضی ہیں ...

میری کہانی کے آخر میں ان تمام کہانیوں کی کتابوں اور ناولوں اور سیرت وغیرہ کی کتابوں کے نام لکھے جارہے ہیں تا کہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے...

لیجیے میں آپ سے اجازت چاہوں گا ... لیکن یہ الفاظ کہتے ہوئے ...اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو ایک ایک لمحہ اور ایک ایک شخصیت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ... کیسے کیسے دن نہیں گزارے ... میں نے شہر لاہور میں ... کیسے کیسے حالات سے نہیں گزرا ... کیسے کیسے لوگ نہیں ملے ... ماسٹر نذیر احمد آثم ، خورشید ، محمد عاشق، ابو ضیاء ،اقبال ، مکتبہ عالیہ کے جمیل النبی اور الطاف احمد ، سعید لخت، رب نواز ملک ، سلیم اختر ، نذیر ہاشمی ، جلال انور، عظمت رشید ، عبدالرشید خاکی، نقش محمد ، سعید مختار ، طاہر ایس ملک ، عبدالستار، سعید نامدار ،

محمد اشفاق ، محمد طارق شاہد، ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر ، یہ سب لوگ آنکھوں کے سامنے آج بھی گردش کرتے ہیں اور شاہ عالم مارکیٹ کا حلیم والا بھی۔

زندگی سے متعلق میرے تجربات اور محسوسات یہ ہیں :

☆ دنیا میں انسان کے لیے سب سے خطرناک چیزیں لالچ اور کنجوسی ہیں ۔

☆ آخرت کی رو سے انسان کے لیے سب سے خطرناک چیز شرک ہے۔

☆ دنیا میں ہمیں نیکی یا گناہ کرنے کا اختیار ہے ... آخرت میں نہیں ہوگا۔

☆ قبر میں انسان بالکل بے بس ہوگا۔

☆ دولتمند بننے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ دولتمند بننے کی خواہش کو اپنے اندر سے نکال پھینکا جائے ... دولت قدموں میں آگرے گی ، لیکن دولت کی خواہش کو نکال پھینکنا آسان نہیں ۔

☆ دولت سے جتنا بچنے کی کوشش کروگے، دولت اتنا ہی تمھارے قدموں میں آئے گی۔

☆ جب ہم کسی سے ایک روپے کی بد دیانتی کرتے ہیں تو کوئی ہم سے سو روپے کی کرتا ہے ۔

☆ کبھی اپنے بچوں کے ڈر کی وجہ سے کوئی چھوٹا سا جھوٹ بولا تو بعد میں اس جھوٹ کی وجہ سے بہت بڑی پریشانی میں مبتلا ہوا ۔

☆ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا میں راضی رہنے سے ہی انسان خوش رہ سکتا ہے ۔خوش رہنے کی اور کوئی صورت ممکن نہیں ۔

☆ مجھے شاعری نہیں آتی ... نہ کبھی کوئی شعر کہا... ایک دن منہ سے یہ الفاظ ضرور نکل گئے :

''سو گلاں دی اِکّوئی گل ، کر لے بندیا نیک عمل''

☆ جب تک دوسروں کی چالاکی کا جواب نہیں دیا وہ میری تعریف کرتے

رہے ، جس روز ان کی چالاکی کا جواب چالاکی سے دیا، وہ ناراض ہو گئے ... اور انہیں مجھ میں ہزاروں خرابیاں نظر آنے لگیں۔

☆ تدبیر اور تقدیر دو الگ الگ چیزیں ہیں ... انسان قدم قدم پر تدبیر کرتا ہے ، اور کہتا ہے،میری یہ تدبیر کامیاب ہوگئی ، میری وہ تدبیر کامیاب ہو گئی ... تدبیر اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب تقدیر کے مطابق ہو۔

☆ زندگی پرسکون گزارنے کا بس ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ جس چیز کے بغیر گزارہ ہوسکتا ہے ، اسے نہ خریدا جائے ۔

☆ میں نے اپنے بچوں کو جب بھی اپنے بچپن کی اور لڑکپن کی اورجوانی کی دکھ بھری اور مشکلات سے پر باتیں سنانے کی کوشش کی ... یہی محسوس کیا... جیسے انہیں ان باتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ ہو ... جیسے وہ ان باتوں کوایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال رہے ہوں ...

☆ لکھنے والا دوسروں سے کم ازکم دس گنازیادہ حساس ہوتا ہے ۔

اشتیاق احمد
کے ناولوں کی
مکمل فہرست
دسمبر 2013 تک

Scanned with CamScanner